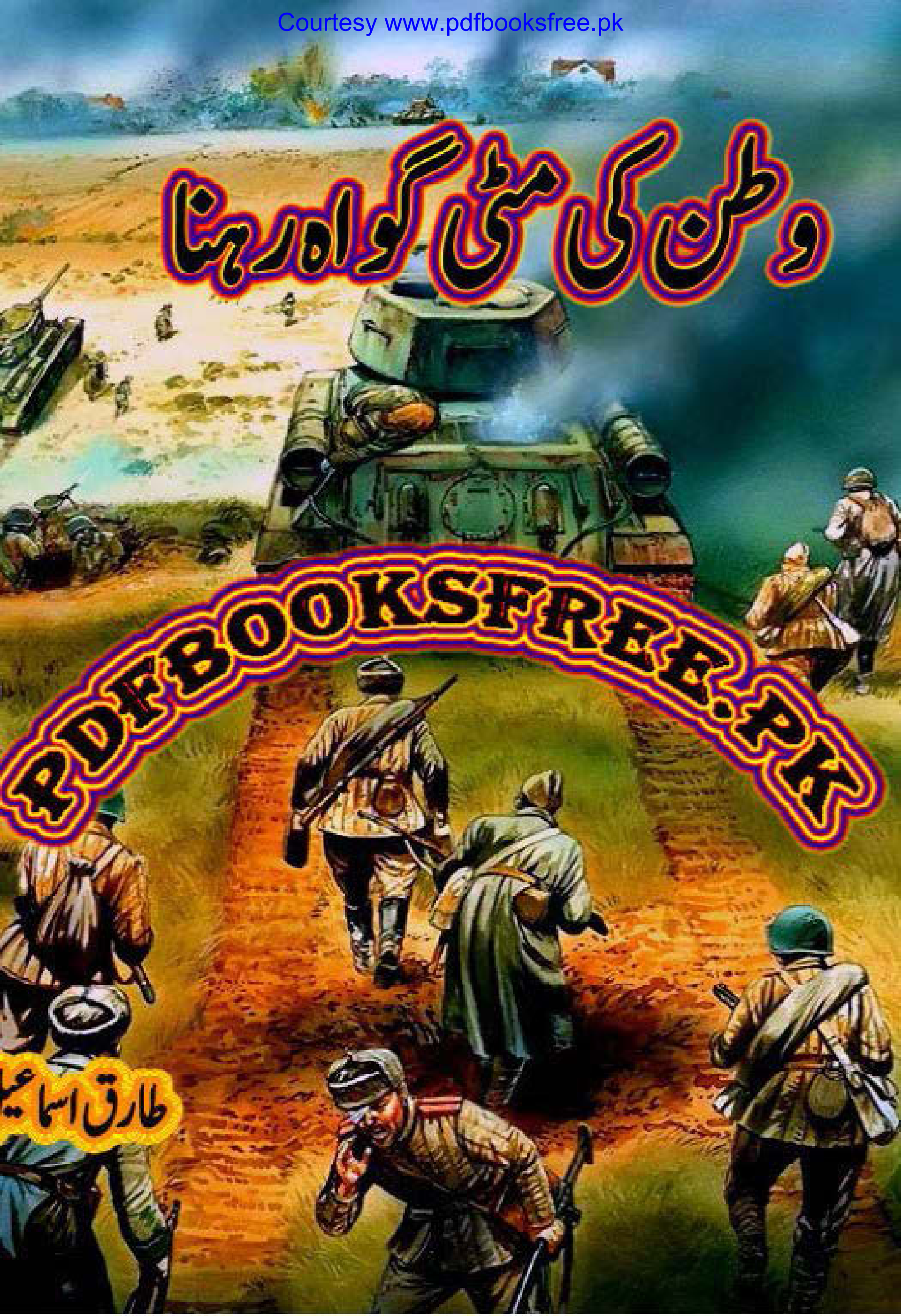

وطن کی مٹی گواہ رہنا
PDFBOOKSFREE.PK
طارق اسماعیل

پیش لفظ

یقین مانیں :

ہم آج اپنی ملی تاریخ کے نہایت حساس موڑ پر کھڑے ہیں ۔

—— ایسے موڑ پر ، جہاں ہم سے چند ہی قدموں پر موت کی دیوی اپنا دامن پھیلائے بڑی بیقراری سے ہمارا انتظار کر رہی ہے ۔

سوال یہ ہے کہ : آخر ہم اس مقام تک کیسے پہنچے ؟

اس لیے کہ :

ہم نے یہ بات یکسر فراموش کر دی کہ ہمارے وطنِ عزیز —— پاکستان کو انگریزوں اور ہندوؤں نے ایک تھالی میں رکھ کر ہمیں پیش نہیں کیا تھا بلکہ اس کے عوض —— ہمارے ازلی دشمن نے ہم سے ہماری ہزاروں بہو بیٹیاں چھین لیں اور ہمارے لاکھوں مسلمان بھائیوں کو جامِ شہادت پلایا ۔

اور —— سچی بات تو یہ ہے کہ :

وہ قوم جس نے ایک طویل اور اعصاب شکن لڑائی لڑ کر ، یہ قطعۂ زمین حاصل کیا ۔

—— وہ اس کی بقا کے لیے اپنے گھوڑوں کو ہر دم تیار اور اپنی تلواروں کو تیز رکھتی ، لیکن —— اس کے برعکس :

ہم نے اپنی عزت کو داؤ پر لگا دیا —— : اپنے ازلی دشمن کی طرف ہمیشہ دوستی کا ہاتھ بڑھاتے رہے ۔

—— اپنے گھوڑوں کو عوامی اُمنگوں کے کچلنے میں مصروف رکھا اور اپنی تلواروں کو زنگ آلود ہونے کے لیے مُستقل طور پر نیاموں میں بند کر دیا۔۔۔ کیا زندہ قوموں کا یہی شعار ہے؟

ہم نے سمجھا کہ شاید کبھی وقت اقوام متحدہ کے ارباب بست وکشاد کے سامنے اپنا دامن پھیلانے سے ہم اُن کے دِل پگھلا دیں، مگر —— یہ کیسے ممکن ہے کہ جس مُنہ کو ہمارے خون کی چاٹ لگی ہو، اُس کے نزدیک بھی ہماری التجائیں کبھی بار آور ثابت ہوں؟

"وطن کی مٹی! گواہ رہنا" میں اِنہی خطرات کی نشاندہی کی گئی ہے —— قابل مصنّف نے اپنی گزشتہ تحریروں کی طرح ایک مرتبہ پھر قوم کو آئینہ دِکھانے کی کوشش کی ہے:

اُنہوں نے نہایت پُرکشش پیرائے میں سفاک اور کینہ پرور دُشمن کے چہرے پر پڑے نقاب کو تھوڑا سا سرکا کر آپ کو ماضی قریب میں اُس کے رول سے آگاہ کیا ہے اور —— حقیقت تو یہ ہے کہ ماضی قریب میں وطنِ عزیز کے دولخت ہونے کی داستان کو جس اچھوتے انداز میں اُنہوں نے پیش کیا، یہ یقیناً اُنہی کا حصّہ ہے۔

"را" کے کرداروں کو جس خوبی سے اُنہوں نے نوکِ قلم میں پرو دیا وہ تو قابلِ تحسین ہے ہی لیکن بطور "را" کی سربراہ، بھارت کی وزیرِ اعظم نے جو کردار ادا کیا اُس کی خبر بھی وہی پہلی بار ہمیں دے رہے ہیں۔

سچ تو یہ ہے کہ اِس "کتاب" کو لکھ کر فاضل مصنّف نے احمقوں کی جنت میں بسنے والوں کی آنکھوں سے پٹی اُتار کر اُنہیں تصویر کے ایسے رُخ سے آشنا کرنے کی کوشش کی ہے جو واضع بھی ہے اور بھیانک بھی۔

—— لیکن تصویر کا اصلی روپ یہی ہے!

مجھے یقین ہے کہ مصنّف کی مساعی رنگ لائیں گی:

ہم سوچ سمجھ کر آگے قدم بڑھائیں گے، اِس لیے کہ: مومن ایک سوراخ سے بار بار نہیں ڈسا جاتا ——

"وطن کی مٹی! گواہ رہنا" ایک کہانی بھی ہے اور وطنِ عزیز کی خاطر جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والوں کا ایک پیام بھی —— یہ دراصل ایک شمع ہے جو راہوں کا تعیّن کرتی ہے۔

—— ایسی راہوں کا:

جہاں سے قافلے گزرتے ہیں اور آخر اپنی منزلوں تک جا پہنچتے ہیں۔

شیخ محمد احسن

مارچ ۱۹۸۶ء

انتساب

مَیں اپنی یہ حقیر کاوش
مرحوم مقبول جہانگیر کے نام منسوب کرتا ہوں
جنہوں نے مجھے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا۔

ڈبل کراس

"مسٹر خان اگلے تین دنوں میں کسی بھی روز تمہیں پھانسی دے دی جائے گی!! مجھے افسوس ہے لیکن یہ سب کچھ تمہاری ہٹ دھرمی کا نتیجہ ہے۔ ایسا ایک روز ہونا ہی تھا" —— جیل سپرنٹنڈنٹ دُوبلے نے جذبات سے عاری لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔

رات کو اُس کی جیل میں آمد کوئی نئی بات تو نہیں تھی لیکن اس طرح اچانک "پھانسی کوٹھڑیوں" کی طرف وہ کسی خاص مقصد ہی سے آیا کرتا تھا۔ "چکر حوالدار" اور جیل کا دیگر عملہ اُس کے پیچھے پیچھے دُم ہلاتا یہاں تک آیا تھا اور اب سب دست بستہ "صاحب دان" اُس کے دائیں بائیں کھڑے تھے۔ اُن کی نظریں سپرنٹنڈنٹ دُوبلے کی طرح خان پر جمی تھیں۔ جس کے ہونٹ دوبلے پر نظر پڑتے ہی پھیل گئے تھے اور اُس کی مسکراہٹ جوں کی توں برقرار تھی۔ حالانکہ اُن کے خیال میں ابھی تک خان کو غش کھا کر گر جانا چاہیئے تھا، لیکن وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی آہنی چٹان کی طرح اُن کے سامنے ڈٹ کر کھڑا اُن کے عزائم کا تمسخر اُڑا رہا تھا۔

"آپ کا شکریہ دُوبلے صاحب۔ مَیں بھی روز روز کی بک بک سے تنگ آ گیا ہوں۔ اب یہ کھیل ختم ہی ہو جانا چاہیئے۔ آپ لوگوں کو کبھی میری بے گناہی کا یقین نہیں آئے گا اور پھر مرنا تو ایک روز ہے ہی ——"

دُوبلے اس کے برملا جواب سے تلملا کر رہ گیا۔

"خان! تم ابھی بچے ہو! تم نے مرنے کی صرف باتیں سُنی ہیں کسی کو مرتے دیکھا نہیں ۔ خصوصاً پھانسی کے کسی مجرم کو ـــــ بڑی اذیت ناک موت ہوتی ہے ۔ بڑی دیر میں تڑپ تڑپ کر سسک سسک کر جان نکلتی ہے اکثر مجرم تو تین تین گھنٹے تک لٹکے رہتے ہیں سولی پر ۔ یہ جو تم چہک رہے ہو اس غبارے کی ہوا بس اب نکلنے ہی والی ہے ......" اُسے باقاعدہ غصّہ آگیا تھا ۔ اُس کی توقعات کے برعکس خان ابھی تک اپنے قدموں پر جو کھڑا تھا ۔

"مسٹر دوبے! اگر تم اپنے ان پالتو کتّوں کے سامنے ذلیل نہیں ہونا چاہتے تو یہاں سے دفع ہو جاؤ ـــــ اور اپنے اُن آقاؤں کو جن کے اشارے پر تم دم ہلاتے ہوئے یہاں چلے آئے ہو جا کر صرف یہ بتا دو کہ خان مر جائے گا مگر اُس کا بیان نہیں بدلے گا ۔ ـــــ نہیں بدلے گا ۔ خواہ مخواہ وہ لوگ تمہاری بھی رات کی نیندیں حرام کر رہے ہیں! پچھلے آٹھ ماہ تک مجھے مسلسل ذہنی اور روحانی عذاب دے کر بھی وہ لوگ مجھ سے نہ اگلوا سکے تو اب کیا لے لیں گے وہ مجھ سے ـــــ! اول تو میں "پاک سپائی" ہوں نہیں اور ـــــ اگر ہوں بھی تو اُن سے کہہ دینا کہ وہ مجھ سے مزید آٹھ سال بلکہ آٹھ صدیوں تک کچھ نہیں اگلوا سکتے ـــــ کچھ نہیں ......" اُس کے ہونٹ غصّے سے کپکپا رہے تھے اور جبڑوں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں ۔

دوبے جیل ڈیپارٹمنٹ میں حوالدار سے ترقی کرتے ہوئے سپرنٹنڈنٹ کے عہدے تک پہنچا تھا ۔ وہ بھارتی جیلوں کا مانا ہوا افسر تھا ۔ بڑے بڑے بدمعاش اس کا نام سن کر کانوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے ۔ جس جیل میں غنڈہ گردی کا خطرہ ہوتا حکومت اُس کا تبادلہ اُسی جیل میں کر دیا کرتی تھی ۔ اُس نے زندگی میں ہارنا تو کبھی سیکھا ہی نہیں تھا ۔ لیکن اس پچیس چھبیس سال کے "پاکستانی جاسوس" نے اُسے اپنے نظریات بدلنے پر مجبور کر دیا تھا ـــــ وہ مسلسل آٹھ مہینے "ٹارچر سنٹروں" میں تفتیش کاٹنے

کے بعد یہاں پہنچا تھا ۔ اُس کی آمد سے ایک روز پہلے ہی "سی آئی بی" کے تین اعلیٰ افسروں دوبے کے سامنے اُس کا مکمل کچا چٹھا جو صرف اُن کی "اطلاعات" کی حد تک تھا ، بیان کر چکے تھے اور یہ بھی بتا چکے تھے کہ وہ "ان اطلاعات" میں سے کسی ایک کی تصدیق اُس کی زبانی نہیں کروا سکے ۔

انہوں نے دوبے کو بطورِ خاص یہ بات سمجھا دی تھی کہ یہ "چھوکرہ" ٹک کر بیٹھنے والا نہیں اگر اُسے ذرا سی بھی سہولت مل گئی تو وہ اپنی سی کر گزرے گا ۔

"ٹنڈن صاحب!" ـــــ خان کے "کیس انچارج" کی بات پر دوبے نے قہقہہ لگا کر خان کی تصویر پر بڑی حقارت بھری نظر ڈالتے ہوئے کہا ـــــ "میں نے بڑے بڑے بدمعاش سیدھے کر دیے ۔ یہ دو ٹکے کا مُلا ، اس کی مجال ہی کیا ہے کہ ایک جھٹکا بھی برداشت کرے ـــــ جیل کی مار بڑی بُری شے ہے ۔ بڑے بڑوں کے کس بل نکل جاتے ہیں مہاراج جی! ـــــ"

ٹنڈن نے بے یقینی کی سی کیفیت سے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا ـــــ "دوبے صاحب! اگر آپ ہماری کوئی بھی مدد کر سکیں تو یہ سرکار کی بڑی مہان خدمت ہو گی ۔"



اگلے روز پولیس گارڈ کی سخت نگرانی میں جب آٹھ ماہ کی چیرہ دستیوں کا شکار خان اس تک پہنچا تو اس اَدھ موئے انسان پر ایک نظرِ حقارت ڈال کر دوبے نے بڑے تمسخر سے کہا ۔ "یہی ہے وہ سُور ما ـــــ ابھی دیکھتا ہوں سالے کو ـــــ"

دوبے کو تو اپنی ترنگ میں جو جی میں آیا وہ کہہ گیا لیکن جواب میں خان نے مغلّظات کا جو طوفان اُگلا ۔ اُس نے دوبے کو تو پاگل ہی کر دیا تھا ـــــ وہ وحشی درندوں کی طرح اُس وقت اُس پر بید برساتا رہا جب تک کہ اس کے بازو شل نہ ہو گئے ۔ ہر ضرب پر اُس کو نئی گالی سے نوازا جاتا ـــــ اور آخر بے بس ہو کر اُس نے

"چکر حوالدار" مہنگا مل کو بُلایا اور حکم دیا۔

"لے جاؤ اس لوفر کو اور اس کا دماغ ٹھیک کر کے میرے سامنے پیش کرو۔"

مہنگا مل اُسے اپنے ساتھیوں کی مدد سے گھسیٹتا ہوا "چکر" میں لے گیا — ڈیوڑھی سے خان کے "پھانسی کوٹھڑی" میں پہنچنے تک اُسے تین "پھینٹیاں" مل چکی تھیں، لیکن مہنگا مل چکرا کر ہی تو رہ گیا۔

"بھگوان جانے یہ شخص کس مٹی کا بنا ہے مہاراج جی!" اُس نے تن کر سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے ڈوبے کے سامنے اپنی بے بسی ظاہر کرتے ہوئے کہا: "ہم نے اس کے مُنہ پر گندگی مل کر، ہاتھ پیر باندھ کر کوٹھڑی میں پھینک دیا ہے"—

اُس نے اپنی کارروائی سے اپنے افسر اعلیٰ کو مطلع کیا۔

"دفع ہو جاؤ!"— اُس نے غصّے سے مٹھیاں بھینچیں۔ "گدھے تم سے ایک معمولی مسلمان چھوکرا قابو نہیں آ رہا— جاؤ اور ریٹائرمنٹ لے کر کوئی مندر سنبھال لو پنڈت جی!" غصّے سے کھولتے ہوئے اس نے پنڈت مہنگا مل چکر حوالدار کو حکم دیا: اُسے کھول کر ڈنڈا بیڑی لگا دو"—

آٹھ دن تک تو خان کو اُن لوگوں نے "ڈنڈا بیڑی" لگا کر بند کر رکھا تھا۔ یہ اُن کے نزدیک جیل کی سخت ترین سزا تھی، لیکن کیا مجال جو اُس کے پائے ثبات میں ذرا سی بھی لغزش آئی ہو۔

آٹھویں دن جب روایت کے مطابق "صاحب کا دورہ" آیا تو پھانسی کوٹھڑیوں میں بند سکھ قیدیوں نے سوال اٹھایا؛ کہ اگر خان کی بیڑی نہ کھولی گئی تو وہ بھوک ہڑتال کر دیں گے۔

کم از کم اس "حساس احاطے" میں انہوں نے انسانی درندگی اور بربریت کا اس سے زیادہ بدترین مظاہرہ اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اور سپرنٹنڈنٹ کے لیے یہ کوئی معمولی "دھمکی" نہ تھی۔ یوں بھی وہ آٹھ دن سے زیادہ مسلسل بیڑی لگا بھی نہیں سکتا تھا! اُس نے انہی قدموں پر کھڑے کھڑے پنڈت مہنگا مل کو حکم دیا کہ وہ خان کا ڈنڈا بیڑی اُتار کر اُسے بیڑی پہنا دے!!

خود اُس نے خان والی کوٹھڑی کے سامنے رُکنے کی ہمت بھی نہیں کی تھی اور تیزی سے اپنا راؤنڈ مکمل کر کے "پھانسی احاطے" سے باہر نکل گیا تھا۔



چکر حوالدار مہنگا مل جب اپنے ساتھ مشقتی "لوہار پنجے" والے کو لے کر اس کی بیڑیاں اُتارنے آیا تو خان کے ہونٹوں پر ہمیشہ جیسی طنزیہ مسکراہٹ حسبِ معمول چپکی ہوئی تھی۔

"بس...." اُس نے حوالدار کا تمسخر اُڑایا۔

خان کے مُنہ سے نکلے صرف ایک لفظ نے ہی اُس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی! اس طرح تو کبھی بڑے سے بڑے بدمعاش نے بھی اُس کا مضحکہ نہیں اُڑایا تھا۔ مہنگا مل چپکا کھڑا رہا۔ وہ "پرانا ملازم" تھا اور بخوبی جانتا تھا کہ معاملہ اس سے بھی آگے جا سکتا ہے۔ جب کوئی قیدی اپنی سی کرنے پر آجائے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ خان کی نہ صرف بیڑی بدلی گئی بلکہ پھانسی احاطے میں بند سزائے موت کے قیدیوں کی دھمکی پر جو اَب خان کو "ہیرو" کا درجہ دینے لگے تھے جیل حکام کو خان کے لیے جیل سے "سپیشل ڈائیٹ" لگوانی پڑی۔



پہلی مرتبہ وہ آج خان کے دوبدو کھڑا ہو کر رات کی تاریکی میں اُس سے گفتگو کر رہا تھا۔ اُس نے یہ ڈرامہ "انٹیلی جنس" حکام کی ہدایت پر کھیلا تھا لیکن اب بڑی شدت سے اُسے اپنی سُبکی کا احساس ہو رہا تھا۔

وہ بڑی تیزی سے بغیر کچھ کہے سُنے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے دفتر میں آگیا۔ غصّے سے اُس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ رات کے گیارہ بج چلے تھے اور ساری جیل پر موت کا سناٹا طاری تھا۔ کچھ سوچ کر اُس نے فون اٹھایا اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر ٹنڈن کا نمبر ڈائل کیا۔

ٹنڈن پچھلے اٹھائیس گھنٹے سے ایک خصوصی کیس کے سلسلے میں مسلسل جاگ رہا تھا اور ابھی اُس کی آنکھ لگے بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اچانک گھنٹی کی کرخت آواز نے اُسے نیند سے بیدار کر دیا! پہلے تو اُسے کچھ سمجھ ہی نہ آئی، آنکھوں میں گھُس آنے والی تیز جلن نے اُس کا دماغ ماؤف کر دیا اور جب وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہُوا تو اُس کا جی چاہا کہ فون اٹھا کر دیوار سے دے مارے لیکن سوچ کر کہ کہیں کسی بڑے افسر کا نہ ہو، وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

"ہیلو"۔۔۔ وہ فون کان سے لگاتے ہی دھاڑا۔

"مَیں دُوبے بول رہا ہُوں"۔۔۔ دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز اتنی اُونچی تھی کہ ٹنڈن کو بالکل لاشعوری طور فون کو کان سے پرے کرنا پڑا۔

"کیا بات ہے۔۔۔ اتنی رات گئے کیا مصیبت آگئی"؟ اُس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں دُوبے کو جواب دیا۔

"بات وات کچھ نہیں۔۔۔ تم سب لوگ جاؤ جہنم میں۔ مَیں تمہارا ماتحت نہیں کہ تمہارے اشاروں پر ناچتا رہوں۔ سمجھے تم....."

اُس کے اندازِ تخاطب اور باتوں نے ٹنڈن کو پاگل ہی تو کر دیا تھا۔۔۔

"شٹ اپ"، چلّا کر اُس نے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

دوسری طرف دُوبے نے بھی اُسے باقاعدہ گالیوں سے نوازتے ہُوئے اپنا فون بند کر دیا تھا۔

رات وقت کے سینے پر پاؤں دھرتی ہولے ہولے اپنے انجام کی طرف رینگ رہی تھی۔ بادلوں کے وہ منتشر ٹکڑے جنہوں نے سرِ شام ہی آسمان کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اب اجتماعی شکل میں چاند کے گرداگرد آہنی فصیل کی طرح تن گئے تھے۔ ایک زوردار دھاڑا اچانک ہی آسمان کے سینے سے بلند ہوئی اور ٹپ ٹپ بوندیں گرنے لگیں۔ جلد ہی ان بوندوں نے موسلادھار بارش کی شکل اختیار کر لی۔۔۔ بوڑھا آسمان شاید پھانسی کوٹھڑیوں میں بند اس جواں مرد کی حالتِ زار پر آنسو بہا رہا تھا، یا پھر اُس سے خان کی یہ بے بسی دیکھی نہ گئی اور اب وہ گرج گرج اور برس برس کر اپنے غم و غصّے کا اظہار کر رہا تھا۔

خان اپنی کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے سے آن لگا تھا۔ اُس کے سامنے مختصر سے احاطے پر موسلادھار بارش کا رقص اُسے خاصی لطافت فراہم کر رہا تھا:

"وہ بھی تو ایک ایسی ہی رات تھی جب آج سے قریباً اڑھائی سال پہلے اُس نے موت کی اس طویل اور اندھی شاہراہ پر پہلا قدم رکھا تھا"

اپنی ٹریننگ کے خاتمے پر جب وہ پہلی مرتبہ اہم مشن پر روانہ ہو رہا تھا تو اُس بوڑھے صوبیدار میجر نے جو اُس کا انسٹرکٹر بھی تھا اُسے کہا تھا۔

"بیٹا! اصل میں ایک ہی بات یاد رکھنا چاہیے۔"

"وہ کیا سَر؟" نجانے اُس نے کیوں خلافِ اصول اُس سے یہ سوال کیا۔

"دیکھو بچّے! یہ جسم جو ہے نا۔۔۔ یہ کچھ بھی نہیں، کچھ حیثیت نہیں اس کی۔ زندہ رہنے والی چیز تو روح ہے بچّے! اگر زندگی میں کبھی دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو جسم کو کبھی اولیت نہ دینا۔ اس پر لگے داغ اور اذیت کے تمام نشانات کبھی نہ کبھی اپنی موت مر جاتے ہیں۔ لیکن روح کا معاملہ بالکل الگ

ہے۔ بالکل جُدا ——— اُسے کبھی داغدار نہ ہونے دینا ورنہ ساری زندگی جہنم کا ایندھن بنے رہو گے۔ کیونکہ تمہارا ضمیر خوش قسمتی سے زندہ ہے۔"

بوڑھے صوبیدار میجر نے کتنے آسان لفظوں میں عابد خان کو یہ نقطہ سمجھا دیا تھا ——— اور اُس نے کبھی اپنے انسٹرکٹر کی اس بات کو نہ بُھلایا۔



دونوں سویلین لباس ہی میں اُس سرحدی اسٹیشن تک آئے تھے ——— اُن کے ساتھ یہاں بمشکل آٹھ دس سواریاں اُتری تھیں۔

بوڑھے انسٹرکٹر نے اسٹیشن کے ایک کونے میں لگے نل پر مُنہ ہاتھ دھونے کے بہانے اُس وقت تک انتظار کیا جب تک تمام سواریوں نے اپنا راستہ نہ ناپ لیا۔

"آؤ چلیں ———" اُس نے اپنی بوڑھی اور جہاندیدہ نظروں سے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد اُسے مخاطب کیا۔

دونوں ریلوے لائن عبور کر کے شہر کی متضاد سمت میں چلنے لگے۔ بوڑھا انسٹرکٹر اُسے دو تین میل کھیتوں کے بیچوں بیچ پیدل چلاتا اُس "ڈاک بنگلے" تک لے آیا جو انہی مقاصد کے لیے عموماً ریزرو رہتا تھا۔

ڈاک بنگلے پر اُن کا استقبال ایک درمیانی عمر کے مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کے مالک کرنل نے کیا۔ صوبیدار کی دونوں ایڑیاں کسی میکانکی عمل کے تحت اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی آپس میں جُڑ گئی تھیں۔

"کم آن مائی بوائے! ویل کم ٹو یو" ——— انہوں نے گرم جوشی سے پہلے عابد خان سے مصافحہ کیا پھر اُسے گلے لگا کر اس کی کمر پر تھپکی دے کر خود سے الگ کر دیا۔

"کیسا پٹھا ہے صوبیدار صاحب! ٹھیک ہے نا۔"

"ایک دم ٹھیک ہے سر!" ——— صوبیدار کی ایڑیاں پھر آپس میں مل گئیں۔

"ویل ڈن ——— ویل ڈن" ——— انہوں نے عابد خان کے بازوؤں کی مچھلیاں ٹٹولتے ہوئے صوبیدار کو شاباش دی۔

جب وہ کرنل صاحب کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا تو صوبیدار باہر ہی رک گیا تھا۔ کمرے کے وسط میں رکھے میز پر ایک نقشہ پہلے سے بچھا تھا اور چھت سے لٹکتے بلب کی زرد روشنی دن کے وقت بڑے عجیب اور بے ڈھنگے طریقے سے اس کا احاطہ کر رہی تھی۔ سالوں پہلے کے تعمیر شدہ ڈاک بنگلے کی اونچی چھت اور کمرے کے ماحول کا جائزہ عابد خان نے اپنی ٹریننگ کے مطابق اندر داخل ہوتے ہی لے لیا تھا۔

کرنل صاحب نے اُسے ایک کونے میں بڑے سلیقے سے سجائے گئے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُن کے کمرے میں داخل ہونے کے چند ہی منٹ بعد ایک مؤدب بیرا چائے کے برتن بڑے سلیقے سے سجا کر لے آیا تھا۔ چائے نوشی کے دوران کرنل اُس سے بڑے دوستانہ ماحول میں بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ عابد کو تو یہ امید تھی کہ وہ اُس کی ٹریننگ سے متعلق سوالات کر کے اس کا ناطقہ بند کر دیں گے۔ کیوں کہ اس سے پہلے ہر ملاقات پر یہی ہوا تھا۔ لیکن آج خلافِ توقع انہوں نے اس موضوع کو بالکل نہیں چھیڑا تھا۔

"آپ مسٹر اوزنکار پوری!" چائے کا دَور ختم ہوتے ہی انہوں نے خان کو اُس کی نئی شناخت سے مخاطب کیا ——— "اب کچھ باتیں آپ کے کام سے متعلق بھی ہو جائیں۔"

دونوں نے اسی میز کا ایک ایک کونہ سنبھال لیا تھا جس پر بچھے ایک بڑے سے نیلے رنگ کے نقشے پر مختلف جگہ سُرخ پنسل سے دائرے لگائے گئے تھے۔

وہ بڑی تیزی سے بغیر کچھ کہے سُنے لمبے لمبے ڈگ بھرتا اپنے دفتر میں آگیا۔ غصّے سے اُس کے جسم پر لرزہ طاری تھا۔ رات کے گیارہ بج چلے تھے اور ساری جیل پر موت کا سنّاٹا طاری تھا۔ کچھ سوچ کر اُس نے فون اٹھایا اور انٹیلی جنس کے اعلیٰ افسر ٹنڈن کا نمبر ڈائل کیا۔

ٹنڈن پچھلے اٹھائیس گھنٹے سے ایک خصوصی کیس کے سلسلے میں مسلسل جاگ رہا تھا اور ابھی اُس کی آنکھ لگے بمشکل آدھ گھنٹہ ہی گزرا تھا کہ اچانک گھنٹی کی کرخت آواز نے اُسے نیند سے بیدار کر دیا! پہلے تو اُسے کچھ سمجھ ہی نہ آئی، آنکھوں میں گھس آنے والی تیز جلن نے اُس کا دماغ ماؤف کر دیا اور جب وہ کچھ سمجھنے کے قابل ہُوا تو اُس کا جی چاہا کہ فون اٹھا کر دیوار سے دے مارے لیکن سوچ کر کہ کہیں کسی بڑے افسر کا نہ ہو، وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔

"ہیلو" ــــ وہ فون کان سے لگاتے ہی دھاڑا۔

"مَیں دُوبے بول رہا ہُوں" ــــ دوسری طرف سے بولنے والے کی آواز اتنی اُونچی تھی کہ ٹنڈن کو بالکل لاشعوری طور فون کو کان سے پرے کرنا پڑا۔

"کیا بات ہے ــــ اتنی رات گئے کیا مصیبت آگئی" ؟ اُس نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں دُوبے کو جواب دیا۔

"بات وات کچھ نہیں ــــ تم سب لوگ جاؤ جہنم میں۔ مَیں تمہارا ماتحت نہیں کہ تمہارے اشاروں پر ناچتا رہوں۔ سمجھے تم....."

اُس کے اندازِ تخاطب اور باتوں نے ٹنڈن کو پاگل ہی تو کر دیا تھا ــــ

"شٹ اپ" چلّا کر اُس نے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

دوسری طرف دُوبے نے بھی اُسے باقاعدہ گالیوں سے نوازتے ہُوئے اپنا فون بند کر دیا تھا۔

رات وقت کے سینے پر پاؤں دھرتی ہولے ہولے اپنے انجام کی طرف رینگ رہی تھی۔ بادلوں کے وہ منتشر ٹکڑے جنہوں نے سرِ شام ہی آسمان کو سمیٹنا شروع کر دیا تھا۔ اب اجتماعی شکل میں چاند کے گرداگرد آہنی فصیل کی طرح تن گئے تھے۔ ایک زوردار دھاڑ اچانک ہی آسمان کے سینے سے بلند ہوئی اور ٹپ ٹپ بوندیں گرنے لگیں۔ جلد ہی ان بوندوں نے موسلا دھار بارش کی شکل اختیار کر لی ــــ بوڑھا آسمان شاید پھانسی کوٹھڑیوں میں بند اس جواں مرد کی حالتِ زار پر آنسو بہا رہا تھا، یا پھر اُس سے خان کی یہ بے بسی دیکھی نہ گئی اور اب وہ گرج گرج اور برس برس کر اپنے غم و غصّے کا اظہار کر رہا تھا۔

خان اپنی کوٹھڑی کے سلاخوں والے دروازے سے آن لگا تھا۔ اُس کے سامنے مختصر سے احاطے پر موسلا دھار بارش کا رقص اُسے خاصی لطافت فراہم کر رہا تھا:

"وہ بھی تو ایک ایسی ہی رات تھی جب آج سے قریباً اڑھائی سال پہلے اُس نے موت کی اس طویل اور اندھی شاہراہ پر پہلا قدم رکھا تھا۔"

اپنی ٹریننگ کے خاتمے پر جب وہ پہلی مرتبہ اہم مشن پر روانہ ہو رہا تھا تو اُس بوڑھے صوبیدار میجر نے جو اُس کا انسٹرکٹر بھی تھا اُسے کہا تھا۔

"بیٹا! اصل میں ایک ہی بات یاد رکھنا چاہیے۔"

"وہ کیا سَر ؟" نجانے اُس نے کیوں خلافِ اصول اُس سے یہ سوال کیا۔

"دیکھو بچّے! یہ جسم جو ہے نا ــــ یہ کچھ بھی نہیں، کچھ حیثیت نہیں اس کی۔ زندہ رہنے والی چیز تو روح ہے بچّے! اگر زندگی میں کبھی دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا پڑے تو جسم کو کبھی اوّلیت نہ دینا۔ اس پر لگے داغ اور اذیت کے تمام نشانات کبھی نہ کبھی اپنی موت مر جاتے ہیں۔ لیکن روح کا معاملہ بالکل الگ

ہے۔ بالکل جُدا ـــــ اُسے کبھی داغدار نہ ہونے دینا ورنہ ساری زندگی جہنم کا ایندھن بنے رہو گے۔ کیونکہ تمہارا ضمیر خوش قسمتی سے زندہ ہے۔"

بوڑھے صوبیدار مجر نے کتنے آسان لفظوں میں عابد خان کو یہ نقطہ سمجھا دیا تھا ـــــ اور اُس نے کبھی اپنے انسٹرکٹر کی اس بات کو نہ بھلایا۔



دونوں سویلین لباس ہی میں اُس سرحدی اسٹیشن تک آئے تھے ـــــ اُن کے ساتھ یہاں بمشکل آٹھ دس سواریاں اُتری تھیں۔

بوڑھے انسٹرکٹر نے اسٹیشن کے ایک کونے میں لگے نل پر مُنہ ہاتھ دھونے کے بہانے اُس وقت تک انتظار کیا جب تک تمام سواریوں نے اپنا راستہ نہ ناپ لیا۔

"آؤ چلیں ـــــ" اُس نے اپنی بوڑھی اور جہاندیدہ نظروں سے ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد اُسے مخاطب کیا۔

دونوں ریلوے لائن عبور کر کے شہر کی متضاد سمت میں چلنے لگے۔ بوڑھا انسٹرکٹر اُسے دو تین میل کھیتوں کے بیچوں بیچ پیدل چلاتا اُس "ڈاک بنگلے" تک لے آیا جو انہی مقاصد کے لیے عموماً ریزرو رہتا تھا۔

ڈاک بنگلے پر اُن کا استقبال ایک درمیانی عمر کے مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کے مالک کرنل نے کیا۔ صوبیدار کی دونوں ایڑیاں کسی میکانکی عمل کے تحت اُس کی شکل پر نظر پڑتے ہی آپس میں جُڑ گئی تھیں۔

"کم آن مائی بوائے! ویل کم ٹو یو" ـــــ انہوں نے گرم جوشی سے پہلے عابد خان سے مصافحہ کیا پھر اُسے گلے لگا کر اس کی کمر پر تھپکی دے کر خود سے الگ کر دیا

"کیسا پٹھا ہے صوبیدار صاحب! ٹھیک ہے نا؟"

"ایک دم ٹھیک ہے سر!" ـــــ صوبیدار کی ایڑیاں پھر آپس میں مل گئیں۔

"ویل ڈن ـــــ ویل ڈن" ـــــ انہوں نے عابد خان کے بازوؤں کی مچھلیاں ٹٹولتے ہوئے صوبیدار کو شاباش دی۔

جب وہ کرنل صاحب کے ساتھ ایک کمرے میں داخل ہوا تو صوبیدار باہر ہی رک گیا تھا۔ کمرے کے وسط میں رکھے میز پر ایک نقشہ پہلے سے بچھا تھا اور چھت سے لٹکتے بلب کی زرد روشنی دن کے وقت بڑے عجیب اور بے ڈھنگے طریقے سے اس کا احاطہ کر رہی تھی۔ سالوں پہلے کے تعمیر شدہ ڈاک بنگلے کی اُونچی چھت اور کمرے کے ماحول کا جائزہ عابد خان نے اپنی ٹریننگ کے مطابق اندر داخل ہوتے ہی لے لیا تھا۔

کرنل صاحب نے اُسے ایک کونے میں بڑے سلیقے سے سجائے گئے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اُن کے کمرے میں داخل ہونے کے چند ہی منٹ بعد ایک مؤدب بیرا چائے کے برتن بڑے سلیقے سے سجا کر لے آیا تھا۔ چائے نوشی کے دوران کرنل اُس سے بڑے دوستانہ ماحول میں بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ عابد کو تو یہ اُمید تھی کہ وہ اُس کی ٹریننگ سے متعلق سوالات کر کے اس کا ناطقہ بند کر دیں گے۔ کیوں کہ اس سے پہلے ہر ملاقات پر یہی ہوا تھا۔ لیکن آج خلافِ توقع انہوں نے اس موضوع کو بالکل نہیں چھیڑا تھا۔

"آیئے مسٹر اونکار پوری!" چائے کا دَور ختم ہوتے ہی انہوں نے خان کو اُس کی نئی شناخت سے مخاطب کیا ـــــ "اب کچھ باتیں آپ کے کام سے متعلق بھی ہو جائیں۔"

دونوں نے اُسی میز کا ایک ایک کونہ سنبھال لیا تھا جس پر بچھے ایک بڑے سے نیلے رنگ کے نقشے پر مختلف جگہ سُرخ پنسل سے دائرے لگائے گئے تھے۔

"مسٹر پوری!___ کرنل نے ایک نشان زدہ جگہ پر انگلی لگائی___"یہاں سے تمہیں سرحد عبور کرنا ہے اور یہ ہیں وہ گاؤں جو اس راستے پر آئیں گے۔" انہوں نے یکے بعد دیگرے چار پانچ مزید نشان زدہ جگہوں کی نشاندہی کی___"تمہارا گائیڈ کوشش کرے گا کہ تمہیں ہنگامے اور شور شرابے سے محفوظ رکھ کر ہی "مکسر" تک پہنچادے۔ لیکن ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کی فورسز راستے پر کہیں ڈیپلائے ہو گئی ہوں اور یہیں راستہ بدلنا پڑے، یا ان دیہاتوں میں سے ہو کر گزرنا پڑے۔" انہوں نے رک کر ایک نظر عابد خان کے متجسس چہرے پر ڈالی جس کی آنکھیں نقشے پر گڑی ہوئی تھیں۔

"یہ سارا ایریا بڑا "حساس" ہے"___ انہوں نے انگلی کو یکے بعد دیگرے تین چار جگہ رکھ کر "حساس ایریا" کی نشاندہی کی۔" مائی بوائے! "لانچنگ پیڈ سے "لانچنگ اسٹیشن" تک تمہاری راہنمائی تمہارا گائیڈ کرے گا، لیکن اپنی حیثیت کو کبھی نہ بھلانا۔ خدا کے بعد تمہارا بہترین ساتھی تمہارا اپنا اعتماد ہے۔ اپنی صلاحیتوں کو ہمیشہ جگائے رکھنا۔ راستے میں یا دورانِ قیام ایک لمحے کی غفلت بھی تمہیں کہاں سے کہاں لے جا سکتی ہے۔ اس کا شاید تم اندازہ بھی نہ کر سکو۔"

ایک مرتبہ پھر سلسلہ گفتگو روک کر انہوں نے سگار سلگایا اور اُس کا دھواں مُنہ اوپر کر کے کمرے کی چھت کی طرف پھینکنے کے بعد دوبارہ اُس سے مخاطب ہوئے۔

"تھوڑی دیر کے بعد تمہاری ملاقات تمہارے گائیڈ نتھا سنگھ سے کروائی جائے گی۔ میرا خیال ہے ٹریننگ کی کسی بات کو اب دھرانا اچھا نہیں لگتا۔"

وہ مسکرائے اور اُسے تھپکی دے کر اپنے ساتھ دوسرے کمرے میں لے گئے۔

دوسرے کمرے میں صوبیدار کے ساتھ ایک اکھرے بدن اور درمیانی عمر کا سکھ بیٹھا تھا۔

"اس کا نام نتھا سنگھ ہے۔" اُنہوں نے اُس کا تعارف نتھا سنگھ سے کروایا۔ "اور یہ ہے اُونکار پوری۔" اُنہوں نے نتھا سنگھ کو اُس کی طرف متوجہ کیا۔

"ست سری اکال جی" نتھا سنگھ نے ہاتھ باندھ کر پرنام کیا۔

"ست سری اکال"___ خان نے بھی وہی عمل دھرایا۔

وہ جانتا تھا: "جس طرح اُس کے صحیح نام کا علم نتھا سنگھ کو نہیں ہے اُسی طرح اُسے بھی نتھا سنگھ کا نام غلط بتایا گیا ہے۔"

اُس کے بوڑھے انسٹرکٹر نے اُسے یہی بتایا تھا: "بچے! ہمیشہ خود کو چھپا کر دوسروں کی اصلیت کو جاننے کی کوشش کرو! یہی ہے ہمارے کھیل کا اولین اُصول"___

"تم لوگ گپ شپ لگاؤ ابھی ڈیڑھ دو گھنٹے باقی ہیں۔" کہہ کر کرنل صاحب صوبیدار کے ساتھ باہر نکل گئے۔

"ہم کب تک مکسر پہنچ جائیں گے؟" خان نے خود ہی سلسلہ گفتگو جاری کرنے کی تمہید باندھی۔

"اگر پرماتما نے خیر رکھی اور کوئی مشکل راستے میں نہ پڑ گئی۔ تو صبح پہلی بس پر ہم "ہندومل کوٹ" سے مکسر چلے جائیں گے۔" نتھا سنگھ نے بات مکمل ہوتے ہی اپنی قمیص کی اوپر والی جیب سے بیڑیوں کا بنڈل نکالا اور ایک بیڑی باہر نکال کر اُس کی طرف بڑھا دی۔ خان سگریٹ نہیں پیتا تھا لیکن وہ اپنی شخصیت کے کسی بھی پہلو سے نتھا سنگھ کی آگاہی کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اُس نے اطمینان سے بیڑی نکال کر عادی بیڑی نوشوں کی طرح اُس کے ایک کنارے کو دانتوں سے توڑا اور اپنے ایک ہاتھ کی ہتھیلی پر ٹھونک کر دونوں انگلیوں میں پھنسا لیا۔

ماچس کی جس تیلی سے نتھا سنگھ نے بیڑی سلگائی تھی ۔ اُسی تیلی سے اُس نے خان کی بیڑی کے مُنہ پر شعلہ سجا دیا ۔ خان کی عقابی نظروں نے بخوبی جائزہ لے لیا تھا کہ بیڑی کا بنڈل بھارت کا بنا ہُوا ہے ۔

نتھا سنگھ اس کھیل کا شاید پرانا کھلاڑی تھا کہ اُس کی کوئی بات "خلافِ اصول" نہیں تھی ۔ اب تک زیادہ باتیں اُسی نے کی تھیں ۔ خان تو صرف سوالات کرتا رہا تھا ۔ اُس سرحدی علاقے کے متعلق جہاں سے انہوں نے سرحد پر نقب لگائی تھی ۔ راستے میں آنے والے دیہات ، نہریں ، ریلوے لائن ، لیٹر بکس ، کچے پکے راستے ، سب ہی کچھ تو اُس نے نتھا سنگھ سے پوچھ لیا تھا ۔

اُس کے گائیڈ نے ابھی تک کوئی سوال اُس کی ذات سے متعلق نہیں کیا تھا ۔ خان اُس کی مجبوری کو سمجھتا تھا ۔ دو آدمی جب پہلی مرتبہ ملیں تو عموماً سلسلہ گفتگو تعارف ہی سے شروع ہوتا ہے جبکہ یہاں تعارف شجر ممنوعہ تھا ۔

○

تھوڑی دیر بعد کرنل صاحب دوبارہ آ گئے اس مرتبہ انہوں نے دونوں کے ساتھ ایک مرتبہ پھر چائے کا کپ "شیئر" کیا ۔ پھر نتھا سنگھ تو وہیں رہ گیا جبکہ خان کو کرنل صاحب دوسرے کمرے میں لے گئے ۔ یہاں اُسے کپڑے تبدیل کرنا تھے اور اب وہ روپ دھارنا تھا جس رُوپ میں اُسے سرحد عبور کرنی تھی ۔

صوبیدار کی موجودگی میں کرنل صاحب نے اُس کے تمام کپڑے اُتروا دیے تھے اُس کے جسم پر صرف ایک زیر جامہ رہ گیا تھا ۔ دونوں نے باری باری اُن کپڑوں کو چیک کیا جو خان نے پہنے تھے ۔ کپڑوں پر خصوصی طور سے بھارتی علاقے کی "لانڈری" کی مہر لگائی گئی تھی اور دونوں نے اس بات کا سخت تنقیدی نظروں سے جائزہ لیا تھا ۔ کہ ان کپڑوں میں سے کسی پر کوئی ایسی معمولی سی نشانی بھی باقی نہ رہے جو خان

کے پاکستانی ہونے پر دلالت کرے ۔

اُسے پہننے کے لیے جو بنیان دی گئی تھی اُس میں مختلف خانے بنا کر بھارتی کرنسی نوٹ سلے ہُوئے تھے ۔ زادِ راہ کے لیے الگ سے کچھ نوٹ اس کے ہاتھ میں تھمائے گئے ۔ دس پندرہ منٹ بعد جب عابد خان اُس کمرے سے برآمد ہُوا تو وہ مکمل "اونکار پوری" بن چکا تھا ۔

ہاتھ میں پکڑے کپڑے کے تھیلے میں اُس نے کچھ افیون رکھی ہوئی تھی ۔ بطورِ احتیاط اُسے فی الوقت "سمگلر" کے روپ میں سرحد عبور کروائی جا رہی تھی تاکہ خدانخواستہ گرفتاری کی صورت میں اُسے "جاسوس" کے بجائے سمگلر سمجھا جائے ۔

کرنل صاحب اُسے ایک کونے میں لے گئے اور انہوں نے دوبارہ اُس سے وہ "سیف سگنل" دھرائے جو اُس نے اپنے گائیڈ کے ہاتھ اپنے "سیف اسٹیشن" پہنچنے پر اُن کی طرف بھیجنے تھے ۔ اچانک خطرے کی صورت میں اپنائی جانے والی تیار شدہ پلاننگ پوچھی اور وہ کور سٹوری جس کے ساتھ عابد خان عرف اونکار پوری کو سرحد عبور کروائی جا رہی تھی ۔

اپنی تشفی کرنے پر انہوں نے صوبیدار صاحب کو قریب آنے کا اشارہ کیا اور "ایجنٹ" کی کامیاب ٹریننگ پر انہیں مبارکباد دے کر انہوں نے گرم جوشی سے عابد خان سے معانقہ کیا : "او ۔ کے بوائے ! مَیں تمہاری کامیابی کے لیے خدا سے دعا گو ہوں ___ گڈ لک" ___ انہوں نے مُسکرا کر خان کی پیٹھ تھپتھپائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے اُس "واکسی" کی طرف چل دیے ۔ جس کے باہر ایک مستعد سفید پوشس اُن کے لیے دروازہ کھولے کھڑا تھا ۔

○

جب وہ نتھا سنگھ کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر جسے صوبیدار خود چلا رہا تھا ، جس

سرحدی پوسٹ کی طرف روانہ ہوا تو سورج اُن کے دائیں ہاتھ دُور تک پھیلے درختوں کے جھنڈ میں ڈوب رہا تھا۔ عابد خان قریباً گردن موڑے درختوں کے اُس سلسلے کے پیچھے جھانک رہا تھا جہاں سرمئی شام پر اچانک سیاہی غالب آنے لگی تھی۔

بادل اچانک ہی پورب کی سمت سے آئے اور انہوں نے بڑی تیزی سے سارے آسمان کو ڈھانپ لیا۔ دیکھتے دیکھتے جیپ کی ونڈسکرین دھندلا گئی۔ بونٹ پر بارش کے قطروں کا رقص اور اُس سے بلند ہوتی آوازوں نے عابد خان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"بہت خوش قسمت ہو بچے!" ــــ صوبیدار نے وائپر مشین کا بٹن دباتے ہوئے اُس کی طرف کن اَکھیوں سے دیکھا ــــ "ایک تو یوں بھی دیوالی کی رات ہے تمہارے یار شراب کے نشے میں بدمست اوندھے پڑے ہوں گے اور اُس پر یہ بارش ــــ عطیۂ خداوندی ہے بچے! خدا تجھے اپنی امان میں رکھے۔"

ڈاک بنگلے سے سرحدی پوسٹ تک کا فاصلہ انہوں نے قریباً دو گھنٹے میں طے کیا! بارش برس برسا کر اب ختم ہو چکی تھی۔ نتھا سنگھ پچھلی سیٹ پر چُپ چاپ بیٹھا تھا۔ اس دوران اُس نے ایک لفظ بھی مُنہ سے نہیں نکالا تھا جبکہ عابد خان اور صوبیدار صاحب آپس میں ایک آدھ بات کبھی کبھی کرتے آئے تھے۔

جیپ "پکٹ" سے قریباً آدھا میل دُور ہی روک کر صوبیدار نیچے اُتر آیا۔ اُس نے عابد کو وہیں بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ جیپ سے اُتر کر اُس نے پکٹ کی سمت ٹارچ جلا بُجھا کر اُن لوگوں کو اپنی آمد سے مطلع کیا۔

چند ہی منٹ بعد پکٹ انچارج اُس کے سامنے کھڑا تھا۔ کسی اجنبی کو اُس طرف آتے دیکھ کر عابد خان نے اپنے کندھے پر رکھی چادر سے اپنا چہرہ قریباً چھپا لیا تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ "رینجرز" کو اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر مُلک کی

خدمت کے لیے سرحد عبور کرنے والے ایجنٹوں سے غائبانہ عشق ہوتا ہے اور وہ ایسے کسی بھی ایجنٹ کی شکل دیکھنا یا اُس سے مصافحہ کرنا اپنے لیے باعثِ عزت جانتے ہیں۔

اس کی شخصیت کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اُس کے انسٹرکٹر نے انتہائی احتیاطی تدابیر اختیار کی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ وہ پکٹ پر بھی نہیں گیا تھا۔ "پکٹ انچارج" اپنے عقیدتمندانہ جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اور وہ تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر بھی چلتا ہوا جیپ تک آ گیا تھا۔ عابد خان نے اپنا چہرہ ننگا کیے بغیر اپنا ہاتھ اُس سے مصافحہ کے لیے باہر نکال دیا۔ جسے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر پکٹ انچارج نے پہلے گرم جوشی سے دبایا پھر اُن پر بے اختیار جُھک کر بوسہ دیا۔

"تم جو کوئی بھی ہو میرے بیٹے اس مُلک کی آنکھیں ہو ــــ خدا ان آنکھوں کی حفاظت کرے۔ میری خوش قسمتی ہے کہ تم لوگوں کے ساتھ سرحد تک چلنے کا اعزاز مجھے میسر آ رہا ہے۔ اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔"

وہ عابد کا ہاتھ چھوڑ کر اُلٹے قدموں پیچھے ہٹ گیا۔ عابد کے ہونٹ لرزے اور محض "شکریہ" کا لفظ کہہ کر اُس نے خاموشی اختیار کر لی۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا نتھا سنگھ ماحول سے بالکل بے نیاز دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے بھی عابد خان کی طرح اپنا چہرہ پگڑی کے پلّو سے ڈھانپ رکھا تھا۔

"باہر آؤ بچے!" ــــ صوبیدار نے اُس کے قریب پہنچ کر سرگوشی کی۔

عابد اپنے کپڑے کے تھیلے سمیت باہر آ گیا۔ اُن کے سفر کا آغاز ہونے والا تھا۔ اب اُس کا بوڑھا انسٹرکٹر جس نے جی جان سے چھ ماہ تک اُسے تربیت کے کٹھن مراحل سے گزارا تھا۔ اُس سے الوداعی کلمات کہنے جا رہا تھا۔ عابد خان ڈاک بنگلے سے یہاں تک صرف یہی ایک بات سوچتا آ رہا تھا کہ اس "الوداعی لمحے" پر اس

کا ردِ عمل کیا ہو گا؟

اُس کا محترم اُستاد اُسے کیا کہے گا؟ وہ خود اس سے کیا باتیں کرے گا؟

دونوں ایک دوسرے سے کیا کہہ سُن کر الگ ہوں گے ـــــ اور اب وہ لمحہ آن پہنچا تھا۔ نتھا سنگھ ابھی تک جیپ کے اندر ہی بیٹھا تھا۔ صوبیدار اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے جیپ سے چند فٹ دُور لے گیا۔ وہ مُنہ ہی مُنہ میں کچھ قرآنی آیات کا وِرد کر رہا تھا۔ ایک جگہ رُک کر اُس نے خان پر پھُونک ماری، پھر دوبارہ کچھ پڑھا اور شفقت بھری نظروں سے دیکھتے ہُوئے اُس پر پھر پھونکا۔

"میرے بچّے! ہمیں اب الگ ہونا ہے میرا رواں رواں خدا سے تمہاری کامیابی اور واپسی کے لیے دعا گو ہے۔ تم خوش قسمت ہو کہ یہ سعادت تمہیں نصیب ہو رہی ہے ـــــ بچّے! معلوم نہیں اب زندگی میں کتنی دیر بعد ملاقات ہو گی۔ میں یہاں رہوں گا بھی یا کہیں اور چلا جاؤں گا۔ میری ایک آخری بات غور سے سُن لینا۔ موت سے فرار نہیں ـــــ مرنا دُنیا کی بڑی تلخ سچائی ہے لیکن کسی عظیم مقصد کے حصول کی راہ میں موت آ جائے تو اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو گی۔"

عابد خان کے ہونٹ لرزے۔ "او کے سر۔"

اُس نے بڑی مشکل سے اپنی جذباتی حالت پر قابو پایا ہوا تھا۔ پچھلے چھ ماہ تک وہ دونوں ایسے انجانے لیکن بے حد مضبوط رشتے میں بندھے رہے تھے کہ ایک بے نام سا تعلق دونوں کے درمیان بندھ چلا تھا۔ اس تعلق کی مضبوطی کا اندازہ عابد خان کو آج اس وقت ہُوا تھا، جب اُس کا بوڑھا اُستاد اُس سے الوداعی ملاقات کر رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُس کی کوئی انتہائی عزیز شے اُس سے چھن رہی ہو ـــــ یہ لمحے اُس پر بڑے شاق گزر رہے تھے۔

قریبی جھاڑیوں میں ہونے والی سرسراہٹ نے اُسے ایکدم چوکنا کر دیا لیکن

اپنے انسٹرکٹر کو صورتِ حال سے لاتعلق دیکھ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

"چہرہ چھپا لو ـــــ!" صوبیدار نے سرگوشی کی۔

دوسرے ہی لمحے اُن کے نزدیک دو مستعد رینجرز اپنے کمپنی کمانڈر سمیت موجود تھے۔

"تیار جوان" ـــــ صوبیدار نے خالص فوجی لہجے میں اُنہیں مخاطب کیا۔

"جی صاحب" ـــــ دونوں کی ایڑیاں مل گئیں۔

"آؤ بچّے" ـــــ صوبیدار صاحب اُس کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ جیپ کے نزدیک چلے گئے۔ نتھا سنگھ کو انہوں نے باہر آنے کے لیے کہا اور اپنی جیب سے "وکس" کی ڈبیا نکال کر کھولی، ایک گولی انہوں نے اپنے ہاتھ سے عابد خان کے منہ میں ڈال دی اور دو تین گولیاں نکال کر اُس کی جیب میں ڈال دیں۔

"نتھا سیہاں بچّے کو پھولوں پر چلا کر لے جانا" ـــــ اُن کا لہجہ خاصا جذباتی ہو رہا تھا۔

زمین پر بیٹھ کر انہوں نے عابد خان کے پاؤں میں پہنے کینوس کے جوتوں کے تسموں کو ہاتھ پھیر کر چیک کیا اور کھڑے ہو گئے۔

"اگر دقّت محسوس ہو تو اُتار دینا!" آخری لمحے تک وہ اپنے عزیز شاگرد پر کڑی نظر رکھے ہُوئے تھے۔

رینجرز اب اُن کے نزدیک آ گئے تھے۔ صوبیدار صاحب نے ہاتھ پر بندھی گھڑی کے ڈائل پر نظر ڈالی۔ پھر عابد خان کے دونوں گال اپنے ہاتھوں سے تھپتھپا کر اُسے اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ انہوں نے خان کے ماتھے پر بوسہ دے کر اُسے خود سے الگ کیا۔ اُس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔ مسکراہٹ اپنے چہرے پر لا کر انہوں نے خان کو "فی امان اللہ" کہا اور دوبارہ اُس

وہ رُک کر ایک نظر مُڑ کر اُس کی طرف دیکھ کر اپنا اطمینان کر لیتا ـــــ انہیں دس پندرہ میل تک پیدل راستہ طے کرنا تھا۔ اُس کے اندازے کے مطابق اُن لوگوں نے بمشکل تین چار میل کا راستہ ہی طے کیا تھا کہ نتھا سنگھ زمین پر بیٹھ گیا۔

یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ خان رک جائے وہ اُس سے کسی معاملے میں مشاورت کرنا چاہتا تھا۔ خان فوراً جُھک گیا اور جُھکا جُھکا ہی اس کے نزدیک آ کر اُس کے قریباً ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر سامنے کی سمت اشارہ کیا۔ بہت دُور اُس کی انگلیوں کی سیدھ میں کبھی کبھی کوئی شعلے یا چنگاریاں اُسے پھُوٹتے ہوئے دکھائی دے رہی تھیں۔ آسمان پر کہیں کہیں اکّا دکّا تارہ بھی جھلملاتا ہُوا نظر آنے لگا تھا ـــــ بادل اب پھٹ کر ٹکڑیوں کی شکل میں پھیل رہا تھا۔ لیکن چاند کو بہر حال اُنہوں نے اپنے دامن میں چھپا رکھا تھا۔

"کیا ہے یہ؟" خان نے اُس کے کان میں سرگوشی کی۔

"سامنے ڈھولن وال گاؤں ہے۔ یہاں سے قریباً سوا ڈیڑھ کلومیٹر۔" نتھا سنگھ بولا

"لوگ شاید دیوالی منا رہے ہیں ـــــ ہم دوسرا راستہ اختیار کر لیتے ہیں۔" خان نے اپنی رائے پیش کی۔

"نہیں" نتھا سنگھ اس کی طرف جُھکا۔ "سب سے محفوظ راستہ یہی ہے۔ دیوالی کی وجہ سے دوسری طرف "سپیشل ناکے" بھی لگ سکتے ہیں۔ وہ لوگ جانتے ہیں کہ آج بہت سے لوگ "بارڈر توڑیں" گے ـــــ"

"پھر کیا کیا جائے؟"

میرا خیال ہے کہ سامنے کھیت میں بیٹھ کر تھوڑی دیر انتظار کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے" ـــــ نتھا سنگھ کے ساتھ وہ ابھی کسی بھی معاملے پر جرح کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔

نتھا سنگھ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا جب کہ خان اپنی جگہ بیٹھا رہا۔ نتھا سنگھ بڑے محتاط قدموں پر چلتا ہوا اُس کھیت تک پہنچا، جسے اُن دونوں کی جائے پناہ بننا تھا۔ اندر گھُس کر اُس نے حالات کا بنظرِ عمیق جائزہ لیا اور ایک کُنجِ عافیت تاڑنے کے بعد واپس خان کے پاس پہنچ گیا۔

خان سے کچھ فاصلے ہی پر رُک کر اُس نے ہاتھوں کے مخصوص اشارے سے اُسے "محفوظ سگنل" دیا اور قریب آنے کا اشارہ کیا۔ عابد خان دبے قدموں چلتا ہُوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ پھر وہ نتھا سنگھ کے تعاقب میں کھیت میں گھُس گئے۔ ایک جگہ قدرے خلا دیکھ کر نتھا سنگھ نے اپنے تھیلے سے چادر نکال کر بچھا دی۔ دونوں وہیں بیٹھ گئے۔



نتھا سنگھ نے جیب سے بیڑی کا بنڈل نکال کر ایک بیڑی اُس کی طرف بڑھا دی ـــــ "شما کرنا میں سفر میں رات کے وقت بیڑی نہیں پیتا۔" عابد خان نے کہا اور وہ سوچنے لگا: "اُس نے بیڑی کیوں سلگائی ہے، جبکہ کسی محفوظ مقام پر پہنچنے سے پہلے گائیڈ کو سگریٹ نوشی کی ممانعت کی جاتی ہے۔"

"کون پروا کرتا ہے ایسے ضابطوں کی۔ پھر یہ کوئی پڑھا لکھا جاسوس تو ہے نہیں، ہے تو جاہل سا سمگلر جو پاکستان انٹیلی جنس کے لیے کام کر رہا ہے۔" اُس نے سوچا اور ذہن میں پیدا ہونے والے شبہات کا وہیں گلا گھونٹ دیا۔

نتھا سنگھ نے دونوں ہاتھوں کی اوٹ میں بڑی احتیاط سے سر پر پگڑی کا سایہ کر کے بیڑی سلگائی۔ اُس کا بیڑی سُلگانے کا طریقہ اتنا محفوظ تھا کہ عابد خان کے ذہن سے رہے سہے خدشات بھی نکل گئے۔ وہ مطمئن ہو کر بیٹھ گیا۔

"شما کرنا مہاراج جی!" نتھا سنگھ نے بیڑی کا لمبا کش لے کر اُسے ہاتھوں میں

چھپائے ہوئے کہا۔

"ہم جیسے لوگ ہیں نشہ پانی کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتے۔"

"کوئی بات نہیں۔" خان نے جوابی سرگوشی کی۔

"آپ کا شاید یہ پہلا مشن ہے"۔۔۔ اُس نے اچانک ہی سوال داغ دیا۔

عابد خان نے بڑی اُلجھی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا لیکن وہ کسی اور طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ سوال بالکل خلافِ توقع تھا۔ وہ ضوابط کی مکمل خلاف ورزی کرنے لگا تھا۔

"میں سمجھا نہیں۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟"

"برا مت ماننا پوری صاحب"۔۔۔ نتھا سنگھ نے شاید اُس کا موڈ پہچان لیا تھا۔ "ہمارا آپ کا ساتھ تو اب بڑا لمبا ہوگا۔ ٹریننگ کی ہر بات پر عمل نہیں کیا جاتا۔ ہمیں ایک دوسرے کو اعتماد میں تو لینا ہی پڑتا ہے۔ ممکن ہے میں آپ کے کسی کام آسکوں۔ آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔۔۔۔"

"بہت دھنوادی ہوں میں تمہارا نتھا سنگھ!" عابد خان کی سرگوشی خاصی تلخ تھی۔۔۔ "لیکن ہم دونوں بہرحال ایک معاہدے کے پابند ہیں اور میرے خیال سے بہتر یہی ہے کہ ہم معاہدے کا احترام کریں۔"

"ٹھیک ہے مہاراج جی! ٹھیک ہے! جیسی آپ کی اچھیا (مرضی)" بڑی مکاری سے اس نے بات کا پانسہ پلٹ دیا۔

دونوں تقریباً آدھ گھنٹہ خاموش بیٹھے رہے۔

"میرے خیال سے اب چلنا چاہیئے۔" خان بولا۔

"ٹھیک ہے پوری صاحب۔" نتھا سنگھ نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

دونوں باہر آگئے۔

"ڈھولن وال" کی روشنیاں جوں کی توں برقرار تھیں۔ نتھا سنگھ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ وہ دونوں جنگلی گھاس کے ایک وسیع سلسلے کے بیچ کھڑے تھے جو اُن کے گرد اگرد میلوں تک پھیلتا چلا گیا تھا۔

"میں ذرا حالات کا جائزہ لے لوں۔" نتھا سنگھ نے اچانک ہی کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے کہا۔

"یار کس چکر میں پڑ گئے ہو، ہم کوئی دوسرا راستہ اپنا لیتے ہیں۔" خان نے بے تکلفی سے اپنے اور اُس کے درمیان پیدا ہونے والے تناؤ کو کم کرنا چاہا۔

"پوری صاحب! آپ کو ملکسر تک پہنچانا میری ذمہ داری ہے۔" اُس نے فیصلہ کن لہجے میں خان کو وارننگ دی۔

واقعی وہ ملکسر تک اُس کی "اطاعت" کم از کم اس حد تک کرنے کا پابند تھا کہ اُسی راستے پر سفر کرے جس کا انتخاب نتھا سنگھ کرے۔ خان چپکا ہو رہا۔

"تم یہاں اِس بُرجی کے پاس بیٹھو۔" نتھا سنگھ نے ایک بُرجی کی طرف اشارہ کیا۔ "میں آدھ گھنٹے تک لازماً واپس آجاؤں گا۔ میرے خیال سے رات اسی گاؤں میں گزار لیتے ہیں۔ یہاں میرے "جوتی دار" موجود ہیں۔"

وہ جانے کے لیے مڑا لیکن پھر رُک کر خان کے نزدیک بیٹھ گیا۔ "ایک چکر چلانا پڑے گا۔" اُس نے سرگوشی کی۔

"کیا"؟

"ڈھولن وال کے باہر ہی میرے یار کیسر سنگھ کی حویلی ہے میں تمہارا تعارف "نئی پارٹی" کی حیثیت سے کراؤں گا اور اُسے بتاؤں گا کہ ہم "مال" لے کر جس پارٹی کے لیے آئے تھے وہ لوگ "اٹ" (جہاں سمگلر آپس میں ملاپ کرکے "مال" کا تبادلہ کرتے ہیں) پہ نہیں آسکے اور اُسے بتاؤں گا کہ میں نے تم لوگوں کو راضی کر لیا ہے کہ "مال"

کا "معاملہ" کیسر سنگھ سے طے کر لیں۔ یہ لالچ دے کر ہم اُس کے پاس رات گزار لیں گے۔ تم یوں کرو کہ مجھے یہ افیون دے دو جو تمہارے پاس ہے یہی اُسے دکھا کر لالچ دوں گا اور کہہ دیں گے کہ باقی مال صبح "نا کے اٹھنے" کے بعد آدمی لے کر آئے گا۔ صبح ہم اُس کے بیدار ہونے سے پہلے نکل جائیں گے۔ میں اُسے ذرا زیادہ پلا دوں گا یوں بھی آج دیوالی کی رات ہے نا اس نے پہلے بھی پی رکھی ہو گی۔"

ایک لمحے کے لیے خان نے کچھ سوچا اور اپنے تھیلے سے افیم نکال کر اُسے تھما دی۔ اُس لمحے اس کے لیے سوا اس کے اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ نتھا سنگھ کی ہر ہاں میں ہاں ملائے اور بس۔

○

نتھا سنگھ کو گئے دس پندرہ منٹ ہونے کو آئے تھے اور خان کی نسیں سوچتے سوچتے پھٹنے لگی تھیں۔ وہ ابھی تک کسی فیصلے پر نہیں پہنچ سکا تھا۔

"—— بچے یہ جو گردن کے اُوپر کدو رکھا ہے نا، جو کچھ ہے بس اسی میں ہے اور اسی سے ہے! وہاں تمہارے لیے کوئی مجلس عاملہ نہیں ہو گی جس کے ساتھ مشورہ کر کے تم کسی نتیجے پر پہنچ سکو۔ بس تم ہو گے بچے!! اور اللہ کی ذات۔ کسی بھی نتیجے یا فیصلے پر فوراً پہنچنا ہو گا۔ اور یہ تب ہی ممکن ہے جب تمہارے اعصاب گھبرا کر جواب نہ دے جائیں۔ اپنی ذات پر اعتماد اور اللہ پر بھروسہ ہی تمہارے بہترین ہتھیار ہیں۔" بوڑھے صوبیدار میجر نے اُس کی راہنمائی کی۔

"ڈبل کراس" —— اُس نے بڑبڑاتے ہوئے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔

دوسرے ہی لمحے وہ بجلی کی سی پھرتی سے بُرجی عبور کر کے دوسری طرف پہنچ چکا تھا۔ گاؤں کے کھیتوں کی طرف جانے والے راستے پر جہاں سے ابھی نتھا سنگھ گزر کر گیا تھا وہ ہرن کی طرح قلانچیں بھرتا قریباً آدھ میل آگے نکل آیا تھا ——" اگر

وہ اکیلا آیا تو ٹھیک ہے.... ورنہ ....." اُس نے سوچا اور وہیں دُبک کر بیٹھ گیا۔

اُس کی مُراد جلد ہی بَر آئی۔ دُور سے آتے قدموں کی چاپ اُس کے حساس کانوں تک بآسانی پہنچ رہی تھی لیکن یہ کیا؛ قدم دو سے بہر حال زیادہ تھے۔

"نتھا سنگھ غدار! ڈبل کراس ——" اُس نے دانت پیسے۔

ابتدا ہی میں ناموافق حالات نے اُسے خوفزدہ کرنے کے بجائے اُس کی صلاحیتوں کو جلا بخشی تھی۔ پہلے تو اس نے چُپ چاپ یہاں سے نکل جانے کا سوچا لیکن پھر رُک گیا۔ وہ نتھا سنگھ کو معاف نہیں کر سکتا تھا۔

آنے والے تین تھے۔ دو نے رائفلیں اٹھا رکھی تھیں اُن کا تعلق بی۔ایس۔ایف (بارڈر سیکورٹی فورس) سے تھا۔ تینوں اونکار پوری کو "ترلوالہ" جان کر بڑے اطمینان سے چلے آ رہے تھے۔ دیوالی کی رات تھی اور آنے والے دونوں کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ پیئے ہوئے ہیں۔

نتھا سنگھ خان سے بمشکل پانچ چھ قدم دُور ہی رُک گیا۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے اپنے ہمراہیوں کو اُس مخصوص جگہ کی نشاندہی کروائی جہاں وہ اُن کے "شکار" کو بٹھا کر آیا تھا۔ دونوں نتھا سنگھ کے ہاتھ پر باری باری ہاتھ مار کر آگے نکل گئے۔ انہوں نے اپنی رائفلوں کو چھپا لیا تھا اور اب جنگی فارمیشن میں بڑی احتیاط سے گھاس کے سلسلے میں گھُس کر آگے بڑھ رہے تھے۔ شاید وہ چکر کاٹ کر اچانک ہی "پاکستانی جاسوس اونکار پوری" کے سر پر پہنچنا چاہتے تھے۔

اُن کے لمبی گھاس میں گھُستے ہی خان نے اپنی جگہ چھوڑ دی۔ اُس کی رگوں میں اب خون کے بجائے نفرت اور نتھا سنگھ سے انتقام کے شرارے تڑپنے لگے تھے۔ اپنے کندھے پر رکھے پرنے (چادر) کو اُس نے بَل دے کر رسّی کی شکل دے لی تھی اور بلی کی طرح بے آواز پنجوں پر چلتا نتھا سنگھ کے سر پر پہنچ گیا۔

نتھا سنگھ کو خبر تب ہوئی جب خان نے اُس کے گلے میں پیچھے سے رسّی ڈال کر اُسے پھانسی کے پھندے کی شکل دے دی تھی۔ نتھا سنگھ اچانک بوکھلا کر زمین پر گر پڑا تھا۔ اس سے پہلے کہ اُس کے مُنہ سے کوئی معمولی سی آواز بھی نکلتی۔ رسّی چھوڑ کر خان نے بجلی کی سی پھُرتی سے دونوں ہاتھوں سے اُس کی گردن کے گرد شکنجہ تان دیا۔

اُس کی تمام نفرت اور انتقام اُس کے ہاتھوں میں سمٹ آئے تھے۔ نتھا سنگھ کی آنکھیں پھیل کر پھٹنے کو آگئیں اور خان کی آنکھوں میں دہکتے انگارے اپنی انتہائی شدّت کو چھونے لگے تھے۔ نتھا سنگھ تڑپا، تلملایا لیکن اُس گرفت سے نجات اُن کے لیے ممکن نہ تھی جو آہنی شکنجے کی طرح اُس کا گلا دبا رہی تھی ——— وہ بے بس بکرے کی طرح ڈکراتا ہُوا بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

یہ سارا عمل بمشکل تین یا چار منٹ میں تکمیل کو پہنچ گیا تھا۔ خان نے اُس کی گردن میں گڑی انگلیاں باہر کھینچیں اور کھڑے ہو کر اُس کی پسلیوں میں ٹھوکر مار کر اپنی نفرت کو تسکین دی۔



چند سیکنڈ کے بعد ہی وہ اس قابل ہو چکا تھا کہ صورتِ حال کی سنگینی کا احساس کر سکے۔ نتھا سنگھ کی لاش اُس نے ٹانگوں سے پکڑ کر گھاس کے اندر ہی اور دُور تک اُسے گھسیٹتا چلا گیا۔ پھر اُس نے لاش کو وہیں پھینکا اور گھاس کے اندر ہی اندر سامنے والے گاؤں کی طرف تیزی سے پنجوں کے بل بھاگنے لگا۔

خان کی حالت اُس غضب ناک چیتے کی سی ہو چلی تھی جو ہانکا کرنے والوں کے گھیرے میں آ چکا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ بمشکل دس منٹ بعد ہی دونوں سرکاری اہلکاروں کو علم ہو جائے گا کہ "پاک سپائی" اُن کو جُل دے گیا ہے اور نتھا سنگھ کی لاش بھی وہ

اگلے دس پندرہ منٹ بعد ہی دریافت کر لیں گے۔ وہاں سے پکٹ تک پہنچنے میں انہیں مزید پندرہ بیس منٹ لگیں گے۔ اس کے بعد اس علاقے پر وہ لوگ شکاری کتّوں کی طرح اُس کی تلاش شروع کر دیں گے۔

اور صُبح تک موقعِ واردات سے کھوجی اُس کا "کھُرا" بھی اٹھا لیں گے۔

اُس نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ اپنے سے متعلق کوئی کلُو بھی وہ موقعہ واردات پر نہ رہنے دے تاکہ وہ لوگ کتّوں کو اس کی خوشبو سے آشنائی بہم پہنچا کر اُس کے پیچھے نہ لگا دیں۔

خان کو بوڑھے انسٹرکٹر کی وہ باتیں یاد آرہی تھیں جو دمِ رخصت اس نے کہی تھیں۔ اس نے عابد خان کو بتایا تھا "بچّے! یہ "لانچنگ پیڈ" جس سے ہم تمہیں کراس کروا رہے ہیں بہت محفوظ بھی ہے اور بہت خطرناک بھی۔ کبھی کبھی یہ "کوریئرز" (گائیڈ) ڈبل کراس بھی کر جاتے ہیں۔ ہم مکمل چھان بین کر کے ہی آدمی گانٹھتے ہیں لیکن یہ بات کبھی نہ بھولنا کہ جو شخص چند ہزار روپے کے لیے اپنے مُلک سے غداری پر آمادہ ہو جائے، وہ تمہیں بھی مزید چند ہزار روپے کی خاطر دھوکہ دے سکتا ہے۔ ہم پچھلے دو سال سے یہ لانچنگ پیڈ استعمال کر رہے ہیں اور کبھی کوئی "پارسل" "غلط" ایڈریس پر نہیں پہنچا ——— لیکن پچھلے تین چار ماہ سے اِدھر کچھ گڑبڑ ہو رہی ہے۔ ایک اُدھر کا کوریئر ڈبل کراس کر گیا تھا اور اُس نے ہمارا بہت پیارا ایجنٹ پکڑوا دیا ——— کچھ دن پہلے بھی ایسا ہی ایک واقعہ ہُوا تھا، اُدھر سے ایک ایجنٹ واپس آرہا تھا کہ ....." صوبیدار نے اپنی بات نامکمل چھوڑ دی تھی شاید اُسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اُسے یہ سب کچھ خان کو نہیں بتانا چاہیئے۔

"بچّے! اچھا سپائی حالات کے مثبت سے زیادہ منفی پہلو پر نظر رکھتا ہے۔ ہمیں گائیڈ پر شک نہیں کرنا چاہیئے، لیکن اپنی آنکھیں ہمیشہ کھُلی رکھنا۔"

اُسے خواہ مخواہ اپنے اِس باپ کی طرح شفیق انسٹرکٹر سے ایک عقیدت سی ہو چلی تھی جو اُس کے سامنے مختلف ایجنٹوں کے تجربات دہراتے ہوئے ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا۔ "بچے اِن لوگوں کی لائن، کبھی جوں کی توں نہ اپنانا، اس میں کوئی نہ کوئی جدّت ضرور پیدا کرنا۔ یاد رکھو اچھا جاسوس موقعے سے صرف فائدہ ہی نہیں اُٹھاتا بلکہ مواقعے بھی خود ہی پیدا کرتا ہے۔"

خان بڑا ہونہار شاگرد تھا اس کی ٹریننگ کے خاتمے پر جب اُس کے ڈائریکٹر جنرل صاحب اُس سے ملے تھے تو صوبیدار صاحب نے اُن کے سامنے مستعد ہوتے ہوئے کہا تھا۔ "سر! میرا دل گواہی دیتا ہے میرا یہ شاگرد مُلک وقوم اور اپنے اُستاد کا نام ضرور بلند کرے گا۔"

خان کو احساس تھا کہ اس کے انسٹرکٹر کو کتنا اعتماد ہے اُس پر۔ آج نتھا سنگھ کو اپنے ہاتھوں موت کے گھاٹ اُتار کر اُس نے اس اعتماد پر نہ صرف مہر تصدیق ثبت کر دی تھی بلکہ اُن دو ساتھیوں کی گرفتاری کا ایک طرح سے انتقام بھی لے لیا تھا۔

وہ گھاس کے اندر ہی اندر چلتا چلا جا رہا تھا۔ اپنی تربیت کے مطابق اب اُس کو "پہلی پلاننگ" ختم کر کے "دوسری سکیم پر عمل پیرا ہونا تھا جس کے مطابق اب اس کو "آر۔ وی" (جہاں جاسوس ملاپ کرتے ہیں) "لانچنگ سٹیشن" اور "سیف ہاؤس" کو بدلنا تھا ——— وہ سوچنے لگا:

مکسر کی بجائے اب اُس کی منزل بٹھنڈہ تھی۔

وہ جانتا تھا کہ ٹریننگ کے مطابق جب وقت پر وہ "آر۔ وی پوائنٹ" پر نہ ملا تو "مقامی دوست" جنہوں نے اُس سے "پی۔ ایم" (رابطہ) کرنا ہو گا اُسے دوسرے سٹیشن پر "ملاپ" کریں گے۔

صبح ہونے تک اس سرحدی قصبے کے چپے چپے پر بھارتی کاؤنٹر انٹیلی جنس

کا قبضہ ہونے والا تھا۔ وہ لوگ اُس کے لیے اس علاقے سے نکلنے کے تمام راستے مسدود کر سکتے تھے۔ خان سمجھتا تھا کہ بس سٹینڈ یا کوئی بھی ایسی جگہ جہاں سے کوئی بھی ذریعہ روانگی میسّر آ سکے "اُن لوگوں" کی کڑی نگرانی میں ہو گی۔

صبح ہونے تک اُسے بہرحال اس قصبے سے نکل جانا تھا۔ اور خان کو یہ تک علم نہیں تھا کہ وہ اِس وقت کہاں ہے۔ کون سے راستے پر چل رہا ہے؟ وہ راستہ "محفوظ" بھی ہے یا نہیں؟

○

نتھا سنگھ پچھلے سات آٹھ ماہ سے پاکستان انٹیلی جنس کے لیے خدمات انجام دے رہا تھا۔ سمگلنگ کا پیشہ اُسے وراثت میں منتقل ہُوا تھا۔ وہ بچہ تھا جب اُس نے پہلی مرتبہ اپنے "بابو" کے ساتھ غیر قانونی طور پر سرحد عبور کی تھی۔ پھر ایک روز اُس کا باپ بھی اس کے چاچا کی طرح "پُلس مقابلے" میں سرحد پر مارا گیا۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں سے بڑا تھا اس لیے اب کاروبار کی ساری ذمہ داری اُس کے کندھوں پر آ پڑی تھی۔

نتھا سنگھ نے پانچ سال تک جی جان سے کام کیا۔ اُس نے کبھی "ناکہ نہیں بھرا تھا"۔ وہ اپنے باپ کی طرح ہمیشہ بغیر ناکہ دیئے "اُٹے" لگایا کرتا تھا۔ ایک روز وہ قابو آ گیا۔ "رٹاف" کی مار کھانے کا اُس کا اوّلین تجربہ گو کہ بڑا جان لیوا تھا لیکن وہ "جوانوں" کی طرح اپنی جان پر پورا ریمانڈ جھیل گیا۔

چھوٹے بھائی کی بے وقت موت اور "دشمنی" نے اُسے مجبور کر دیا تھا کہ اب وہ بھی اس دھندے سے متعلق "کامیاب سمگلروں" کی طرح کوئی مضبوط سہارا تلاش کرے بچپن ہی سے وہ دیکھتا چلا آ رہا تھا۔ کہ بھارتی سیکورٹی کے افسران اُس کے خاندان کے ساتھ کتنا بُرا اور بہیمانہ سلوک کرتے آ رہے تھے۔ اُس کے لاشعور میں جو نفرت

اپنی سیکورٹی کے خلاف پیدا ہو چکی تھی وہ کبھی نہ نکل سکی۔

سرحد پار کے اُس کے دوست "گامے" نے اُس کا تعارف پاکستانی سیکورٹی کے ساتھ کروایا۔ اُن لوگوں کے "حسن سلوک" اور "کھلے بھاؤ" نے نتھا سنگھ کو اتنا متاثر کیا کہ وہ پہلی ہی ملاقات میں اُن کے لیے "خدمات" انجام دینے پر رضامند ہو گیا۔

پھر یہ کام اُس کے لیے تھا بھی کون سا مشکل۔

بس کسی ایجنٹ کو اُدھر سے اِدھر پہنچا دینا اور کبھی کسی کو اِدھر سے اُدھر لے جانا اور اس معمولی سے کام کے مقابلے میں اُسے کتنی مراعات حاصل تھیں۔ وہ کافی عرصہ تک بڑی ایمانداری سے اپنی ڈیوٹی انجام دیتا رہا۔

ایک روز جب وہ ابھی ایک ایجنٹ کو سرحد عبور کروانے کے بعد بس پر سوار کروا کر واپس ہی لوٹا تھا تو اُس کی حویلی کے سامنے بی۔ایس۔ایف کی دو جیپیں آکر رُک گئیں بمقامی پولیس کا عملہ بھی اُن کے ہمراہ تھا۔ اُن لوگوں نے بغیر وجہ بتائے اُسے گرفتار کر لیا۔ بات اگر مقامی تھانے تک ہی رہتی تو نتھا سنگھ اُسے آسانی سے سنبھال لیتا۔ لیکن اس مرتبہ وہ لوگ اُسے سیدھے "امرتسر انٹروگیشن سنٹر" لے گئے تھے۔

نتھا سنگھ نے کئی تفتیشیں کاٹی تھیں لیکن اس سنٹر میں ایک ہفتے کے ریمانڈ ہی نے اُسے توڑ کر رکھ دیا۔ وہ اپنے "صدق" پر آخری دم تک قائم رہتا لیکن اُس کے کیس انچارج ڈی۔ایس۔پی شرما نے ہارنا سیکھا ہی نہیں تھا۔ ریمانڈ ختم ہونے سے دو روز پیشتر ہی وہ لوگ اُس کی اکلوتی بہن کو لے آئے۔

جب زنجیروں میں بندھے نتھا سنگھ کے سامنے اس کی بہن کو نیم برہنہ حالت میں لایا گیا اور ڈی۔ایس۔پی نے ایک قطار میں لگے سٹاف کے مشٹنڈوں کی طرف اشارہ کر کے اُسے سنگین حالات پیش آنے کی وارننگ دی تو نتھا سنگھ کو یوں

لگا جیسے اُس کا سارا وجود مٹی ہو کر رہ گیا ہو۔

شرما نے بڑا اوچھا لیکن انتہائی بھرپور وار کیا تھا۔ اس کے پیچھے قطار میں کھڑے مشٹنڈے سپاہی جس طرح بھوکی اور کھا جانے والی نظروں سے اُس کی بہن جیتو کو گھور رہے تھے، وہ منظر نتھا سنگھ جیسے خاندانی بدمعاش کو پاگل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ اُس نے بارہ روز مسلسل دن رات مار کھائی — اور اپنے جُرم کا اقرار نہیں کیا تھا لیکن جیتو کو سامنے دیکھ کر دوسرے ہی منٹ میں وہ پگھل کر رہ گیا۔

"شرما! میں ہار گیا"۔ اُس نے ٹوٹتی اور ڈوبتی آواز سے ڈی۔ایس۔پی کو خطاب کیا "اپنے ان بھیڑیوں کو یہاں سے دفع کر دو! جیتو کو چھوڑ دو!! میں اقبال جرم کرتا ہوں"۔

شرما نے نتھا سنگھ کی ہار کو پرماتما کی طرف سے گفٹ جانتے ہوئے فوراً اپنے "ملازموں" کو وہاں سے "دفع" ہو جانے کے لیے کہا اور حوالدار کو حکم دیا کہ وہ نتھا سنگھ کو کھول کر اُس کے دفتر میں لے آئے۔

نتھا سنگھ دفتر میں پہنچا تو جیتو اس کے گلے لگ کر بلک بلک کر رو دی۔ اُس روز نتھا سنگھ کو شدت سے احساس ہوا کہ وہ صرف سمگلر اور بدمعاش ہی نہیں ایک بہن کا بھائی بھی ہے۔

"جیتو! کاش تو نے میری ماں کے بطن سے جنم نہ لیا ہوتا"۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا اور اپنی بہن کو خود سے الگ کر دیا۔

"شرما صاحب! پہلے جیتو کو یہاں سے نکلوا دو اور مجھے "گیتا" پر حلف دو کہ آئندہ کبھی ایسی "ذلیل حرکت" نہیں کرو گے۔ اس کے بعد میں اگلی بات کروں گا——"
اُس نے ڈی۔ایس۔پی کو مخاطب کیا۔

شرما نے چند لمحے کے لیے گردن جھکا کر کچھ سوچا۔ وہ نتھا سنگھ کی ناراضی کا خطرہ

اب مول نہیں لے سکتا تھا۔ اُسے اِس بات پر فخر تھا کہ جو کام بڑے بڑے جُغادری افسر نہ کر سکے، وہ "کارنامہ" اُس کے ہاتھوں انجام پا گیا ـــــ اُس نے نتھا سنگھ کو اقبالی کروا کر تمام پُرانے افسروں کا ریکارڈ توڑ دیا تھا۔

"ٹھیک ہے نتھا سیہاں!" اُس نے نتھا سنگھ کی آنکھوں میں جھانکا۔

انٹروگیشن سنٹر کے باہر والے مندر سے اُس نے "مقدس گیتا" منگوائی اور اِس پر ہاتھ رکھ کر حلف دیا کہ اگر نتھا سنگھ اُن لوگوں کی مرضی کے مطابق کام کرتا رہا تو وہ کبھی جیتو پر دوبارہ ہاتھ نہیں ڈالیں گے۔

جیتو کو نتھا سنگھ کے سامنے اُس کے ماموں کے ساتھ وہاں سے رخصت کر دیا گیا۔ اس ماموں کو بھی وہ لوگ جیتو کے ساتھ ہی باندھ لائے تھے۔ نتھا سنگھ کے لیے وہیں سگریٹ اور شراب منگوالی گئی اور وہ طوطے کی طرح بولنے لگا۔

○

تیسرے ہی روز اُس نے ایک "پاک سپاہی"، کو جس نے اپنا مشن مکمل ہونے پر اس کے ساتھ پار جانا تھا۔ بھارتی سکیورٹی کے ہاتھوں گرفتار کروا دیا۔ یہ کام اتنی چالاکی اور ہوشیاری سے کیا گیا کہ اُس پر کسی کو پاکستان میں شک ہی نہ ہو سکا۔

نتھا سنگھ کی ڈور اب بھارتی آرمی انٹیلی جنس کے ایک میجر کے ہاتھوں میں تھما دی گئی تھی۔ جس کی ہدایت پر وہ پاکستانی انٹیلی جنس کے لیے بظاہر اتنی ہی مستعدی اور جی جان سے کام کرتا۔ جس طرح وہ اب تک یہ خدمات انجام دیتا آیا تھا۔ اس دوران بڑی ہوشیاری سے اُس نے ایک اور "شکار" اُن لوگوں کے ہاتھوں پکڑوا دیا تھا۔

وہ اس طرح دوہرا فائدہ حاصل کر رہا تھا: پاکستان کی طرف سے تو اُسے اطمینان تھا ہی اب اپنی طرف بھی کوئی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا! اس علاقے میں دو ایجنٹوں

کی گرفتاری کی وجہ سے اُس "لانچنگ پیڈ" سے ایجنٹوں کو پار کروانے والے دوسرے گائیڈز کی طرح وہ بھی پاکستان انٹیلی جنس کی لسٹ میں "زیرِ نگرانی" آ گیا تھا۔ لیکن اُس کے "نئے استاد" بڑے کائیاں تھے انہوں نے نتھا سنگھ کو پاکستانی انٹیلی جنس کی نظروں میں کبھی مشکوک نہ ٹھہرنے دیا۔

○

اُونکار پوری اُس کا تیسرا شکار ہوتا لیکن وہ خود اُس کا شکار ہو چُکا تھا۔

اس مرتبہ پاکستان انٹیلی جنس نے بطورِ احتیاط اُسے پہلی پکٹوں سے ہٹ کر نئی پکٹ سے کراس کروایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ نتھا سنگھ کو وہاں اپنی شناخت کروانے کے بعد ہی مدد میسّر آئی تھی۔

جس پکٹ پر وہ "اطلاع" لے کر پہنچا تھا وہاں دیوالی کا تہوار اپنے پورے جوبن پر تھا۔ نزدیکی دیہات سے پکٹ والے "لڑکیاں" اور "شراب" لے آئے تھے۔ آج کی رات اُنہیں کوئی پوچھنے والا نہیں تھا۔ وہ لوگ شراب کے نشے میں دھت باری باری شباب کی رنگینیوں سے دل بہلا رہے تھے۔ جب نتھا سنگھ کباب میں ہڈی بن کر وہاں پہنچ گیا۔

پہلے تو انہوں نے اُسے خوب گالیوں سے نوازا اور اُسے باندھنے پر تُل گئے۔ لیکن جب نتھا سنگھ نے انہیں "کمپنی ہیڈ کوارٹر" سے رابطہ کرنے اور اُس علاقے میں سرگرمِ عمل آرمی انٹیلی جنس یونٹ کے میجر گپتا کا حوالہ دیا تو اُن کے ہوش ٹھکانے آئے۔

پکٹ پر موجود فیلڈ ٹیلیفون کے ذریعے اُس کی بات میجر گپتا سے کروائی گئی جس نے نتھا سنگھ کو "دیوالی کا تحفہ" اُونکار پوری کی شکل میں پیش کرنے پر اُس کا پیشگی شکریہ ادا کیا۔ اُس نے پوسٹ انچارج کو فون پر اپنی شناخت کروانے کے بعد حکم دیا تھا کہ اگر ان لوگوں نے کوئی کوتاہی کی تو وہ اُن سب کو معطل کر کے کوارٹر گارڈ لگوا دے گا۔

پکٹ انچارج کا دل پکٹ پر بنے واحد کمرے سے جہاں "جشن دیوالی" اپنے نقطۂ انتہا کو چھو رہا تھا، باہر آنے کو بالکل نہیں چاہتا تھا۔ جس نائک کے ذریعے انہوں نے لڑکیاں منگوائی تھیں اُس نے بھی پورا پورا حق نمک ادا کیا تھا۔

وہ خود کو راجہ اِندر سمجھتا ہُوا شباب کی رنگینیوں سے لُطف اندوز ہو رہا تھا جب اُس کا حوالدار ہانپتا ہوا بغیر کسی جھجک کے اُس حجلۂ عروسی میں گھُس آیا۔

"سَر! سَر! اُدھر پھُون پر کوئے میجر گپتا ہووے۔"

میجر گپتا کا نام ہی اُس کے ہوش ٹھکانے میں لانے کے لیے کافی تھا، وہ جھٹکے سے اُٹھا۔

"لیس سَر!" ــــــ اُس نے بمشکل اپنی آواز پر قابو پا کر کہا۔

"کہاں مرے ہُوئے تھے!" میجر گپتا دھاڑا۔

"س س سَر! پیٹرول بھیج رہا تھا ــــــ" اُس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

"میرا آدمی جیسا کہے ویسا ہی کرو۔ خبردار شکار ہاتھ سے نکلنے نہ پائے....." اُس نے فون پہ ہی پکٹ انچارج کو ہدایات اور احکامات جاری کیے۔

"حرامخور! گدھا....!" اُس نے فون نیچے رکھتے ہی میجر گپتا کو بے نقط سُنادیں۔

"حوالدار!" ــــــ اُس نے ایک طرف کھڑے حوالدار کو بُلایا۔ "دو جوان اُس کے ساتھ بھیج دو۔ خبردار کوئی گڑبڑ نہ ہونے پائے ــــــ سالوں نے آج ہی مرنا تھا۔ کمبخت دیوالی کی رات کو بھی چین نہیں لینے دیتے۔"

حوالدار کو حکم دے کر وہ بڑبڑاتا ہُوا اُسی کمرے میں گھُس گیا۔ جہاں سے تھوڑی دیر پہلے بادل نخواستہ اُسے اُٹھ کر باہر آنا پڑا تھا۔



حوالدار پر بڑی عجیب بپتا آن پڑی تھی: اُسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کس کس کو

...سنگھ کے ساتھ جانے کو تیار کرے۔ وہاں تو پکٹ کے مختلف کونوں کھدروں ...جوان "دیوالی" منا رہے تھے! کچھ دیوالی میں مصروف تھے اور باقی اپنی باری ...منتظر۔

تاہم کسی نہ کسی طرح اُس نے دو سپاہیوں کو تیار کیا اور نتھا سنگھ کے ساتھ بھیج ...دوبارہ دیوالی کی برکتوں سے لُطف اندوز ہونے لگا۔

دونوں سپاہی میجر گپتا کے نام سے بخوبی واقف تھے اور معاملے کی نزاکت ...بھی انہیں احساس تھا۔ لیکن نشے کا تھوڑا بہت اثر ابھی باقی تھا! نتھا سنگھ کو ...گپتا کا آدمی جان کر حوالدار نے روانگی سے پہلے دو چار پیگ چڑھا دیے تھے۔

دونوں سپاہی جب نتھا سنگھ کو پیچھے چھُپا کر اُس مخصوص بُرجی کے پاس پہنچے ...اُن "پاکستانی جاسوس" کے بجائے سفید قلعی کی ہوئی پتھر کی بُرجی اُن کا مُنہ چڑا ...رہی تھی۔

پہلے تو دونوں نے آنکھیں مل کر یقین کرنا چاہا کہ وہ کہیں ابھی تک نشے میں ...تو نہیں ہیں۔

"...نکل دے گیا سالا!" بالآخر ایک کو ہوش آیا۔

"...کیا مطلب؟" پہلا حیران تھا کہ یہ کس طرح ممکن ہے۔

"...نکل گیا۔"

"...ادھر اُدھر اطلاع کریں۔ ابھی دُور نہیں گیا ہوگا۔"

دونوں بڑی افراتفری میں واپس مُڑے۔ وہ سیدھے اُس جگہ پہنچے جہاں نتھا سنگھ ...کو چھوڑ گئے تھے۔ لیکن یہ کیا؟ ــــــ نتھا سنگھ بھی غائب!

"...وہ بھی گیا ــــــ" پہلے کے مُنہ سے اچانک ہی نکل گیا۔

"...کیا چکر ہے یار ــــــ دونوں ہی غائب!" دوسرے کو تو بالکل ہی سمجھ نہیں آ

”وہ ـــــ وہ اُسے بھی جاتے جاتے ـــــ گلا گھونٹ کر.....“

اُس کی بات نامکمل ہی تھی کہ میجر کی زبان بے دریغ چل پڑی۔ وہ جنونی کی طرح فون پر دھاڑتے ہوئے اُسے گالیاں دے رہا تھا۔

”میں..... میں تم سب کو شوٹ کر دوں گا۔ شوٹ کر دوں گا۔“ اُس کے منہ سے غصّے کی حالت میں کوئی ڈھنگ کی بات بھی نہیں نکل رہی تھی ـــــ ”فوراً علاقے کو گھیرے میں لے لو ـــــ سرحد کی طرف بھاگو ـــــ“ اُس نے پھر گالیوں کا سلسلہ وہیں سے جوڑ لیا۔ جہاں سے ٹوٹا تھا۔

فون کریڈل پر رکھ کر اُس نے کمپنی ہیڈ کوارٹر سے لائن ملائی اور ڈیوٹی پر موجود کمپنی کمانڈر کو جس کی آواز شراب کے نشے سے بوجھل ہو رہی تھی حکم دیا کہ ریزرو میں موجود تمام جوانوں کو سرحد کی طرف بھیج کر ناکہ بندی کرے۔

یہ بات تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ اتنے زبردست دلیرانہ اقدام کے بعد بھی یہ پاکستانی ایجنٹ بجائے واپس بھاگنے کے بھارت میں موجود رہے گا ـــــ وہ بالآخر آرمی انٹیلی جنس کا میجر تھا۔ اس امکان کو بھی اس نے نظر میں رکھا تھا اور احتیاطاً کچھ جوانوں کی ڈیوٹی اُدھر بھی لگا دی۔

خود بڑی تیزی سے جیپ چلاتا ہوا اپنے اردلی کے ساتھ ڈھولن وال کی طرف اُڑا چلا جا رہا تھا۔ بی۔ ایس۔ ایف کے کمپنی ہیڈ کوارٹر سے شراب کے نشے میں دھت سپاہی اور چھوٹے افسر میجر گپتا کو گالیاں دیتے بادلِ نخواستہ وردیاں پہن کر اپنی رائفلیں سنبھالے ٹرکوں اور جیپوں میں سوار ہو رہے تھے۔

میجر گپتا جب سے اس علاقے میں انٹیلی جنس ڈیوٹی پر آیا تھا۔ اُس نے اُن لوگوں کو نچا رکھا تھا ـــــ عام حالات میں بھی وہ اُن کی جان کو آیا رہتا تھا جبکہ آج تو ظالم نے انتہا کر دی تھی۔

اُس نے ”بے چارے ملازموں“ کی دیوالی کو بالکل بدمزہ کر دیا تھا۔

○

ڈاک بنگلے کی میز پر پھیلا نیلے رنگ کا نقشہ اِس کی آنکھوں کے سامنے پھیلتا چلا گیا۔

کرنل صاحب کی اُنگلی ”ڈھولن وال“ اور اُس کے گرداگرد مختلف مقامات پر لگے سُرخ دائروں پر یکے بعد دیگرے بجتی اور اُٹھتی چلی گئی۔ اس علاقے کے چپّے چپّے کو نقشے کی مدد سے انہوں نے خان کے ذہن میں نقش کر دیا تھا۔ لیکن رات کے اس عالم میں جب کوئی سمت کی بھی صحیح طور سے نشاندہی نہیں کر سکتا تھا وہ کوئی بھی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔

رات لُوٹ لُوٹ کر وقت کی گود میں گر رہی تھی۔ آسمان کُھلنے لگا تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے پھٹ کر تحلیل ہونے لگے تھے۔ تارے اب ایک ایک کر کے نمایاں ہو رہے تھے اور خان اپنے ٹریننگ کلاس روم میں پہنچ گیا۔

”یہ قطبین“ ہیں۔ دو ستارے! بس انہی سے رہنمائی حاصل کرنی ہے تم نے۔ صدیوں سے یہ راستہ دکھاتے آرہے ہیں قافلوں کو۔ اور یہ جو دُم دار سا ستارہ اِن قطبین کے نیچے نظر آرہا ہے نا۔ اِسے ہمیشہ اپنے بائیں کندھے پر رکھ کر اپنی سمت کا تعین کرنا۔ بائیں کندھے پر رکھو گے تو بھارت پہنچ جاؤ گے اور دائیں پر پاکستان۔“ آنکھوں پر موٹے شیشے کی عینک جمائے ایک ڈھلتی عمر کا پروفیسر اُس سے مخاطب تھا۔ اور خان کی نظریں اِس وقت آسمان میں اُس قطبین کو تلاش کر رہی تھیں۔

پھر اُسے یاد آگیا کہ قطبین تو رات دو بجے کے بعد نمودار ہوں گی۔ تب تک اُسے بہرحال ایک درست اندازہ قائم کر کے سفر اختیار کرنا تھا۔ اُس کا رُخ ڈھولن وال کی طرف تھا۔ وہ اگر چاہتا تو بآسانی نتھا سنگھ کو مار کر واپس پاکستان چلا جاتا اور اگلے روز

کسی دوسرے "لانچنگ پیڈ" سے اُسے سرحد عبور کروا دی جاتی۔ لیکن اُس کی عزت کو یہ واپسی گوارا نہ تھی۔

خان نے اس بات کا خاص خیال رکھا تھا کہ وہ ڈھولن وال سے مناسب فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے آگے نکل جائے! اُسے بتایا گیا تھا کہ اس کے بعد اُسے ایک نہر عبور کرنا ہو گی۔

اب جنگلی گھاس کا سلسلہ قریباً ختم ہو چکا تھا اور وہ کھیتوں اور اُن کے کنارے لگائے گئے درختوں کی آڑ میں کافی سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ "ناکہ" عموماً کسی جھاڑی کے نزدیک کسی درخت کے نیچے لگایا جاتا ہے، کیونکہ ناکہ لگانے والے بھی جانتے ہیں کہ اُن کا شکار اسی طرف آئے گا۔

گاؤں کے باہر نظر آتی روشنیاں مدھم پڑتے پڑتے اب ماند پڑ گئی تھیں شاید لوگ تھک ہار کر سو گئے تھے۔ یہ بات تو خان سمجھتا تھا کہ اگر اب کوئی اُن کے گھروں کے باہر ڈھول بھی پیٹنا شروع کر دے تو وہ لوگ جاگیں گے نہیں کیونکہ وہ شراب اور تھکاوٹ کے مشترکہ شکار ہو کر گھوڑے بیچ کر سو رہے تھے۔

اپنی جیب سے گھڑی نکال کر اُس نے وقت دیکھا رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ گاؤں کے گرد ایک لمبا چکر کاٹ کر وہ اپنی سمت اندازے سے صحیح رکھ کر چل رہا تھا۔ آباد علاقہ اب پیچھے رہ گیا تھا اس لیے خان نے اپنی رفتار بھی بڑھا دی تھی۔ اِس کی آنکھیں مکمل ہوشیاری کے ساتھ اندھیرے کے آر پار جھانک رہی تھیں ابھی وہ گاؤں سے بمشکل دو تین فرلانگ ہی دُور نکلا تھا جب اچانک ایک کوندا اُس سے بیس پچیس گز دُور لپکا۔ اُس کے ساتھ ہی اُس کے دائیں ہاتھ چالیس پچاس گز دُور ویسا ایک کوندا لپکا۔

"ملاپ" ـــــ اُس کے ذہن نے سرگوشی کی۔

رات کو گشتی پارٹیاں اِس طرح ایک دوسرے کو سگنل دے کر آپس میں ملاپ کرتی ہیں۔ کون ہو سکتے ہیں؟ سوچتا ہوا وہ فوراً اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ اور اکڑوں انداز میں اُس جھاڑی کی طرف سرکنے لگا۔ جہاں اُس کے چھپنے کے امکانات ہو سکتے تھے۔ اُس کے جھاڑی کے نزدیک پہنچنے تک ایسے مزید کئی کوندے لپکے تھے! خان نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہ جو کوئی بھی ہیں کسی باقاعدہ فوج کا حصّہ نہیں۔ پھر اُس نے سوچا اگر یہ بی۔ ایس۔ ایف نہیں تو کون ہیں؟" اتنے اناڑی مقامی "ہوم گارڈز" ہی ہو سکتے ہیں!" اُس کے ذہن نے فیصلہ کیا۔

اُس کے عندیہ کی تصدیق چند منٹ بعد ہی ہو گئی۔ جب اُس سے محض آٹھ دس گز دُور تین چار ہوم گارڈز اکٹھے ہو کر اُونچی اونچی آواز میں بولنے لگے۔ وہ سب پیئے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور ہر بات پر قہقہہ بھی ضرور لگاتے تھے۔

اُنہی کی زبانی خان کو یہ علم بھی ہو گیا کہ ایک پاکستانی خطرناک جاسوس بھی اِسی علاقے میں گھوم رہا ہے۔ اِن گارڈز کا تعلق نزدیکی دیہات سے تھا اور قریباً ایک گھنٹہ پہلے اُن کے گاؤں کے سرپنچ کو "پکّی ملٹری" (آرمی) والوں نے جگا کر یہ اطلاع دی تھی اور کہا تھا کہ وہ گاؤں میں موجود "ہوم گارڈز" کو اِس طرف پہرہ دینے کے لیے پھیلا دے۔

سرپنچ نے اُن کے سامنے "دہائی کا رونا" رویا لیکن آنے والوں نے بتایا کہ معاملہ اتنا سنگین ہے کہ انہیں با دلِ نخواستہ یہ حکم ماننا ہی پڑے گا۔ سرپنچ یا ہوم گارڈز کی کیا مجال تھی کہ وہ انکار کرتے۔ اُن بے چاروں کے ہاتھوں سے بوتلیں اور گلاس چھین لیے گئے اور اُن کی بجائے رائفلیں اور ٹارچیں دے کر انہیں اس طرف بھیج دیا گیا تھا۔

یہ چاروں ہوم گارڈز "پاک سپائی" اور بھارتی آرمی کو بے تحاشہ گالیاں بک

رہے تھے جنہوں نے مِل کر اُن کی دیوالی کا کباڑہ کیا تھا اور خان دِل ہی دِل میں خدا سے دعا کر رہا تھا کہ وہ جلدی یہاں سے ہٹیں تو وہ آگے نکلے۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ بھارت کے سرحدی علاقے میں رہنے والے نوجوانوں کو معمولی سی ٹریننگ دے کر اُنہیں سرکار کی طرف سے رائفلیں دے دی جاتی ہیں تاکہ وہ رات کو اپنے اپنے گاؤں کی نگرانی کر سکیں۔ اور دونوں اطراف کے ناپسندیدہ عناصر سے نمٹ سکیں۔ اس کام کا اُنہیں گو کہ معمولی ہی سہی معاوضہ باقاعدہ دیا جاتا ہے۔



پانچ سات منٹ بعد وہ وہاں سے ہٹ کر ٹولی کی شکل میں باتیں کرتے اُسی راستے کی طرف چل دیے جس سے گزر کر خان یہاں آیا تھا۔ میدان صاف ہوتے ہی وہ باہر نکل آیا۔ یہ بات کسی عام اعصاب رکھنے والے ایجنٹ کے لیے بجلی کے زبردست جھٹکے سے کم نہیں تھی کہ اُس کے فرار کی خبر اردگرد کے دیہات میں پھیل چکی ہے اور فوج اور عوام مِل کر اُس کے گرد گھیرا ڈال رہے ہیں۔ لیکن خان فولادی اعصاب کا مالک تھا۔

یوں ہی تو اُسے اس خطرناک کام کے لیے منتخب نہیں کیا گیا تھا۔

چوکنّے اور خونخوار چیتے کی طرح اُسے بہرصورت یہ "ہانکا" توڑ کر نکلنا تھا۔ اس مرتبہ اُس کی رفتار قدرے تیز تھی۔ اگلے آدھ گھنٹے بعد وہ نہر کے نزدیک پہنچ چکا تھا۔ نہر اُس سے بمشکل دس بارہ گز دُور تھی۔ اور خان اُس کو عبور کرنے کے امکانات کا جائزہ لے رہا تھا کہ دوسرے کنارے پر روشنی کا ایک اور ہالہ بلند ہوا۔

پہلے تو اس نے یہی قیاس کیا کہ یہ کسی مندر یا مکان پر کیے گئے چراغاں کی روشنیاں ہوں گی لیکن اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ روشنیاں متحرک ہو گئیں۔ تب اُسے اندازہ ہوا کہ نہر کے پرلی طرف جیپ گھوم رہی ہے۔ شاید وہ لوگ اُسی کے استقبال

کے لیے وہاں موجود تھے۔ نہر سے جیپ کا فاصلہ خاصا تھا۔ خان کو یاد آ گیا، صوبیدار صاحب نے بتایا تھا کہ نہر سے قریباً آدھ میل دُور ایک پکّی سڑک فوجی مقاصد کے لیے تعمیر کی جا رہی ہے۔ یہ جیپ شاید اسی سڑک پر رواں دواں تھی۔

اُسے فوراً ہی ایک فیصلے پر پہنچنا تھا اور خان جس فیصلے پر پہنچا اُسے عام حالات میں پاگل پن ہی سے تعبیر کیا جا سکتا تھا۔ لیکن اُن حالات میں اُسے بہرحال یہی دلیرانہ فیصلہ کرنا پڑا۔ خان جانتا تھا کہ یہ گھیرا اُس کے گرد اگرد پھیلتا چلا جائے گا۔ وہ اگر اس جال سے نکل سکتا تھا تو صرف رات کے اندھیرے میں، رات ہی اُس کا سائبان تھی۔ اگر یہ سائبان ہٹ جاتا اور وہ اُجالے کی گرفت میں پھنس جاتا تو وہ لوگ دن کی روشنی میں ایک ایک انچ زمین پر اُسے ڈھونڈنے نکل پڑتے اور اس کے بچ نکلنے کے امکانات بالکل ہی ختم ہو کر رہ جاتے۔

اُس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ صبح ہونے سے پہلے پہلے اپنے گرد پھیلے اس جال میں سے راستہ بنا کر نکل جائے گا اور اُس کی بہترین صورت یہ تھی کہ وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جائے۔ اس طرح غنیم بھی اپنا جال کھلا کرتا چلا جائے گا۔ اور بالآخر وہ کہیں سے بھی اس جال میں نقب لگا کر نکل سکے گا۔



اپنی جیب سے اُس نے پولی تھین پیپر کا تہہ کیا ہوا ایک تھیلا نکالا اپنے تمام کپڑے اُس میں بند کر کے اُس کے سرے کو مضبوطی سے گانٹھ لگا کر پیٹھ پر باندھ لیا۔ اسی تھیلے میں اُس کے لیے دوسری جوتی بھی رکھی تھی۔

اپنے پاؤں میں پہنے کینوس شوز اُس نے وہیں گڑھا کھود کر دبا دیے اور نہر میں اُتر گیا۔ نہر میں پانی بہت کم تھا۔ کہیں کہیں اُسے تیرنا پڑا۔ دوسرے کنارے پر پہنچ کر اُس نے کپڑے پہنے اور جوتی پاؤں میں ڈال کر وہ تھیلا بھی وہیں

ایک کھیت میں دبا دیا۔ اب وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا اُس سڑک کی طرف بڑھ رہا تھا جس سے تھوڑی دیر پہلے جیپ گزری تھی۔

سڑک تک وہ بغیر کسی رکاوٹ کے پہنچ گیا۔ پھر دھڑکتے دل لیکن مضبوط اور پُراعتماد قدموں سے اُس نے سڑک بھی عبور کر لی۔ اب اُس کے کانوں میں آہستہ آہستہ کہیں بہت دُور ہوتی "بھجن کتھا" کی آوازیں بھی آنے لگیں تھیں۔ پھر اُس کی نظریں آسمان کی سمت اٹھیں تو وہاں اُس کی راہبر "قطبین" بھی موجود تھیں۔ خان نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ابھی تک اُس نے راستے کی سمت نہیں کھوئی تھی ورنہ عموماً ہوتا یہی ہے کہ آدمی ساری رات کی بھاگ دوڑ کے بعد صبح یہی دیکھتا ہے کہ وہ جہاں سے چلا تھا وہیں کھڑا ہے۔

○

گھاس میں ہونے والی خلافِ معمول ہلچل اور بھاگ دوڑ کے اثرات سرحد کے دوسری طرف بھی محسوس کیے جا رہے تھے۔ "وائیٹ لائن" کے ساتھ ساتھ گشت کرنے والی پیٹرول پارٹیوں نے فوراً ہی یہ اطلاع اپنی اپنی "پکٹ" پر پہنچا دی تھی کہ بھارتی علاقے میں اچانک ہی بے تحاشا ریزرو فورس گھس آئی ہے۔ ایسا عموماً اُنہی حالات میں ہوتا تھا جب اُنہیں کسی "خطرناک پاکستانی" کی آمد یا واپسی کی خبر ملا کرتی تھی۔

رینجرز کے کمپنی ہیڈ کوارٹر کی طرف سے فوراً ہی ایک "ریکی پارٹی" کو اُس طرف روانہ کیا گیا۔ جس نے تھوڑی ہی دیر بعد تمام صورتحال سے آگاہی دے دی۔ اُن کی حاصل کردہ اطلاعات کے مطابق بی۔ ایس۔ ایف کے نزدیکی ہیڈ کوارٹر سے تمام ریزرو فورس کو اس طرف ناکہ بندی کے لیے بھیج دیا گیا ہے۔

رینجرز کے کمپنی ہیڈ کوارٹر کی طرف سے تمام پاکستانی پوسٹوں کو "سٹینڈ بائی"

آرڈر مِل گئے اور دن کی ڈیوٹی والے جوانوں نے بھی ایمرجنسی ڈیوٹی سنبھال لی۔ اس خبر پر سب سے زیادہ تشویش اُس پاکستانی پوسٹ کے پکٹ کمانڈر کو تھی جس کی پوسٹ سے خان اور نتھا سنگھ نے کراس کیا تھا۔

پوسٹ کمانڈر خود ہاتھ میں رائفل پکڑے سرحدی لکیر کے ساتھ ساتھ گشت کرتی پارٹیوں کی نگرانی کر رہا تھا۔ جب اُس کے حوالدار نے ایک سرحدی بُرجی کے پاس کھڑے ہوئے اُس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ مار کر اُسے خاص اشارہ کیا اس کے ساتھ ہی بجلی کی سی پھُرتی سے دونوں اُسی جگہ بیٹھ گئے۔ حوالدار نے جس سمت انگلی اٹھا رکھی تھی وہاں گھاس میں کسی کے بڑے احتیاط سے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

عموماً رات کے وقت جنگلی جانور بھی یہاں گھُسے رہتے تھے۔ لیکن اس بات کا اندازہ دونوں سپاہیوں نے کر لیا تھا کہ اتنی احتیاط سے سُور یا گیدڑ وغیرہ نہیں چلا کرتے یہ یقیناً کوئی آدم زاد ہی تھا ـــــ پکٹ کمانڈر نے ہاتھ کے مخصوص اشارے سے حوالدار کو وہاں سے ہٹ کر پوزیشن لینے کے لیے کہا۔

تھوڑی دیر بعد اُن کی سمت ٹارچ جل کر بجھی۔ جو اس بات کا اشارہ تھا کہ آنے والے "دوست" ہیں۔ لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ یہ دُشمن کی کوئی چال ہو اور انہیں دھوکہ دینے کے لیے ایسا کیا گیا ہو۔ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے حوالدار کو وہیں ہوشیار ہونے کو کہا۔ اور خود اپنا ریوالور ہاتھ میں پکڑے آنے والے کا منتظر ہو رہا۔

نوواردا اُسی بُرجی کے نزدیک آ رہا تھا ـــــ

جب وہ نمودار ہُوا تو چاند کی روشنی میں اُس نے رائفل سلنگ کے ساتھ کندھے سے لٹکا رکھی تھی اور دونوں ہاتھ اٹھائے ہوئے تھا پکٹ کمانڈر اچانک ہی اُٹھ کر اُس کے سامنے آگیا ـــ اُس کے ریوالور کی نالی نووارد کی طرف اُٹھی ہوئی تھی۔

"ہالٹ!" وہ للکارا۔

"فرینڈ!" جواب ملا۔

"پہچان"؟ پکٹ کمانڈر چوکنّا تھا۔ حوالدار نے نووارد کو نشانے پر لیا ہُوا تھا۔

جواب میں آنے والے نے "جُو کوڈ" دُہرایا۔ اُسے سُن کر پکٹ کمانڈر کا ریوالور والا ہاتھ جُھکتا چلا گیا۔ اُس نے نووارد کو جو بی۔ایس۔ایف کا کوئی حوالدار تھا اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور اُس کی راہنمائی کرتا ہُوا پکٹ کی طرف چل دیا۔

"غالباً آپ ہی پکٹ کمانڈر ہیں"؟ پکٹ پر پہنچ کر لالٹین کی روشنی میں پکٹ انچارج کو پہچان کر نووارد نے کہا۔

"تمہارے لیے چائے"......

"نہیں"— نووارد نے اُس کی بات کاٹ دی۔ "میں بڑی مشکل سے نکلا ہوں۔ اور اگر تھوڑی دیر تک واپس نہ گیا تو بات بگڑ جائے گی۔ آپ میرا رابطہ فوراً "جی سی ون" سے کروا دیں، فوراً"۔



کمپنی ہیڈکوارٹر کے ذریعے نووارد کا رابطہ فوراً انٹیلی جنس کے کرنل صاحب سے کروا دیا گیا۔ اپنی "پہچان" کروانے کے بعد "ذریعے" نے اُنہیں بتایا۔

"سَر نتھا سنگھ ڈبل کراس ہو گیا تھا۔ "پارسل" نے اُسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور خود نکل گیا ہے۔ اُس کی تلاش میں چاروں طرف "ریزرو" پھیل رہی ہے"۔ دوسری طرف سے استفسار پر اُس نے اپنی معلومات کی حد تک واقعات سے اُنہیں آگاہ کر دیا۔ "فون پکٹ کمانڈر کو دو"۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔

"یس سَر! شہباز خان از آن دی لائن سر!" پکٹ کمانڈر نے پھُرتی سے چونگا سنبھالا۔

"شہباز خان "دوست" کو احترام سے فوراً رخصت کر دو۔ خیال رہے معاملہ صرف تم

تک محدود ہے"۔ دوسری طرف سے حکم ملا۔

"یس سَر"۔ اُس نے کہا اور رابطہ کٹ گیا۔

شہباز خان نے زبردستی نووارد کو چائے پلائی اور خود اُسے بُرجی تک چھوڑنے آیا تھا۔ یہ معاملہ اُس تک اور اُس کے حوالدار تک ہی محدود رہا تھا۔

کرنل صاحب نے دوسری طرف طویل سانس لے کر فون آہستہ سے کریڈل پر رکھ دیا۔ اُن کے ساتھ صوبیدار لال محمد بھی کھڑا تھا۔ کرنل صاحب نے ایک نظر بوڑھے صوبیدار انسٹرکٹر کی طرف ڈالی۔

"ویل ڈن— صوبیدار صاحب! آپ کے پٹھے نے حق ادا کر دیا"۔ انہوں نے تعریفی نظروں سے بوڑھے صوبیدار کی تحسین کی۔

"تھینک یو سَر"۔ صوبیدار کا سینہ فخر سے تن گیا۔

کرنل صاحب نے اُسے تازہ صورتِ حال سے آگاہ کرنے کے بعد کچھ ہدایات دیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک "سپیشل میسج" بٹھنڈہ میں موجود "ڈنیٹ" کی طرف بھیجا جا رہا تھا۔ کیوں کہ اُونکار پوری کی آر وی اب بدل چکی تھی۔ وہ مطمئن تھے کہ اپنے سفر کے آغاز ہی پر اُن کے "ہونہار پٹھے" نے ایک "ڈبل کراس" کا صفایا کر دیا تھا اور کئی دوسرے اِس کے شر سے محفوظ ہو گئے تھے۔

اُن کا دِل گواہی دے رہا تھا کہ اُن کا "پٹھا" بھیڑیوں کے اِس ریوڑ کے قابو نہیں آسکے گا۔ اور بحفاظت "منزلِ مقصود" تک پہنچ جائے گا۔ وہ رات کرنل اور صوبیدار صاحب نے مصلّوں پر گزار دی۔ ساری رات وہ سجدے میں گرے عابد خان کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگتے رہے۔



خان نے پانچ چھ میل کا مزید فاصلہ طے کر لیا تھا جب اُسے ایک اور گاؤں سامنے

میں دکھائی پڑا۔ گاؤں کے مندر میں لگے لاؤڈ سپیکروں سے پورے شور کے ساتھ "بھجن کیرتن" کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا رات اِسی گاؤں میں گزار دے یا یہاں سے نکل جائے۔

بالآخر اُس نے لمبا چکر کاٹ کر آگے نکل جانے کی ٹھان لی۔ ابھی وہ گاؤں کی ایک سمت میں دو ڈھائی فرلانگ دُور ہی نکلا تھا جب اُسے کھیتوں کے سلسلے سے کچھ دُور گزرتی سڑک پر متحرک روشنیاں دکھائی پڑیں۔ ایسی ہی متحرک روشنی پھر بائیں طرف رینگتی محسوس ہوئی۔

"وہ گھیرے میں آگیا ہے کیا؟" خان نے سوچا۔

بات کچھ بھی تھی اب سیدھے آگے بڑھتے چلے جانا غلط تھا۔ اُس کی عقابی نظریں اُس ٹیلے کی طرف اُٹھ گئیں جو اُس سے کچھ دُور ایک ویرانے میں نظر آرہا تھا۔ شاید کسی کی "سمادھی" ہو۔ اُس نے سوچا کچھ بھی ہو۔ اُس کے لیے فی الوقت یہاں چھپنے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہیں تھا۔

خان کے قدم اُسی طرف اٹھنے لگے۔ قریب ہونے پر ٹیلے کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ یہ ایک کھنڈر کی شکل کا مندر تھا جس کو بڑ کے ایک گھنے درخت نے مکمل ڈھانپ رکھا تھا۔ بڑی بڑی جنگلی گھاس بھی چاروں طرف اُگی ہوئی تھی۔

خان نے یہ اُجاڑ مندر "غنیمت" جانا اور وہیں پناہ لینے چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ مندر کے ایک ٹوٹے پھوٹے حصّے کی طرف سے اُس کے اندر داخل ہو گیا لیکن اندر ہال کمرے میں مورتی دیکھ کر چونک پڑا۔ اُسے وہاں بھینی بھینی خوشبو اِس بات کا احساس دلانے کے لیے کافی تھی کہ یہ مندر اُجاڑ نہیں بلکہ آباد ہے۔ دبے پاؤں، محتاط اور چوکنا ہو کر وہ اندر داخل ہو گیا۔ قریباً پانچ منٹ تک اُس نے وہاں گھوم پھر کر اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ یہاں کوئی ذی روح سوا اُس کے موجود نہیں ہے۔

اب وہ مورتی کے پیچھے جس کا بھیانک جبڑا کسی کو بھی نگلنے کے لیے کھلا ہوا تھا کھڑا دیوار میں کھلی کھڑکی کے باہر اُس راستے پر جھانک رہا تھا جس سے وہ چل کر یہاں تک آیا تھا۔ اچانک ہی وہ چونکا ایک دِیا جلتا ہوا اُس کی طرف آرہا تھا۔ پھر اُس دیئے کے پس منظر میں ایک ہیولا بھی دکھائی پڑا۔ بجلی کی سی پھرتی سے بلّی کی طرح پنجوں پر بھاگتا وہ باہر آگیا۔ جلدی میں اُسے اور تو کچھ نہ سُوجھا وہ ہال کمرے میں بنی سیڑھیوں کے ذریعے جو اتنی شکستہ تھیں کہ کسی کے اُن پر سے گزر کر اوپر پہنچنے کے امکانات بالکل ہی ختم ہو چلے تھے۔ ہال کمرے کی چھت پر کسی نہ کسی طرح پھسلتا، سنبھلتا پہنچ گیا۔

چھت میں دیوی سے کچھ فاصلے پر پُرانی طرزِ تعمیر کے روشندان کے ذریعے جس میں سلاخیں لگی ہوئی تھیں اُس نے نیچے نظریں جما دیں: تھوڑی دیر بعد ایک لڑکی اندر پہنچ گئی! رات کی اس تنہائی اور اُجاڑ مندر میں وہ اُسے قرنوں پُرانی کوئی خوبصورت دیو داسی یا اُس کی بچھڑی ہوئی روح دکھائی دے رہی تھی۔

دیئے کو اُس نے دیوی کے چرنوں میں رکھ دیا۔ جب اُس کا مکمل چہرہ خان کو دیئے کی پُراسرار روشنی میں نظر آیا تو اِس کا دِل دھک سے رہ گیا۔

"عورت اتنی حسین بھی ہو سکتی ہے؟" اُس نے سوچا اور سوچتا ہی رہ گیا۔ اُسے یوں لگا جیسے کمرے میں ایستادہ بھیانک شکل والی کالی ماتا اچانک ہی خوبصورت پاربتی کے روپ میں پرگھٹ ہو گئی ہو۔

اگلا منظر تو عابد خان کو بوکھلا دینے کے لیے بہت کافی تھا۔ پاربتی دیوی نے ایک کر مورتی کو سیس نوائے، اُس کے چرن چھوئے اور دیوی کو ماتھا ٹیکنے کے بعد آلتی پالتی مار کر اُس کے چرنوں میں بیٹھ گئی۔

اُس کے لمبے سیاہ بالوں نے اُس کے کندھے اور کسی حد تک سینہ ڈھانپ رکھا

تھا اور وہ دونوں ہاتھ سینے پر باندھے، مُنہ ہی مُنہ میں کوئی منتر جاپ رہی تھی۔ خان کو اپنی رگوں میں لہو کھولتا محسوس ہو رہا تھا۔

اِس عذابناک ماحول سے اُسے نجات جیپ کے انجن کی اُس آواز نے دلائی جو اب بڑی واضح اس کے کانوں میں گھُس آئی تھی ـــــ آواز کی سمت اُس نے نظریں دوڑائیں اور اپنی جگہ منجمد ہو کر رہ گیا: مندر کے دونوں اطراف سے دو جیپیں اُس طرف آ رہی تھیں۔ جن کی ہیڈلائٹیں اُن لوگوں نے احتیاطاً بجھا رکھی تھیں۔ آہستہ آہستہ چلتی دونوں جیپیں مخالف سمتوں میں آ کر رُک گئیں۔

جال

"جال" ـــــ اُس کے لاشعور نے انگڑائی لی۔

خان کو یاد آ گیا: اُسے بتایا گیا تھا کہ "سرحدی مضافات میں قدم قدم پر بھارتی سکیورٹی نے ایسے ہی جال بچھا رکھے ہیں" ـــــ وہ لوگ بشری کمزوریوں پر کڑی نگاہ رکھتے تھے۔ اور اُن سے فائدہ اٹھانے کے فن سے بھی اُنہیں آگاہی میسر تھی۔

لیکن یہاں مقابلہ فولادی اعصاب رکھنے والے خان سے تھا! ایک لمحہ کے لیے وہ ٹھٹھکا ضرور تھا لیکن گھبرانا تو جیسے اُس کی سرشت میں داخل ہی نہیں تھا۔

اُس نے چند ثانیے رُک کر صورتِ حال کا جائزہ لیا:

جیپوں کی ہیڈلائٹس اچانک ہی روشن ہو گئی تھیں۔ گھُور اندھیرے میں چلنے والی یہ روشنیاں اتنی تیز تھیں کہ سامنے کا ماحول یک دم برہنہ ہو گیا۔

ـــــ چھت سے چمٹے خان کی آنکھیں بڑی تیزی سے چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ اُس نے دونوں جیپوں سے مسلح سرحدی محافظ نکل کر مندر کے چاروں طرف پھیلتے دیکھ لیے تھے۔

وہ لوگ پہلے سے طے شدہ کسی منصوبے کے مطابق اِس علاقے کو گھیر رہے تھے۔ شاید یہ اُن کی کوئی ریہرسل تھی جو اب حقیقت کا روپ دھارنے لگی تھی!

خان کے لیے سوا اس کے اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ یونہی چھت سے چپکا حالات

کی ستم ظریفی کا نظارہ کرتا رہے۔

وہ بے بس چوہے کی طرح اس جال میں پھنسنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن اُس کے گرد اگرد گھیرا اتنی شدت سے تنگ ہونے لگا کہ اب وہ واقعی مُقید ہو کر رہ گیا تھا۔

باہر کے ماحول کی سنگینی سے نجات حاصل کرنے کے لیے صرف ایک لمحے کو اُس نے دوبارہ چھت پر لگی سلاخوں میں سے نیچے نظر دوڑائی۔ ماحول کی یکسانیت میں کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔

جیپوں سے نکل کر بھاگتے بی۔ ایس۔ ایف کے جوانوں کی آوازیں اور اُن کے افسران کی ہدایات اُسے بڑی واضح سنائی دے رہی تھیں، لیکن لڑکی تو جیسے پتھر کی بنی ہوئی تھی اور اب تو خان کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہاں ایک کی بجائے دو پتھر کی مورتیاں دھری ہیں کیونکہ ایک ثانیے کو بھی لڑکی کے عالم استغراق میں فرق نہیں آیا تھا؛

وہ اِسی طرح دیوی کے سامنے آلتی پالتی مارے اور سینے پر دونوں ہاتھ باندھے مُنہ ہی مُنہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ خان کی تمام حسیات پوری طرح بیدار تھیں اور اس کا ذہن تو جیسے کبھی سویا ہی نہیں تھا۔

فی الوقت اس کے لیے یہیں چھت سے چپکے رہنے کے سوا کوئی اور راستہ نہیں تھا۔ اُس نے چھت پر لیٹے لیٹے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ ایک کونے میں اُسے ایک ٹوٹی ہوئی "ممٹی" کا احساس ہوا۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے سوچا کہ یہاں سے اُٹھ کر وہاں جا بیٹھے لیکن فوراً ہی اُس کے ذہن نے رہنمائی کی کہ اوپر آنے والے سب سے پہلے اِسی "ممٹی" کی طرف آئیں گے؛

اچانک ہی اِس کے ذہن نے پلٹا کھایا اور اُس کی آنکھیں چمک اٹھیں——

اُسے اپنی بیوقوفی پر غصّہ بھی آیا کہ اب تک اِس طرف اُس کا دھیان کیوں نہیں گیا۔

بوڑھے برگد کی بے شمار ٹہنیاں اُس سے تھوڑی ہی دُور مندر کی چھت پر پھیلتی چلی گئی تھیں۔ کسی میکانکی عمل کے تابع وہ بجلی کی سی پھُرتی سے اُٹھا اور بلّی کی طرح جھک کر پنجوں کے بل چلتا ہوا درخت کی شاخوں تک پہنچ گیا۔

یہ اُس کی خوش قسمتی کہ تھوڑی دیر پہلے تک فضا بالکل ساکت تھی لیکن اب پورب سے پچھم کی طرف ہوا نے رینگنا شروع کر دیا تھا اور درختوں کے پتّوں کی کھڑکھڑاہٹ اتنی واضح تھی کہ اِس کے ٹہنیوں پر چڑھنے کا احساس کسی کو دُور سے ہونا ممکن نہ تھا۔

عابد خان نے اپنا ہاتھ ٹہنی کی طرف بڑھا کر اُسے چھُوا تو جیسے ٹھنڈک کی ایک لہر سی اُس کے سارے وجود میں پھیلتی چلی گئی۔ زمین پر پنجوں کے بل بیٹھے بیٹھے اُس نے اپنے جسم کو ماہر بازی گروں کی طرح تولا اور دوسرے ہی لمحے وہ کسی بندر کی طرح اپنا جسم فضا میں تولتا ہُوا درخت کی ایک ٹہنی سے دوسری پر منتقل ہونے لگا تھا۔

بمشکل دو منٹ بعد ہی اُسے ایک جائے پناہ میسّر آگئی: درخت کی شاخوں میں وہ جس جگہ پہنچ چکا تھا۔ وہ حصّہ اتنا گھنا تھا کہ سورج کی روشنی بھی چھن کر اندر نہ آسکے۔ اُس نے خود کو فی الوقت یہیں چھپائے رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

درخت کی اِس شاخ سے لپٹے اُسے قریباً دو منٹ ہو چلے تھے لیکن ابھی تک کوئی شخص بھی مندر میں داخل نہیں ہُوا تھا! یہاں بیٹھے ہُوئے وہ اُن لوگوں کی باتیں تو نہیں سُن سکتا تھا لیکن اُن کی حرکات بخوبی نوٹ کر سکتا تھا: مندر کے گرد اگرد پھیلے چلے گئے کھنڈرات اور کھیتوں کے وسیع سلسلے میں اُس کو دُور دُور تک ٹارچوں کی روشنیاں جلتی بجھتی نظر آرہی تھیں —— آنے والے بڑی سرگرمی سے اُسے یہاں

کھوج رہے تھے۔

کچھ دیر بعد اس نے ایک سائے کو مندر کے دروازے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ یہاں سے اُسے اندر کا منظر نظر نہیں آسکتا تھا۔ دروازے میں داخلے کے بمشکل ایک منٹ بعد ہی وہی شخص بوکھلایا ہُوا باہر نکلا اس نے زور زور سے دو تین آدمیوں کو نام لے کر پکارا۔

جیپ سے بڑی افراتفری میں دو آدمی بھاگتے ہُوئے اِس طرف آئے۔ اُن لوگوں نے ابھی تک ہیڈ لائٹس روشن کر رکھی تھی۔ یہ اُن کی بوکھلاہٹ کی انتہا تھی اور خان درخت کی شاخوں میں چھپا اِس بوکھلاہٹ سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ لوگ تھوڑی دیر تو آپس میں بحث کرتے رہے پھر تینوں گھوم کر اس راستے پر آ گئے جس طرف سے ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں چھت کی طرف آتی تھیں۔

تینوں ایک دوسرے کے تعاقب میں سنبھل سنبھل کر سیڑھیوں پر قدم رکھتے اوپر آ گئے۔ پھر تینوں میں سے ایک نے ٹارچ روشن کر لی اور باقی دونوں نے پستول اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر خود کو مکمل مستعدی کی حالت میں رکھا ہوا تھا! ٹارچ والے نے چھت پر روشنی پھینکنا شروع کی اُس کے ساتھیوں کے ہاتھ میکانکی انداز میں روشنی کے تعاقب میں گھومتے چلے گئے لیکن وہاں تھا کیا جو اُنہیں نظر آتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ تینوں ہی مایوس ہو کر نیچے اُتر رہے تھے۔

اُن میں سے کسی ایک کا دھیان بھی درخت کی طرف نہیں گیا تھا! نیچے اُترنے کے بعد وہ تو فوراً ہی جیپوں کی طرف بھاگے جب کہ تیسرے نے مندر کے دروازے پر اُسی لڑکی کو کسی نام سے پکارا۔ لڑکی باہر آ گئی۔ اِس مرتبہ اُس نے اپنے بدن کو بڑے سلیقے سے ڈھانپ رکھا تھا اور بڑے باوقار انداز میں نپے تُلے قدم اٹھاتی جیپ کی طرف جا رہی تھی۔ اُس کے اطوار سے تو بظاہر یہی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ

وہ ان سب میں سینئر ترین آفیسر ہو سکتی تھی۔

پہلی جیپ بھی لڑکی اور اِس کے ساتھیوں کے سوار ہوتے ہی ہوا ہو گئی۔ دونوں جیپیں نزدیکی کچی سڑک کی طرف بھاگ رہی تھیں۔ سڑک کے کنارے آکر اُن لوگوں نے دو تین مرتبہ ہارن بجائے۔ رات کے سناٹے میں جیپوں کے ہارن بجانے کی آوازیں کسی دھماکے سے کم نہیں تھیں جس درخت پر خان بیٹھا تھا۔ اُس سے اچانک ہی کئی پرندے پھڑپھڑا کر اُڑے تھے۔ یہی صورتحال دوسرے درختوں پر بھی پیش آئی تھی۔

جیپوں کے ہارن دیتے ہی اُس کے سوار جو اُتر کر بڑی پھُرتی سے چاروں طرف پھیل گئے تھے اب اُتنی ہی پھُرتی اور تیزی سے واپس جیپوں کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ اُن کے سوار ہوتے ہی دونوں جیپیں پھر کچی سڑک پر دوڑنے لگیں اور جلد ہی خان کی نظروں سے اوجھل ہو گئیں۔

اُن لوگوں کی روانگی کے قریباً پانچ چھ منٹ بعد خان دوبارہ مندر کی چھت پر پہنچ چکا تھا۔ بھلے کچھ عرصے ہی کے لیے سہی وہ ہانکا کرنے والوں سے محفوظ ہو چکا تھا ـــــ لیکن بہت دیر تک نہیں! خان بخوبی جان سکتا تھا کہ مقامی ہوم گارڈز سے تو اس کی جان چھٹتے چھٹتے ہی چھوٹ سکتی تھی۔ اِن لوگوں نے میلوں تک اس علاقے کو گھیرے میں لے رکھا تھا۔ اور اِس مندر جیسے ابھی اور نجانے کتنے جال اس کے راستے میں بچھے ہُوئے تھے۔

مندر کی چھت پر پہنچ کر اُس نے ایک لمحے کے لیے اپنی حالت پر نظر ڈالی اور پھر وہ صورتحال کے متعلق سوچ کر مُسکرا دیا ـــــ اُسے بجائے خوف کے دشمن کی حالت پر رحم آ رہا تھا۔ جو شکاری کتوں کی طرح اُس کو کھوج رہا تھا اور وہ اُن کے

ہاتھوں میں آکر پھنس گیا۔

حالات کی سنگینی پر غور کرتے ہوئے اُس نے ایک مرتبہ پھر خود سے عہد کیا، کہ وہ پکے پھل کی طرح دشمن کی جھولی میں گرنے کی بجائے مر جانے کو فوقیت دے گا۔

مندر کی چھت پر کھڑے کھڑے اس نے آسمان کی طرف نظریں دوڑائیں: حدِ نظر تک اُسے ایک ستارہ بھی آسمان پر چمکتا دکھائی نہ دیا —— چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں جنہوں نے سرِ شام ہی آسمان پر نمودار ہونا شروع کر دیا تھا اب ایک تسلسل سے اکٹھی ہو کر پھر بادل کی شکل اختیار کرنے لگی تھیں۔

ہوا کی شدت میں آہستہ آہستہ اضافہ ہو رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اُسے ہوا میں خنکی بڑھنے کا احساس ہُوا جو اس بات پر دلالت کر رہا تھا کہ دور کہیں بارش ہو رہی ہے۔

اُس کے عزمِ مستقل اور ارادے کی پختگی پر شاید قدرت بھی اُسے کسی انعام سے نوازنا چاہتی تھی۔ وہی ہوا —— جیسے ہی وہ مندر کی سیڑھیاں اُتر کر نیچے آیا۔ ٹپ ٹپ کرتی بارش کی بوندیں اِس کے استقبال کو لپکیں۔ بے اختیار اُس کے دل میں احساسِ تشکر جاگا۔ وہ اِس نعمتِ خداوندی پر جھوم ہی تو اُٹھا۔ مندر میں رک کر ایک لمحہ بھی ضائع کرنے کی بجائے اُس نے رختِ سفر باندھا۔

اپنے زیرِ جامہ کی ایک محفوظ جیب سے پیراسوٹ برساتی نکال کر اُس نے برساتی کی تہیں کھولیں اور پہن لی۔ آسمان پر سیاہ گھٹائیں چھانے کی وجہ سے اُس طرف سے کسی بھی راہنمائی کی توقع عبث تھی۔ صحیح سمت متعین کر کے وہ بے دھڑک اُسی طرف چل دیا۔

○

پچھلے تین چار گھنٹوں کی مسلسل بھاگ دوڑ نے اُسے ذرّہ بھر بھی ت

کیا تھا۔ اُس کے قدم اُسی مضبوطی اور اطمینان سے اُٹھ رہے تھے جس طرح اِس مہم کے آغاز میں اُٹھے تھے۔ بارش میں بھیگ کر وہ خاصا سکون محسوس کرنے لگا تھا۔

شفق پر اب پَو پھوٹنے لگی تھی اور آسمان پر گہرے بادل چھا جانے کے باوجود ایک سرخ لکیر اُسے دُور مشرق میں پھیلتی نظر آ رہی تھی۔ اس لکیر نے ماحول پر اپنی گرفت آہستہ آہستہ مضبوط کرنا شروع کر دی تھی اور آسمان جو اُس سے پہلے بالکل سیاہ ہو رہا تھا۔ اب قدرے گلابی نظر آنے لگا تھا۔

صبح کی آمد آمد تھی اور اُسے ابھی ایک لمبی مسافت پاٹنا تھی۔ اس مرتبہ اُس نے بظاہر تمام احتیاطیں بالائے طاق رکھ کر کچی سڑک کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کر دیا تھا۔ خان کو اندازہ تھا کہ اِس سڑک کا خاتمہ اُسے اِس قصبے سے باہر پکی سڑک تک لے جائے گا جس کے بعد اُس کے لیے قدرے سہولت ہو گی۔

بارش کی رفتار کے ساتھ ساتھ اُس کے قدموں میں بھی تیزی آتی جا رہی تھی۔ ہوا کی شدت میں بھی اب بارش کے ساتھ ساتھ اضافہ ہونے لگا تھا اور ہوا کے [illegible] ہوئے تھپیڑے اِس کے جسم پر بوچھاڑ کی طرح برس رہے تھے۔ اپنی سمت صحیح رکھنے کے لیے وہ اب تک تین چار مرتبہ رک کر اندازہ کر چکا تھا۔

○

کچی سڑک کا خاتمہ بالآخر حسبِ توقع ایک پکے راستے پر ہُوا۔ بارش کی شدت میں اب خاصی کمی آ گئی تھی۔

تیز ہوا بادلوں کو اُڑا کر دُور لیے جا رہی تھی! ابھی تک دُور دُور تک اُسے کسی ذی ہوش کا نام و نشان نظر نہیں آیا تھا۔ ممکن ہے نزدیکی آبادی کے لوگ بیدار ہو چکے ہوں۔ لیکن کسی نے ابھی تک گھر سے نکلنے کی ہمّت نہیں کی تھی۔

رات بھر کی مسلسل بھاگ دوڑ کے اثرات اب اس کے جسم نے قبول کرنے

شروع کر دیے تھے۔ بارش کی وہ مسلسل بوچھاڑیں جو اس کے بدن پر برسی تھیں۔ انہوں نے اب اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا تھا۔ اُس کے جسم میں آہستہ آہستہ درد جاگنے لگا تھا۔ اُس کے ساتھ ہی اُسے بخار کا احساس ہُوا، لیکن اُس نے اس سب کچھ پر قابو پانا تھا جس کے لیے ذہن کی بیداری ضروری تھی۔

صبح کی آمد نزدیک دیکھ کر اُس نے قریبی درختوں کے جھنڈ کا رُخ کیا۔ اپنی کمر سے بندھے کینوس کے تھیلے کو کھول کر اس نے مقامی دیہاتوں میں عام طور پر پہنا جانے والا کھلے پائنچوں کا لکیردار پاجامہ اور کُرتا نکال لیا۔ اپنے جسم سے چپکے گیلے کپڑے بھی اُس نے الگ کر دیے۔

اِس مختصر سے تھیلے سے مقامی موچیوں کی بنی ہوئی دیہاتی طرز کی ایک جوتی بھی برآمد ہوئی تھی! اپنے گیلے کپڑے اُس نے اُسی تھیلے میں ٹھونس دیے خشک کپڑے پہنے اور تھیلے کو قریبی کھیت کی مٹی میں دبا دیا۔ فی الوقت تو یہی اُس کا مکمل اسباب تھا۔

قریبی مندر کے لاؤڈ سپیکر اچانک ہی جاگے اور چنگھاڑنے لگے تھے کوئی ڈوبتی عمر کا پروہت اُلٹے سیدھے اشلوک بڑی تیزی سے پڑھ رہا تھا بالکل ایسے ہی جیسے یہ اس کے لیے کوئی معمول کی کارروائی تھی جسے بہرحال اُسی کے ہاتھوں انجام پانا تھا۔

مندر کے پس منظر میں نظر آتے دیہاتی گھروں کی روشنیاں بھی اب جلنے لگی تھیں۔ وہ جس علاقے میں پہنچ چکا تھا وہاں بجلی موجود تھی۔ یوں تو اب وہ کم از کم سر پر پھیلے سیکورٹی کے وسیع جال کو توڑنے میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن اب بھی وہ اتنا ہی غیر محفوظ تھا جتنا کہ اِس مہم کے آغاز پر۔

عابد خان کو علم تھا کہ بھارتی سیکورٹی کا جال تہہ در تہہ پھیلتا چلا گیا ہے اور...

کئی تانے بانے ابھی اِس کے راستے میں بکھرے پڑے ہیں۔'

گاؤں کی جلتی روشنیاں اِس بات پر دلالت کر رہی تھیں کہ زندگی اب یہاں بیدار ہونے لگی ہے۔ خان نے ہوشیار اور چوکنے چیتے کی طرح اپنی نظریں چاروں طرف دوڑائیں۔ اُس کی پُشت پر اور دائیں بائیں بھی حدِ نگاہ تک کھیتوں کے وسیع سلسلے پھیلتے چلے گئے تھے۔ کہیں کہیں ہریالی کے بیچوں بیچ کچے مکانات کا سلسلہ بھی سر اُٹھاتا دکھائی پڑتا تھا۔

سورج نے اب مشرق کی سمت سے اپنی لہو رنگ روشنیاں آسمان پر بکھیرنا شروع کر دی تھیں اور سُرخ دہکتے الاؤ کا ایک ہالہ حدِ نگاہ تک پھیلنے لگا تھا۔ چند لمحے اُس جانب ٹکٹکی لگا کر خان نے کچھ سوچا پھر ایک فیصلے پر پہنچ کر مطمئن ہو رہا۔ ابھی تک سورج نے اپنا چہرہ باہر نہیں نکالا تھا۔ شاید اِس نوجوان کے عزم کے سامنے اُسے سر اٹھانے کی جرأت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

خان نے کچھ وقت گزار کر کم از کم دوپہر کے بعد وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کیا تھا اور اب اُسے دوپہر تک کا یہ وقت بہرحال یہاں گزارنا تھا۔ پہلے اُس نے یہی سوچا کہ کھیتوں کے سلسلے ہی میں چھُپ کر بیٹھ رہے لیکن اب وہ اپنی ظاہری حالت بگاڑنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا کیونکہ بہرحال یہ دن کا وقت تھا اور وہ کسی کی بھی نظروں میں آسکتا تھا۔

اُس نے چاہا صبح دس بجے تک کا وقت کم از کم مندر کے اِردگرد گزارے جہاں اکثر لوگوں کا آنا جانا لگا رہے گا اور اُس کی طرف شاید ہی کوئی متوجہ ہوتا! اُسے اندازہ تھا کہ ابھی تک تو مندر میں سوائے پروہت اور دو تین پنڈتوں کے اور کوئی نہیں پہنچا ہوگا۔ وہ مندر میں بھی اُس وقت داخل ہونا چاہتا تھا جب وہاں خاصے لوگ آ چکے ہوں۔

یہی کچھ سوچتا خان وہاں سے ہٹ کر درختوں کے اُس سلسلے کی طرف چل دیا جو گاؤں سے مندر کو جانے والے راستے پر اُسے نظر آرہا تھا یہاں اُسے تھوڑی دیر تک چھپنے کے لیے بہرحال جگہ میسّر تھی۔

سورج نے اب اپنا چہرہ خاصا نمایاں کر لیا تھا۔ گیلی زمین پر اُس کی روشنیاں بڑے تسلسل سے آہستہ آہستہ پھیلنے لگی تھیں اور گاؤں سے مندر کی طرف جانے راستے پر اب خاصی آمدورفت شروع ہو چکی تھی خان کو یہاں کھڑے کھڑے اب اپنی ٹانگوں میں بڑا واضح درد محسوس ہونے لگا تھا۔ شاید بخار نے اپنا زور دکھایا تھا۔ اُسے اور تو کچھ نہ سوجھا۔ اپنے زیرِ جامہ میں ہاتھ ڈال کر اُس نے لپٹی تھی(?) کا ایک چھوٹا سا لفافہ نکالا اور اس میں رکھی دونوں گولیاں بغیر پانی کے ایک کے بعد دوسری نگل گیا۔ اُسے اب کم از کم اتنا اطمینان ضرور تھا کہ تین چار گھنٹے درد کی اذیّت سے نجات مل رہے گی۔

گولیاں نگلتے ہوئے اُس کے حلق میں خراش سی پڑ گئی تھی لیکن کسی نہ کسی طرح اس نے گولیاں زہر مار کر ہی لیں۔ درخت سے ٹیک لگا کر اُس نے دو تین لمبے لمبے سانس لیے جیسے فضا میں موجود ساری ہی مقناطیسیّت اپنے اندر سمو لینا چاہتا تھا۔ جادو اثر گولیوں نے معدے میں اُترتے ہی اپنا کام دکھانا شروع کر دیا تھا اور دو تین منٹ بعد وہ اپنے اندر ہونے والی ٹوٹ پھوٹ سے قدرے نجات پا چکا تھا۔

○

مندر کی طرف اب لوگوں کی آمدورفت خاصی بڑھ گئی تھی۔ سامنے کا سارا ماحول ہی اب سورج کی روشنی میں نمایاں ہونے لگا تھا۔ رات کی شدید بارش سے دُھلے ہوئے درخت اور سبزہ آنکھوں کو بہت بھلا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک تازگی اور

تراوٹ سی اُسے اپنے اندر اُترتی محسوس ہوئی۔ ایک مرتبہ پھر دو تین گہری سانسیں بھر کر وہ درختوں کے جھنڈ سے باہر نکل آیا۔ اب اُس کا رُخ بھی مندر کی طرف تھا۔

اپنے دونوں بازو فضا میں پھیلا کر اُس نے زوردار انگڑائی لی اور بدن میں موجود توانائیوں سے مطمئن ہو کر نپے تُلے قدموں سے مندر کی طرف چل دیا۔ مندر کے لاؤڈ سپیکروں کے شور میں اب گوردواروں کا بے ہنگم ساز بھی شامل ہو گیا تھا شاید یہاں ہندو آبادی سکھوں سے کم تھی اسی لیے نزدیکی تین چار دیہاتوں کے لوگ اس مندر میں آتے تھے۔

لاؤڈ سپیکر اتنی زور زور سے چلّا رہے تھے کہ اُسے کسی کی کوئی بات سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ گاؤں کی طرف سے آنے والے راستے کا ایک موڑ مُڑتے ہوئے اچانک ہی اُس کی نظر اُن دو گنجے سر والے ہندوؤں پر پڑی تھی جنہوں نے اپنی دھوتیاں ایک مخصوص انداز میں اُوپر کو چڑھا رکھی تھیں، ہاتھوں میں پیتل کی گڑویاں پکڑے وہ دونوں کھیتوں کی سمت جا رہے تھے۔ ماتھے پر لگی چاک کی تین لکیروں نے دونوں کے چہروں پر برستی لعنت میں قدرے اضافہ کر دیا تھا۔ دونوں ہی منہ میں کچھ انٹ شنٹ جاپ کرتے ایک دوسرے کے تعاقب میں چلے آرہے تھے۔

خان پر نظریں پڑتے ہی وہ ایک لمحے کے لیے ٹھٹھکے شاید نئے چہرے نے انہیں متجسّس کر دیا تھا اس سے پہلے کہ اُن کے کُھلے منہ کے دھانے کوئی زہر اُگلتے، خان کے ہاتھ بے اختیار سینے کی طرف اُٹھے اور اُس نے ہاتھ باندھ کر ہٹے درباری قسم کے ہندوؤں کے سے انداز میں اُنہیں "رام رام" کہہ دیا۔

"رام۔ رام"۔۔۔ دونوں کے منہ سے بادلِ نخواستہ نکلا۔

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ پوچھیں خان "جے بھوانی" "جے بھوانی" "جے بھوانی" کی دھائی دیتا تیزی سے اُن کے نزدیک سے آگے گزر گیا۔

دونوں بونقوں کی طرح اُسے منہ اٹھائے دیکھتے رہے۔ جب اُس نے پلٹ کر بھی اُن کی طرف نہ دیکھا تو وہی انٹ شنٹ الاپتے وہ دوبارہ اپنی منزل کی طرف چل دیے۔

مندر کے باہر ہی اُسے خاصے لوگ نظر آنا شروع ہو گئے تھے۔ اندر "بھجن کتھا" اپنے عروج پر تھی۔ ہارمونیم، ڈھولک اور چھینوں کے ساتھ کورس کی شکل میں مل کر گانے والوں کی عجیب وغریب اور بے سُری آوازوں نے ایک حشر برپا کیا ہوا تھا۔ خان کو یہاں آکر دوبارہ خوامخواہ اپنے سَر میں درد محسوس ہونے لگا تھا۔

اُس نے دوسرے لوگوں کی دیکھا دیکھی اپنے جوتے اُتار کر ایک طرف رکھ دیے! دو تین سیڑھیاں چڑھنے کے بعد مندر کی عمارت آگئی تھی۔ مندر خاصا پرانا اور شکستہ حال دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے ایک کونے میں لٹکتی گھنٹیوں میں سے ایک گھنٹی کو زور زور سے بجا کر پھر "جے بھوانی" پکارا اور آگے بڑھ گیا۔ اچانک ہی اندر پھیلی "دھوپ" اور "اگر بتیوں" کی خوشبو کا بھبھوکا اُس کی ناک میں گھس آیا۔

سامنے ہال نما کمرہ عورتوں اور مردوں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک کونے میں "بھجن کتھا" کرنے والے اپنا گلا پھاڑ رہے تھے اور دوسرے کونے میں ایک پروہت دیوی کے سرہانے بیٹھا عبادت کو آنے والوں سے کچھ نہ کچھ اینٹھنے کے چکر میں نظر آرہا تھا۔

مندر کے نزدیک پہنچنے سے پہلے عابد خان نے اپنے ڈھیلے ڈھالے کُرتے کی ایک جیب میں زیرِ جامہ سے سوا روپیہ نکال کر الگ رکھ لیا تھا۔

اس نے بڑے پرانے برہمنوں کی طرح کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھتے ہوئے سر کو جھکایا۔ پھر گھٹنوں کے بل جُھک کر سامنے رکھی مورتی کے قدموں میں سوا روپیہ رکھ کر دوبارہ ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔

پجاری نے اپنے سامنے دھرے تھال میں انگلی لگائی اور منہ سے کچھ الاپتے ہوئے اُس کے ماتھے پر تلک جما دیا۔ خان نے دوبارہ دیوی کے چرن چھوئے اور اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ پانچ چھ قدم وہ انہی اُلٹے پاؤں پر چلا تھا پھر اُس نے چاہا کہ اپنا رُخ بھجن کتھا کرنے والوں کی طرف موڑے۔

جیسے ہی اُس نے گردن گھمائی اچانک ایک برقی رو اِس کے سارے بدن میں دوڑ گئی، اُس کی نظر میں ایک کونے میں کھڑی اُس دیوی پر جا پڑی جسے اُس نے آج رات ہی اُس "پُراسرار مندر" میں دیکھا تھا لیکن یہاں وہ رات کی نسبت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اُس نے بڑے سلیقے سے دوپٹہ اپنے سر پر سجا رکھا تھا اور مخصوص طرح کے مذہبی براہمن گھرانوں کی کوئی انتہائی کم عمر لیکن بڑی ہی مُدبّر لڑکی دکھائی دے رہی تھی۔

اُس لمحے خان کے لیے باعث تسکین صرف یہی بات تھی کہ اس لڑکی نے رات اُسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے گڑبڑایا ضرور تھا لیکن فولادی اعصاب کے مالک خان نے دوسرے ہی لمحے خود کو مکمل نارمل کر لیا۔

دشمن کا جال پھیلتا جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ لوگ خان کو ہر قیمت پر گرفتار کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اُسے یہ خوش فہمی تو کبھی رہی نہیں تھی کہ جس مندر میں وہ جا رہا ہے وہاں اُس کے استقبال کے لیے کوئی موجود نہیں ہو گا لیکن یہ بات تو اُس کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ یہاں پھر وہی رات والی دیوداسی اُس کی منتظر ہو گی۔

رات درختوں کی شاخوں میں چھپے ہوئے خان نے اُس کی باوقار چال سے اس بات کا اندازہ بھی بخوبی لگا لیا تھا کہ یہ انٹیلی جنس کی کوئی بڑی افسر ہے۔ لڑکی کے چہرے پر پھیلی آنکھوں میں نجانے ایسا کیا سحر چھپا تھا کہ خان کو اِس کے

چہرے سے نگاہیں ہٹانے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔



جانے کیا جادو تھا ان آنکھوں میں ــــ!!

بدقت تمام اُس نے اپنی توجہ دوسری طرف مرکوز کی اور قریب ہی ایک کونے میں تھوڑی سی جگہ خالی دیکھ کر وہیں بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ کتھا کرنے والوں کی آوازوں کے ساتھ آواز ملا کر گا رہا تھا۔ اِس دوران کن اکھیوں سے دو تین مرتبہ لڑکی کی طرف بھی دیکھ چکا تھا جو حاضرین کی موجودگی سے بالکل بے نیاز ایک کونے میں بیٹھی بھجن کتھا میں مستغرق تھی۔

ایک مرتبہ جب خان نے چوری چھپے اُس کی طرف دیکھنا چاہا تو اچانک ہی دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرا گئیں۔ فوراً ہی اُس نے اپنی نظر دوسری طرف پھیر لی تھی۔ لیکن اِس دوران شاید لڑکی نے اُس کی چوری پکڑ لی تھی اِس لیے جب خان نے دوبارہ کن اکھیوں سے اُسے دیکھنا چاہا تو لڑکی پہلے سے اُس کی طرف متوجہ تھی۔ جیسے ہی خان کی نظریں اُس سے ٹکرائیں وہ مسکرا دی۔ خان جھینپ سا گیا لیکن لڑکی کی بے باکی میں کوئی فرق نہ پڑا۔

وہ کتھا کی طرف متوجہ ہو گیا۔

دوبارہ اُس نے گو کہ لڑکی کی طرف چوری چھپے بھی دیکھنے کی ہمت نہیں کی تھی لیکن وہ محسوس کر سکتا تھا کہ لڑکی اب بھی اُسی کی طرف متوجہ تھی! عبادت کو آنے والے اب واپس لوٹنے لگے تھے۔

روزانہ یہاں آنے والوں میں سے ایک دو نے خان کے اجنبی چہرے کو متجسس نگاہوں سے دیکھا لیکن ان نظروں میں تشکیک نہیں تھی۔ اُس نے جیسے

ہی اٹھنے کا ارادہ کیا۔ اچانک ہی ایک درمیانی عمر کا گنجے سر والا ہندو اندر داخل ہوا۔ اُس کی نظریں لڑکی پر جمی تھیں۔ خان نے واضح طور پر محسوس کر لیا کہ اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں لڑکی سے استفسار کیا تھا یا پھر اُسے کچھ اشارہ کیا تھا۔ لڑکی نے بھی آنکھوں ہی آنکھوں میں جواب دیا۔ دونوں کی طرف دیکھنے کی یہاں کسے مہلت نصیب تھی بس ایک خان تھا جس کی چھٹی حس نے اُس کی راہنمائی اُس طرف کر دی تھی۔

گنجا اب لڑکی کے نزدیک ہونے لگا تھا۔ پھر وہ مورتی کو ماتھا ٹیک کر اُس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا۔ دونوں اسطرح جھک کر ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے کہ کسی کو شک نہیں ہو سکتا تھا۔

خان نے اچانک ہی اٹھنے کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا اُس کے بجائے گنجا اٹھ کھڑا ہوا ــــ شاید اُسے لڑکی نے کوئی بریفنگ کی تھی جس پر وہ عمل کرنے جا رہا تھا۔

بھجن سنتے سنتے اب اُس کا سر دوبارہ درد کرنے لگا تھا۔ یوں بھی اب سورج کافی چڑھ آیا تھا اور لوگوں کی اچھی بھلی آمدورفت شروع ہو چکی تھی۔ اُس نے اب یہاں سے اُٹھ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

عین اُن لمحات میں جب وہ اٹھنے کے لیے پر تول رہا تھا اُس نے لڑکی کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور آنکھوں میں "دعوت" کا سا انداز سمٹ آیا تھا۔ یہ خطرے کی گھنٹی تھی جو فوراً ہی خان کے دماغ میں بجنے لگی تھی۔ اُس نے ذہنی اور جسمانی طور پر خود کو کسی بھی آمدہ طوفان کا سامنا کرنے کے لیے تیار کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔



لڑکی کے وہاں پہنچنے تک وہ خود لوگوں کے درمیان سے راستہ بناتا ہوا دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ لڑکی کا رُخ مخالف سمت سے اُس طرف تھا۔ دروازے سے چند قدم پہلے ہی وہ بالکل اُس کے نزدیک آ گئی پھر اچانک ہی اُس سے ٹکرا بھی گئی۔ یہ ٹکراؤ بڑا جان لیوا اور اُلجھا دینے والا تھا لیکن خان کا ذہن پوری طرح بیدار تھا۔

لڑکی نے گو کہ اِس ٹکراؤ کے اچانک ہو جانے کی شاندار ایکٹنگ کی تھی، لیکن خان بخوبی اندازہ کر سکتا تھا کہ ایسی کوئی بات نہیں اور یہ لوگ اب اُس کی چھان بین کیے بغیر اُسے یہاں سے نکلنے نہیں دیں گے۔

"شما کیجیے" ــــ لڑکی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں ــــ" اُس نے خود کو بالکل نارمل رکھا اور اُٹھ کر باہر کو لپکا۔ لڑکی اِس کے تعاقب میں تھی۔ باہر رکھے جوتے پہنتے ہوئے اُس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں باہر کے ماحول کا جائزہ لے لیا تھا۔ اُسے گنجے کے علاوہ بھی دو ایک اور چہرے مشکوک نظر آ رہے ہے۔ یہ لوگ بظاہر بالکل لاتعلق سے ایک دوسرے سے الگ تھلگ بکھرے ہوئے کھڑے تھے۔

"کہاں جائیں گے آپ؟" لڑکی نے اچانک ہی اُس پر سوال داغ دیا۔

"شہر کی طرف" ــــ اُس نے جھکے جھکے جواب دیا۔

"مجھے بھی اُدھر ہی جانا ہے۔ چلو اچھا ہے ساتھ رہے گا۔" لڑکی نے فوراً کہہ دیا۔

خان نے کوئی جواب نہ دیا۔ یہاں وہ اُس کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اُسے ڈانٹ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر وہ اُس کی پیش کش ٹھکرا دیتا تو اس معاشرے میں یہ بڑی عجیب سی بات ہوتی اور وہ خوامخواہ مشکوک ٹھہرتا۔

"چلئے" ــــ اُس نے اچانک ہی تن کر کھڑے ہوتے ہوئے لڑکی سے کہا۔

دونوں مندر سے باہر جانے والے راستے کی طرف چل دیے۔ خان نے خود کو صورتحال سے بالکل لاتعلق ظاہر کرنے کی اپنی سی کوشش کر ڈالی تھی، لیکن اُسے احساس ہو رہا تھا جیسے دل کی دھڑکن بے قابو ہوتی جا رہی ہے۔ اس احساس نے اُس کے لاشعور میں دُور دُور تک بھی کہیں خوف موجود ہے اُسے بڑی اُلجھن میں مبتلا کر رہا تھا۔ اُسے خود پر غصہ آنے لگا تھا کہ آخر لاشعوری طور پر ہی سہی وہ خود کو خوفزدہ کیوں محسوس کر رہا ہے۔

نئے ذہنی رویے نے اب اُس کے اندر بہت دُور کہیں لرزتی خوف کی پرچھائیں بھی ختم کر ڈالی تھیں اور وہ ایک مرتبہ پھر مکمل طور پر اپنے آپ میں واپس لوٹ آیا تھا۔ کسی بھی لمحے۔ کسی بھی صورتحال سے ٹکرانے کے لیے بالکل تیار۔

اُس کی چھٹی حس نے اِس بات کا احساس دلا دیا تھا کہ اُس کے ساتھی سائے کی طرح اُس کے پیچھے لگے ہوئے تھے اور کسی لمحے اگر اس لڑکی کو خان پر شک گزرا تو اُس کا صرف ایک اشارہ خان کے لیے کافی ہوگا۔

"کہاں رہتے ہیں؟" ــــ لڑکی نے دوبارہ اُسے کریدا۔

"آپ کہاں رہتی ہیں؟" ــــ اُس نے اُلٹا سوال کر دیا۔

"اوہ شاید آپ بُرا مان گئے۔ دراصل میں نے آپ کو یہاں پہلی مرتبہ دیکھا [illegible]

"ٹھیک دیکھا ہے میں یہاں پہلی مرتبہ ہی آیا ہوں! یہ جو ریلوے لائن کے پرلی طرف کالونی ہے وہاں میں آیا ہوں، میری بہن یہاں بیاہی گئی ہے ــــ میرے بہنوئی بی ایس ایف میں ہوتے ہیں" ــــ وہ لڑکی کو بولنے کا موقع بھی نہیں دے رہا تھا۔

"کیا کرتے ہیں آپ وہاں؟" ــــ

"پڑھتا ہوں فورتھ ایئر میں۔"

"اب شہر بھی بتا ہی دو"۔۔۔ لڑکی کا لہجہ خاصا بے تکلف ہو چلا تھا۔ خان حوصلہ مندی سے خود کو سنبھال رہا تھا۔

"لدھیانہ"۔۔۔

"اوہ۔۔۔ یوں کہو ناں۔ ہم بھی وہاں کے ہیں۔ ماڈل ٹاؤن میں گھر ہے ہ مَیں بھی یہاں مہمان آئی ہوں۔ اپنے چچا کے گھر۔ وہ پولیس کے افسر ہیں ا یہاں اُن کی ڈیوٹی لگی ہے"

۔۔۔"ارے! مَیں نے تو تمہارا نام ہی نہیں پوچھا۔۔۔" اُس نے اس د باقاعدہ خان کے بازو پہ ہاتھ بھی مار دیا تھا۔

"راج کمار"۔۔۔ اُس نے متانت سے کہا۔

"مَیں بملا ہوں۔ بملا چٹوپادھیائے۔ مَیں بھی گریجویشن کر رہی ہوں۔ خالص سے۔ کون سا کالج ہے آپ کا؟"

لڑکی واقعی سدھائی اور سمجھائی ہوئی لگتی تھی اور خان محسوس کر سکتا تھا اکیلی بھی نہیں ہے۔ اُس کے لیے کوئی بھی مسئلہ پیدا کر سکتی ہے۔ جیسے ہی خان پر شک ہوتا۔ وہ اپنے ہمراہیوں کو اشارہ کرتی اور۔۔۔ اس سے آگے کچھ سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اُسے خان پر شک ہو بھی چکا ہو ا اب وہ اس کی تصدیق یا مزید کسی کلو کی تلاش میں ہو۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ کاش یہ ملاقات لدھیانہ میں بھی ہو رہے"۔۔۔ اُس نے اچانک ہی ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد اپنا لہجہ بدل لیا

"اوہ کیوں نہیں۔۔۔ کیوں نہیں۔۔۔" لڑکی نے اُس مرتبہ پھر بڑی بے سے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارا۔

جس راستے پر وہ چلے جا رہے تھے اِس کے دونوں طرف کھیتوں کا وسیع پھیلا ہوا تھا اور ان کھیتوں کے بیچوں بیچ چلنے والے اُسے نظر بھی نہیں آ سکتے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ اِس کے ساتھی اِس سلسلے میں کہیں کسی گوشے میں چھپے اُن کا تعاقب کر رہے ہوں۔

ریلوے لائن اُن کے نزدیک آ گئی تھی پھر اُسے گاڑی کے انجن کی آواز بھی سنائی دینے لگی۔ فوراً ہی اُس کا ذہن پلٹا اور اُس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ لڑکی سے حاصل کرنے اور اپنے تعاقب میں آنے والوں سے بچ کر نکل جانے کا

دونوں ریلوے لائن کے نزدیک پہنچ چکے تھے یہاں کوئی پھاٹک نہیں بنایا گیا تھا کیونکہ یہ کوئی عام گزرگاہ نہیں تھی۔ وہ لائن سے ذرا ہٹ کر کھڑے ہو گئے گاڑی گزرنے کے بعد ہی دوسری طرف جائیں۔ اس دوران خان لڑکی کو ایسی دیکھ رہا تھا جو واقعی کسی بھارتی ہندو نوجوان کی نظریں کہلا سکیں۔ ہوس سے بھرپور نظریں۔۔۔ گاڑی نزدیک آ رہی تھی۔ اور نزدیک۔ اب اس کا پندرہ بیس گز دُور رہ گیا جب وہ اچانک لڑکی کی طرف گھوما:

اُس نے اپنے دونوں بازو سیدھے کیے اور پوری قوت سے دو ہتڑ اُس کے لڑکی کے لیے یہ حملہ اتنا غیر متوقع اور اچانک تھا کہ وہ صدمے ہی کر رہ گئی۔۔۔ وہ لڑھکنیاں کھاتی دور جا گری اور شاید زمین پہ گرتے بھی ہو گئی تھی۔

لیکن خان اُس کی حالت دیکھنے کے لیے رکا کب تھا؟

○

دس گز دُور تھا جب وہ اپنے قدموں پہ اُچھلا اور ایتھلیٹوں کی طرح

اپنے جسم کو تولتا ہُوا ہَوا میں لمبی زقند بھر کے ریلوے لائن کے پار جا گرا۔ ـــــ اُس کے اِس عمل کا مکمل نظارہ اگر کسی نے گاڑی میں سے کیا بھی ہو تو بھی اُس کا کچھ نہیں بگڑ سکتا تھا۔ کیونکہ لڑکی اور اُس کے درمیان خاصی لمبی ٹرین حائل تھی۔

خان دیوانہ وار کھیتوں کے اندر ہی اندر بھاگ رہا تھا۔ اُس کے حساس کانوں نے اِس دوران ریوالور سے کی جانے والی فائرنگ کی آواز سُن لی تھی گو کہ ٹرین کے شور میں یہ آوازیں خاصی دبی ہوئی تھیں لیکن اس کے باوجود یہ جان گیا تھا کہ لڑکی کے ہمراہی ہَوا میں فائرنگ کر کے شاید اپنی بوکھلاہٹ کو کسی طور کم کرنے میں کوشاں تھے۔

اتنی خطرناک صورتِ حال کے باوجود اُن لوگوں کی بے بسی پر بھاگتا ہوا مسکرائے بغیر نہ رہ سکا: وہ چشمِ تصور سے ریلوے لائن کے دوسری طرف موجود لوگوں کو غصّے سے ہونٹ کاٹتے دیکھ رہا تھا۔

جب تک گاڑی گزرتی اور وہ لوگ لائن عبور کر کے دوسری طرف آتے عابد خان اُن کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ گھنے اور اُونچی اُونچی کماد کی فصل سے بھرے کھیتوں میں دو ڈھائی فرلانگ دُور جا چکا تھا۔

اُس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ پچھلے بیس گھنٹوں سے اپنے آپ سے اعصاب شکن جنگ لڑ رہا تھا۔ لیکن حوصلہ ہارنا تو جیسے اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ کھیتوں کے سلسلے سے اب وہ باہر نکل چکا تھا اور اپنے سامنے والی طرف اُسے وہ سڑک بخوبی دکھائی دے رہی تھی جس پر شہر کی سمت جانے کے لئے رکشہ، ٹیمپو اور ریڑھے بھاگے چلے جا رہے تھے۔

اُس نے اپنی رفتار کم کر کے بے ترتیب اور پھولی ہوئی سانس پر قابو پایا۔

سڑک کے کنارے پہنچنے تک وہ بالکل نارمل ہو چکا تھا ـــــ اُسے علم تھا دشمن شکاری کتوں کی طرح اُس کی بو سونگھتا ہُوا اُس کے تعاقب میں آ رہا ہے لیکن وہ اتنے اطمینان سے سڑک کے کنارے کھڑا تھا جیسے ابھی ابھی فٹ بال میچ سے فارغ ہو کر آیا ہو۔

ایک ٹیمپو کو نزدیک آنے پر اُس نے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور اُس میں پہلے سے موجود سواریوں کے ساتھ پھنس کر بیٹھ گیا۔

ٹیمپو میں موجود سواریوں نے اپنے اپنے زاویے سے اُس پر نگاہیں دوڑائیں لیکن خان جان بوجھ کر کسی سے بھی آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔

ـــــ یہ وہ لوگ تھے جو اکثر اسی روٹ پر سفر کیا کرتے تھے اور اپنے درمیان کسی اجنبی کو دیکھ کر اُن کا چونکنا بھی ضروری تھا۔ شاید اسی لیے اُس کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھے ایک گہری آنکھوں والے بوڑھے سکھ نے اُس سے پوچھا تھا۔

"کتھوں آں (کہاں سے آئے ہو) ؟"

"جالندھر والی" ـــــ خان نے پہلے ہی سے خود کو ایسی صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر رکھا تھا۔

"پروہنا ایں (مہمان ہو)"؟ دوبارہ اُس نے خان کی آنکھوں میں جھانکا جہاں سوائے معصومیت کے اُسے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

"ہاں جی! میں امرتسر سے آیا ہوں۔" خان نے اُسے ایسے پھاڑ کھانے والے لہجے میں جواب دیا کہ دوبارہ بوڑھے سکھ کو جو شکل ہی سے پولیس کا ٹاؤٹ دکھائی دے رہا تھا کوئی اور بات پوچھنے کی ہمت نہ پڑی۔

اُس کے ساتھ والے کسی مسافر نے شاید خان کے تند و تیز لہجے کو بھانپ لیا تھا۔

تب ہی تو اُس نے بوڑھے سکھ کو قریباً ڈانٹتے ہوئے کہا تھا، سرپنچ کیا بن گیا ہے یار۔ مصیبت ڈال رکھی ہے اِس نے۔ خواہ مخواہ لوگوں پر شک کرتا رہتا ہے۔

"اور کیا....." ساتھ والی سواریوں نے کہا۔

شاید یہ لوگ بوڑھے سکھ سرپنچ کی عادت سے واقف تھے اور انہوں نے بطورِ ہندو اِس بات کا بُرا منایا تھا کہ اُن کے ایک ہندو ساتھی سے اِس لہجے میں گفتگو کی جائے۔

سرپنچ نے کسی بات کا جواب نہ دیا اور چپکا ہو کر بیٹھا رہا! پھر وہ لوگ اپنے دیہاتوں کے گرد اگرد ہونے والی ہلچل کے متعلق باتیں کرنے لگے؛ وہ کسی پاکستانی "گھس پیٹھئے" کا ذکر کر رہے تھے اور ایک آدمی بڑے رازدارنہ لہجے میں دوسروں کو بتا رہا تھا کہ اُس نے اپنی آنکھوں سے ایک پاکستانی جاسوس کو کنوئیں میں زہر ملاتے دیکھا ہے۔ اِس سوال پر کہ اُس نے اُسے گرفتار کیوں نہیں کروایا، اُس نے لوگوں کو بتایا کہ جب تک وہ مقامی پوسٹ پر اطلاع کرتا وہ جاسوس بھاگ گیا تھا اور "سرکار نے اب وہ کنواں بند کروا دیا ہے۔"

خان نے انہیں اپنی باتوں میں مصروف دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔

ٹمپو میں سواریاں اس بُری طرح ٹھنسی ہوئی تھیں کہ باہر لٹکتا کنڈیکٹر اندر آنے کی ہمت ہی نہیں کر پا رہا تھا۔ یہی بات خان کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی اور ایک جگہ جہاں ٹمپو رُکا اُسے کچھ زیادہ ہی رونق دکھائی پڑی۔ شاید یہ بے چارے نزدیکی دیہات کے رہنے والے لوگ تھے جو اپنے کاروبارِ زندگی کے سلسلے میں شہر کی طرف جا رہے تھے۔

سواریوں کی ٹانگوں کو اِدھر اُدھر کرتا وہ باہر نکل آیا۔ مقامی سواریوں کے کرائے اُسے حفظ تھے۔ اُس نے روپے کا ایک نوٹ کنڈیکٹر کے ہاتھ پر رکھا اور اُس کی

طرف دیکھنے لگا۔ کنڈیکٹر نے جیب میں ہاتھ ڈالا کچھ پیسے اُسے لوٹا کر زور سے ہاتھ ٹمپو پر مار دیا۔

خان نے ایک لمحے کے لیے رُک کر صورتحال کا جائزہ لیا۔ اِس "سٹاپ" کے بالکل پیچھے اُسے ایک ہی قطار میں بنی پانچ چھ دُکانیں نظر آ رہی تھیں۔ شاید یہ اِس علاقے کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ گاؤں تھا۔ ایک دُکان پر جہاں ایک بوڑھا سا درزی سر جھکائے مشین چلانے میں مصروف تھا۔ اُسے کپڑے اور کینوس کے تھیلے اور دھوتیاں لٹکتی نظر آ گئیں۔

یہ تائیدِ غیبی تھی۔!

اُس نے ایک لمحے کے لیے کچھ سوچا پھر دُکان پر پہنچ گیا۔ دھوتی کی قیمت اُس نے جان بوجھ کر اور خاصی بحث کے بعد کم کروائی تھی اور ایک کپڑے کا تھیلہ بھی خرید لیا تھا ــــ اب اُس کا رُخ سڑک کے پرلی طرف بنے کماد کے کھیتوں کی طرف تھا! لوگوں کی آمدورفت اچھی خاصی شروع ہو گئی تھی۔ لیکن وہ نظریں بچا کر ایک کھیت میں پیشاب کے بہانے گھُسنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد جب وہ کھیت سے دوبارہ برآمد ہوا تو بالکل ایک بدلا ہوا انسان تھا: اُس کے جسم پر قمیص تو وہی تھی لیکن دھوتی بدل چکی تھی جسے اُس نے براہمنوں کے مخصوص انداز میں بل دے کر باندھا ہوا تھا۔ صبح مندر کے پروہت نے اس کے ماتھے پر جو چندرا لگا دیا تھا۔ اس کے بعد تو وہ اب بالکل براہمن نظر آنے لگا تھا۔

دل ہی دل میں اپنے نئے روپ کا تصور کر کے وہ مسکرا دیا! اب وہ دوبارہ اُسی سٹاپ کی طرف جا رہا تھا جہاں اترا تھا لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ اُس کی چال ڈھال بالکل بدل چکی تھی۔ اُس کے چلنے کا انداز اِس بات کی چغلی کھا رہا تھا کہ

اس کی دونوں ٹانگوں میں کچھ فرق ہے۔ کھیتوں کے سلسلے سے سٹاپ تک و
یہی چال چلتا آیا لیکن کیا مجال جو اس میں ایکٹنگ کا شائبہ تک بھی گزرا ہو۔



بس سٹاپ کی بنی دُکانوں میں سے وہ ایک چائے کی دُکان پر بیٹھ گیا۔ اگر وہ بوڑھا درزی جس سے اُس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی یہ دھوتی اور تھیلا خر تھا، بھی اُسے دوبارہ دیکھ لیتا تو شاید پہچان نہ پاتا۔ اُس نے دُکاندار کو پاؤ دودھ کی چائے" اور مٹھائی لانے کو کہا اور خود دیہاتیوں کے سے انداز میں دونوں ٹانگیں پسار کر لکڑی کے بنچ پر بیٹھ گیا۔

چائے پیتے ہوئے اُسے بڑی فرحت اور تازگی کا احساس ہو رہا تھا۔ ایک لمبی اور تھکا دینے والی دوڑ کے بعد چائے کے چند گھونٹوں ہی نے اس کے ج میں اُتر کر اُسے دوبارہ چوکس کر دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہاں سے ابھی نکل جائے یا اچھے وقت کا انتظار کرے۔

اس بات کا تو اُسے بخوبی احساس تھا کہ اگلے دو تین روز تک بھی اس کے چپے چپے پر پھیلے ہوئے سیکورٹی کے سرکاری کتے اپنی جگہ سے نہیں ہلیں اُس نے جس طرح بار بار اُن لوگوں کے پھیلائے ہوئے جال کو توڑ کر اپنے راستہ تلاش کیا تھا۔ اُس کے بعد وہ لوگ کس بُری طرح جھنجلاہٹ میں مبتلا گے؟ اِس بات کا احساس اُس سے زیادہ بہتر انداز میں اور کون کر سکتا تھا۔

اپنے قریب بیٹھے ایک اور شخص کی گھڑی پر اُس نے کن انکھیوں سے نظر دوڑائی۔ گیارہ بج رہے تھے اس نے بارہ بجے تک یہیں بیٹھے رہنے کا فیص لیا تھا۔

آدھ گھنٹے میں اس نے چائے ختم کی۔ دکاندار بھی اُس کی طرف سے بِل

بھلے پر شکر گزار تھا ——— اب کچھ نظریں اُس کی طرف خوامخواہ اٹھنے لگی تھیں اور اس سے پہلے کہ وہ لوگ کسی شک و شبہ کا شکار ہوں۔ خان نے وہاں سے اُٹھ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

ایک خستہ حال لاری میں سوار ہو کر اب وہ شہر کی طرف جا رہا تھا اور ——— شہر کے باہر بنی چونگی پر وہ اُتر گیا۔

——— ریسٹ ہاؤس میں رکھا اِس علاقے کا نقشہ ایک مرتبہ پھر اُس کی آنکھوں کے سامنے پھیلتا چلا گیا۔ کرنل صاحب کی انگلی ایک جگہ سے اُٹھ کر دوسری جگہ جاتی اور آخر اس چونگی پر آکر ٹھہر گئی۔

اُسے یاد آگیا کہ یہ نہر شہر کے باہر باہر گھوم کر شہر میں داخل ہو جاتی ہے! چونگی کے بعد شہر میں داخل ہوتے وقت اِس بس کی چیکنگ کس شدت سے ہوتی ہے؛ اس کا اندازہ تو اُسے سواریوں کی باتوں ہی سے ہو گیا تھا! بس میں موجود ہر شخص کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں اور وہ لوگ کسی پاکستانی جاسوس کے فرار کی کہانی سُنا رہے تھے۔

مختلف منہ مختلف باتیں اور مختلف نوعیت کے تذکروں سے لُطف اندوز ہوتا ہی وہ یہاں تک پہنچ گیا تھا: "جب اِس واقعے کی خبر آگ کی طرح ان قصبات اس پھیل چکی تھی تو سیکورٹی کا کیا حال ہوگا؟"

یہی کچھ سوچ کر اُس نے نہر کے کنارے کنارے چکر کاٹ کر پیدل ہی شہر تک پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اِس طرح اُسے کم از کم یہ اُمید ضرور تھی کہ وہ سیکورٹی والوں کی قائم کردہ مختلف چیک پوسٹوں سے تو نجات حاصل کر سکے گا۔

نہر کی پٹڑی پر اکا دُکا لوگ آ جا رہے تھے۔ دل ہی دل میں اُس نے نہر کے دونوں اطراف دیہاتوں کے نام دوبارہ دوہرائے۔

"ایک اچھے جاسوس کی بہترین پہچان یہی ہے کہ وہ کوئی بھی اگلا قدم اٹھانے سے پہلے اُس کی مضمرات پر غور کرے اور ہمیشہ ایک "کور سٹوری" لے کر چلے"۔
—— اُس کے خضر صورت انسٹرکٹر نے اس کے لاشعور میں انگڑائی لی اور خان ایک مرتبہ پھر اُسی ریلیسٹ ہاؤس میں پھیلے نقشے کے سامنے آن کھڑا ہوا۔

نہر کی پٹڑی کا ایک موڑ گھومتے ہی وہ اچانک چونک پڑا۔

سامنے گھنے جنگلی گھاس سے ایک جیپ نکل کر باہر آرہی تھی۔ اُس کے لیے اتنا موقع بھی نہیں تھا کہ اپنا آگے بڑھا قدم ہی پیچھے ہٹا لے —— کیا کروں اُس نے سوچا اور اُسی لمحے ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

اُس نے بڑے اعتماد سے قدم اُسی طرف بڑھا دیے —— جیپ اُس کے نزدیک سے کیڑی کی چال چلتی آگے نکل گئی۔

لیکن اچانک ہی اُسے بریک لگنے کی آواز سنائی دی! اس کے اعصاب کو ایک جھٹکا جیپ کے ساتھ ہی ضرور لگا تھا۔ لیکن فولادی اعصاب کے مالک خان کے لیے اپنی کسی بھی کیفیت پر قابو پانے کو صرف چند سیکنڈ ہی کافی تھے۔

"اے ٹھہر جاؤ —— کون ہے" للکارنے والے کا لہجہ اُس کے مدراسی ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔

خان اُس کی آواز پر اچانک ہی پلٹا تھا۔ اُس کے دونوں ہاتھ معافی مانگتے انداز میں بندھے ہوئے تھے اور چہرے پر اُس نے ایک عالم کی معصومیت طاری کر رکھی تھی۔

"گریب آدمی ہے صاحب" —— اُس نے گھگیاتے ہوئے کہا۔

"کدھر جائیں گا؟" —— دوبارہ اُسی مدراسی حوالدار نے پھاڑ کھانے والے لہجے میں اُسے مخاطب کیا۔

"...دی کے" مہاراج جی!" —— خان کے ہاتھ بدستور بندھے ہوئے تھے۔

ایک لمحے کے لیے اِس کے ساتھ بیٹھے لوگوں نے اُس کا جائزہ لیا۔ پھر کسی ... پنجابی لہجہ میں اُسے نزدیک آنے کا حکم دیا —— "ایدھر آ اوئے" —— ... کی نظریں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھے سکھ جمعدار پر سے پھسلتی ہوئی پچھلی سیٹ ... چلی گئی تھیں جہاں جوان اپنی گودیوں میں سٹین گنیں رکھے بظاہر ماحول سے ... نظر آرہے تھے۔ کانپتا ہوا اُسی طرح ہاتھ باندھے اُن کے نزدیک آگیا۔

"کہاں کے ہو اوئے تم؟" —— اُسی سکھ جمعدار نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیا۔

"ادھولپور کے" —— خان دوبارہ گھگیایا۔

"ابے ادھر آ" —— مدراسی حوالدار نے اُسے نزدیک آنے کو کہا ——

"ادھولپور کے" —— اُس نے خان کے لہجے کی بڑی بھونڈی نقل اُتاری۔

جیسے ہی خان نزدیک آیا۔ حوالدار نے ہاتھ لمبا کر کے ایک زوردار تھپڑ اُس کے منہ پر رسید کر دیا۔ خان اُلٹ کر دُور جا گرا۔ جتنی پھرتی سے وہ گرا تھا اُس سے زیادہ پھرتی کے ساتھ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اب اُس نے باقاعدہ روتے ہوئے ہاتھ باندھے شروع کر دیے تھے۔

"اندھا ہے کیا —— تجھے نظر نہیں آتا۔ یہ ممنوعہ علاقہ ہے۔" اُسی سکھ نے خان سے کہا۔

زمین سے اُٹھتے ہوئے خان نے سکھ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات محسوس کر لیے تھے۔ سکھ جمعدار کے ذہن نے شاید مدراسی حوالدار کی یہ حرکت ناپسند کی تھی اور یہ فقرہ بول کر بھی شاید وہ اُسے مزید عتاب سے بچانا چاہتا تھا۔

"مجھے معلوم نہیں مالک" —— اُس نے روتے ہوئے اچانک ہی سکھ جمعدار

کے پاؤں پکڑ لیے۔

"چل دفع ہو جا"۔۔۔ سکھ نے اُسے بناوٹی ڈانٹ پلائی۔

خان اُسے دعائیں دیتا اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دوبارہ اُسی طرف بڑھا۔ "ابے ادھر مر"۔۔۔ مدراسی حوالدار نے اُسے ڈانٹا اور نہر کی دوسری جانب اشارہ کیا۔

"مہاراج جی! "رَنی کے" وہ سامنے ہی تو ہے"۔۔۔ اُس نے انگلی کے اشارے سے ایک سمت اشارہ کیا۔ یہاں سے ایک گاؤں کے آثار بڑے واضح دکھائی دے رہے تھے۔۔۔ "مَیں غریب آدمی کہاں اتنا لمبا چکر کاٹوں گا۔ بچہ بیمار ہے مالک!" اُس نے دوبارہ ہاتھ باندھے۔

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ جلدی چلا جا۔۔۔ دفع ہو جا"۔۔۔ اُسی سکھ جمعدار نے دوبارہ اُس کی مسیحائی کی۔

اس سے پہلے کہ مدراسی حوالدار کوئی اگلا حکم سنائے اُس نے قریباً بھاگنے کے سے انداز میں قدم آگے بڑھا دیے۔ اُس کے بڑھتے قدموں کے ساتھ ہی سکھ جمعدار نے جیپ کے اگنیشن میں کنجی گھما دی تھی۔ انجن سٹارٹ ہونے کی آواز نے خان کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے کر دیے تھے۔

عام حالت میں وہ کبھی اِس طرح تھپڑ کھانے کی ذلّت کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا تھا! اچانک پڑنے والے تھپڑ نے واقعی اُس کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔ اُس نے دل ہی دل میں ایک موٹی سی گالی مدراسی حوالدار کو دیتے ہوئے اپنے دونوں گالوں پر ہاتھ پھیر کر انہیں سہلایا۔ اس دوران جب وہ گِر کر زمین سے اٹھا تو جیپ کے ایک کونے پر بنا ایک مخصوص نشان اُس کی عقابی نظروں میں آ چکا تھا۔ گو کہ اِس جیپ پر اچھی طرح مٹی سے لیپا پوتی کی گئی تھی لیکن "برچھی اور ہاتھ" کا نشان بہرحال نمایاں تھا۔

اُس نے اپنے ذہن کے کسی بڑے ہی محفوظ گوشے میں اِس نشان کو محفوظ کر لیا۔ اب اُس کے لیے "رنی کے" کی طرف جانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ "رنی کے" واقعی اُسی گاؤں کا نام تھا جو یہاں سے بمشکل پون میل کے فاصلے پر نظر آ رہا تھا اور اُسے وہی راستہ جاتا تھا جس طرف سے یہ جیپ نکل کر آئی تھی۔



اپنا گال سہلاتے ہوئے خان نے اُس راستے پر اپنے قدم آگے بڑھائے۔ اُس نے اپنے ذہن میں کسی بھی ممکنہ امکان کو رَد نہیں کیا تھا۔ کچھ بھی ممکن تھا۔۔۔ البتہ یہ بھی کہ جیپ والے کہیں چھُپ کر اُس کی حرکات کا جائزہ لے رہے ہوں۔ اگر اُس نے غلط راستہ اپنایا تو وہ لوگ اُس پر کوئی بھی شک کر سکتے تھے۔ اور اس مرتبہ شک ہو جانے کی صورت میں اُس کے لیے یہاں سے بچ نکلنے کے امکانات بالکل معدوم تھے۔

بمشکل ایک فرلانگ چلنے پر ہی اُسے کچھ ٹرک اور جیپیں ایک جھرمٹ کی شکل میں کھڑے نظر آئے جن پر گہرے سبز رنگ کا جال اور گھاس پھونس ڈال کر انہیں بھارتی فوج نے اپنی دانست میں بڑی ہوشیاری سے کیموفلاج کر رکھا تھا۔

خان کی بیقرار نظریں بڑی بے چینی سے اِس جھرمٹ کا طواف کر رہی تھیں اور وہ گوہرِ مقصود حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُسی طرح کے نشانات جو اُس نے پہلی جیپ پر بنے دیکھے تھے اُسے یہاں بھی نظر آ گئے۔ ایک بے جان مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر رینگ گئی لیکن فوراً ہی اُس نے ہونٹ بھینچ لیے جیسے مسکراہٹ پر غصّہ آ گیا ہو۔

یہ راستہ کھیتوں کے بیچوں بیچ اُس گاؤں تک جاتا تھا جو بدقسمتی یا خوش قسمتی سے اب اُس کی منزل تھی۔ چند قدم مزید چلنے پر اُسے ایک ٹیوب ویل دکھائی پڑا

جس پر سکھ فوجی بڑے بڑے کچھرے پہنے غسل میں مصروف تھے اور ایک کونے میں شاید اس ٹیوب ویل کا مالک کھڑا بڑی حسرت ناک نظروں سے اُس طرف دیکھ رہا تھا۔

"اوئے کدھر جا رہا ہے"—— ایک سکھ فوجی نے جس کی داڑھی اور سر کے بال صابن کے جھاگ میں اِس بُری طرح ڈوبے ہوئے تھے کہ اُس کی آنکھیں بمشکل کھُلی دکھائی دیتی تھیں اُسے ٹوکا۔

"سردار جی سامنے والے گاؤں جانا ہے"۔ وہ حسبِ سابق ہاتھ باندھ کر گھگیایا۔

"اوئے۔ یہ کوئی راستہ ہے جلدی نِکل جا"۔ اُس نے خان کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ "اگر کسی افسر نے دیکھ لیا تو تیری ساری براہمنی نکال دے گا۔" پھر اچانک شاید اُس کی آنکھوں میں صابن اُتر آیا تھا۔ اُس نے سب کچھ بھول کر زور زور سے اپنے دونوں ہاتھوں سے پانی آنکھوں کی طرف پھینکتے ہوئے خان پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔

اُس کے دوسرے ساتھی اِس صورتِ حال سے خاصے لُطف اندوز ہو رہے تھے اور بہت زور زور سے قہقہے بھی لگا رہے تھے۔

لاکھ ضبط کے باوجود بھی خان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی لیکن وہ بڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھ گیا۔ اگر وہ سکھ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ لیتا تو شاید وہ کبھی اپنی ٹانگوں پر چل کر یہاں سے آگے نہ جا سکتا۔



اُس کا رُخ "رنی کے" کی طرف تھا اور ذہن برق رفتاری سے ایک کہانی تیار کر رہا تھا۔ تیار شدہ کہانی کا اُس نے دل ہی دل میں دو تین مرتبہ تنقیدی جائزہ لیا پھر مطمئن ہو کر آگے بڑھ گیا۔ گاؤں کے کھیت اب شروع ہو گئے تھے

کھیتوں میں کہیں کہیں بنی "حویلیاں" بھی اُسے دکھائی دینے لگی تھیں۔ ایک ایسی ہی حویلی کی طرف اب اُس کے قدم اٹھنے لگے تھے۔

حویلی کے باہر ٹیوب ویل کی طرف پیٹھ کیے ایک دیہاتی کسان اُسے دکھائی دے رہا تھا۔ اُس نے ایک ہاتھ میں ڈھیلے ڈھالے انداز میں کلہاڑی پکڑ رکھی تھی۔ وہ سامنے لگے درختوں کی قطار میں کسی درخت کی ٹہنی پر نقب لگانے کے چکر میں دکھائی پڑتا تھا۔

خان بڑے پُر اعتماد انداز میں قدم اٹھاتا اُس کی طرف بڑھنے لگا۔ اب اس کے چہرے سے واقعی ایک براہمن زادہ نظر آتا تھا۔ اپنی چھٹی حس کے زیرِ اثر وہ درمیانی عمر کا شخص اُس کی طرف اچانک ہی گھوما۔

"رام رام جی"—— خان نے دونوں ہاتھ بڑے سلیقے سے خاندانی براہمنوں کی طرح باندھے ہوئے اُسے پرنام کیا۔

"رام۔ رام"—— شاید اُس کی شخصیت نے مخاطب پر پہلی ہی نظر میں اثر

تھا۔

"رنی کے" اِسی گاؤں کا نام ہے کیا——؟" خان کا لہجہ بڑا مدبرانہ سا ہو گیا تھا۔

"ہاں مہاراج"—— مخاطب اب مکمل اسیر تھا۔

"مجھے سکھدیو جی کے گھر جانا تھا"۔ اُس نے اپنی پہلے سے تیار کردہ کہانی کے مطابق تیر چلایا۔

"کون سکھدیو کے—— یہاں دو رہتے ہیں۔ ایک منگو رام کا بیٹا اور دوسرا کالشی ..." نے وضاحت کی۔

"انہیں اُن کے پتا جی کے نام کا تو علم نہیں۔ بس وہ درمیانی سی عمر کے ہیں۔

اور لدھیانہ میں ریکروٹنگ کا کام کرتے تھے"۔۔۔ خان کا لہجہ بدستور پُرسکون تھا۔

"کیا بات کہہ رہے ہیں پنڈت جی مہاراج" شاید مخاطب کو سمجھ نہیں آئی تھی۔

"شریمان جی ہم جس سُکھدیو جی کا ذکر کر رہے ہیں وہ پاسپورٹ ویزوں کا کام کرتے ہیں۔ اُنہوں نے ہمیں یہی پتہ بتایا تھا اپنا۔"

"شریمان جی کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے شاید بے چارہ اپنے ذہن پر زور دے کر ارد گرد کے دیہاتوں میں کسی ایسے "سُکھدیو" کو کھوج رہا تھا! قریباً ایک منٹ بعد اُس نے مراقبے سے سر اٹھایا اور اُس سے مخاطب ہُوا۔

"پنڈت جی! آپ شاید غلط ایڈریس پر آ گئے ہیں۔"

"کیا بات کرتے ہیں مہاراج جی! یہ کیسے ممکن ہے ہمیں تو اُس نے سارا راستہ حفظ کروا رکھا ہے۔" پھر اُس نے شہر کی چونگی سے اس گاؤں تک راستے میں آنے والے دو تین دیہاتوں کے نام بھی لے دیے۔

اُس کا مخاطب دوبارہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔ آدمی "سمجھدار" معلوم ہوتا تھا۔ شاید معاملے کی تہہ تک پہنچنا چاہتا تھا۔

"آئیے آپ بیٹھیں ۔۔۔ اطمینان سے بات کرتے ہیں۔" اُس نے خان کو قریب بچھی چارپائی کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی اُسی طرف بڑھنے لگا۔

خان بظاہر ہونقوں کی طرح منہ اٹھائے اُس کے سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس کے مخاطب نے "پنڈت جی مہاراج" کا خاص احترام کیا تھا اور اُسے سرہانے کی طرف بٹھا کر خود پائنتی کی طرف آ بیٹھا۔

"ایک بات ہے پنڈت جی مہاراج" اُس نے کسی گہری سوچ میں ڈوبتے ہوئے

خان کو مخاطب کیا۔

"کیا بات ہے؟"۔۔۔ خان نے اپنی طرف سے خاصی حیرانگی کا اظہار کیا تھا۔

"ہم ہیں تو جاٹ لوگ لیکن مجھے یوں لگتا ہے جیسے آپ کے ساتھ کوئی دھوکہ ہو گیا ہے۔ کیا شُبھ نام ہے آپ کا؟"

"ایست شرما"۔۔۔ خان نے کہا۔۔۔ "لیکن ہم آپ کا مطلب نہیں سمجھے۔" اُس نے انجان بننا چاہا۔

"ابھی سمجھ آ جائے گا مہاراج۔ مجھے ذرا بتایئے قصہ کیا ہے۔"

پھر "ایست شرما جی" اُسے قصہ سنانے لگے۔ اُنہوں نے بتایا کہ سُکھدیو نامی اس شخص نے اُن سے پانچ ہزار روپیہ باہر بھجوانے کے لیے لیا تھا اور آٹھ دن کا وعدہ کیا تھا کہ ویزا آ جائے گا۔ آج آٹھ ہفتے ہونے کو آ رہے ہیں۔ انہوں نے سوچا کہیں سُکھدیو جی بیمار نہ پڑ گئے ہوں۔ اس لیے اُس کے گاؤں چلے آئے ہیں۔"

"اوہ! کتنے بھولے ہیں آپ مہاراج پنڈت جی۔" اُس کے مخاطب کو واقعی ان کی "سادہ لوحی" پر ترس آ رہا تھا۔ "آپ پڑھے لکھے آدمی ہو کر سمجھ نہیں سکے۔ وہ بلکہ جو کوئی بھی تھا آپ کے ساتھ دھوکہ کر گیا اور آپ کو پریشان کرنے کے لیے یہاں بھیج دیا۔"

"کلنگ ۔۔۔ گھور کلجگ ۔۔۔ ہے بھگوان"۔۔۔ خان نے ٹھنڈی سانس لی۔۔۔ "ہم نے تو روپیہ بھی قرض پکڑ کر حاصل کیا تھا ۔۔۔ ہے بھگوان۔" اُس کی شکل خاصی روہانسی ہو چلی تھی۔

"حوصلہ کیجئے مہاراج! حوصلہ کیجئے! مَیں آپ کے لیے جل بھوجن کا بندوبست کرتا ہوں"۔۔۔ اُس کے مخاطب نے خان کی پیٹھ پر تھپکی دے کر اُس کا حوصلہ بڑھایا۔

"کیا شُبھ نام ہے آپ کا؟" اس مرتبہ جب خان نے اپنا چہرہ اُس کی طرف موڑا تو اُس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"مَیں پنڈتوں کا داس ہوں مہاراج جی گمار نام ہے میرا۔" وہ پنڈت پر واقعی مرمٹا تھا۔

"گمار جی آپ کا بہت دھنواد ——— ہم کو جانے دیجئے۔" خان کا لہجہ خاصا گھمبیر تھا۔

"نہیں مہاراج نہیں ——— یہ کبھی نہیں ہوگا ——— کیری کے گھر نارائن آئیں اور چلے جائیں۔ آپ اتنے سفر سے پہلے ہی تھکے ہوئے ہیں۔ آپ مجھ غریب کی کٹیا پر رات بسر کیجئے۔ صبح میں خود آپ کو لاری اڈے پر شہر تک چھوڑ کر آؤں گا۔"

"آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں ——— یہ تو ہمارا نصیب ہے۔ آپ کیوں کشٹ اٹھاتے ہیں ہمارے لیے۔"

"پنڈت جی" کی آواز ابھی تک بھرائی ہوئی تھی۔

"یہ میرا کرتوے (فرض) ہے مہاراج" ——— گمار نے ہاتھ باندھے۔

گمار کی ضد پر "پنڈت جی" کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور وہ اُسی کھاٹ پر پاؤں پسار کر بیٹھ گیا۔



گمار اُسے تھوڑی دیر انتظار کرنے کے لیے کہہ کر چلا گیا اور خان سوچنے لگا کہ قدرت کو واقعی اُس کی حالت پر رحم آ گیا ہے۔ یہ شخص بالکل فرشتہ بن کر اُس کی مدد کر رہا ہے۔ اگر وہ آج کی رات بھی اس علاقے میں گزار لیتا تو کل تک خاصا محفوظ ہو جاتا۔ گمار جیسے براہمنوں کے عقیدت مند سے یہ توقع تو فضول تھی کہ وہ اُس کے متعلق کوئی چھان بین کرتا رہے گا۔ اگر ایسی بات ہوتی بھی تو خان اُس کے لیے

اپنی طور پر مکمل تیار تھا۔

گمار اُسے یہیں بٹھا کر گاؤں کی سمت جانے والے راستے پر چلا گیا تھا۔ شاید اپنے گھر سے پنڈت جی کے لیے "جل بھوجن" لینے گیا تھا۔ ان فارغ لمحات کو غنیمت جانتے ہوئے خان نے اپنے کپڑے ایک طرف اتار کر رکھے اور زیرِ جامہ کے ساتھ ٹیوب ویل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اُس نے پہلے ہندوؤں کے سے مخصوص طریقہ عبادت کے انداز میں دونوں ہاتھ جوڑ کر منہ سے اُلٹے سیدھے اشلوک نکالے بالکل پنڈتوں کے سے انداز میں جُھکتے ہوئے ایک ہاتھ سے ناک بند کر کے اپنا سر پانی کی دھار کے نیچے رکھ دیا۔

تین چار منٹ بعد جب وہ نہانے سے فراغت پا کر باہر نکلا تو اُسے اپنا وجود پہلے کے مقابلے میں خاصا ہلکا محسوس ہونے لگا۔ کھاٹ پر بیٹھے ہوئے اُسے پچھلے تمام واقعات ایک ایک کر کے یاد آنے لگے تھے اور اس کا دل احساسِ تشکر کے جذبات سے بھر بھر آتا تھا۔ واقعی یہ اُس پر اللہ کی خصوصی کرم فرمائی تھی کہ وہ ابھی تک ان موذیوں کے شکنجے سے بچا ہوا تھا۔

گمار کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ اِس مرتبہ اِس کے ساتھ اُس کی گھر والی بھی آئی تھی جس نے اپنے ہاتھوں میں "تھالی" اٹھا رکھی تھی اور اُس پر کپڑا ڈال کر اسے گرد و غبار سے محفوظ بھی کیا ہوا تھا۔

گمار کی بیوی پر پہلی نظر پڑتے ہی خان کو احساس ہوا کہ اِس عورت کے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ بادی النظر میں اُس کی عمر بمشکل بیس سال دکھائی دے رہی تھی جبکہ اُس کا محسن ڈھلتی عمر کا آدمی تھا۔

"شاید یہ اُس کی دوسری شادی تھی؟" ——— کچھ بھی ہو۔ اُس نے سوچا! مجھے اس سے کیا۔

"کملا ہے مہاراج میری دھرم پتنی" ــــ اُس نے خان سے اپنی بیوی کا تعارف کروایا جس نے "تھالی" چارپائی پر رکھ کر پنڈت جی کے چرن چھُو کر عقیدت و احترام کا اظہار کیا تھا۔

خان نے بھی کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ باندھتے ہوئے اُسے پرنام کیا۔ اُسے اِس کملا کی آنکھوں میں ہلکورے مارتی ایک مخصوص پیاس کا بڑی شدّت سے احساس ہوا تھا۔ اُس کا لہجہ چغلی کھا رہا تھا کہ : "اُس کا تعلق اِس علاقے سے نہیں۔ شاید بے چاری وسطی ہند کے کسی علاقے کی رہنے والی تھی اور ہاتھوں ہاتھ بکتی ہوئی گُمار تک پہنچی ہوگی۔"

دونوں پاؤں چارپائی کے اوپر کرکے وہ پنڈتوں کے مخصوص انداز میں آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ گُمار نے تھالی اور تازہ پانی سے بھرا اسٹیل کا ایک لوٹا اُس کے سامنے رکھ دیا۔

"آپ جل بھوجن کیجئے مہاراج! میں ذرا سامنے سے لکڑی کاٹ لاؤں!" اُس نے کلہاڑی ہاتھوں میں تولتے ہوئے کہا۔

"اوشے ــــ اوشے ــــ (ضرور۔ ضرور)" خان نے کہا۔

"مہاراج کا خیال کیجئو" اُس نے جاتے جاتے اپنی بیوی کو تنبیہہ کی جس نے گردن جھکا کر اُس کے حکم پر صاد کر دیا۔



سر جھکائے وہ کھانے میں مصروف تھا۔

ــــ تازہ سبزی اور ہندو گھرانے کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے مخصوص ... کے چھلکے اور اُن کے ساتھ مختلف اقسام کی کھٹی میٹھی چیزیں دیکھ کر اس کی بھوک چمک اٹھی تھی لیکن وہ بڑے سکون اور پُروقار انداز میں لقمہ لقمہ بڑی نزاکت ...

کھا رہا تھا۔ اِس دوران اُس نے گو کہ براہِ راست کملا کی طرف دیکھنے کی جرأت نہیں کی تھی لیکن کن انکھیوں سے اُس نے دیکھ لیا تھا کہ کملا کی نظریں مسلسل اُس پر گڑی ہیں۔

گُمار کے وہاں سے رُخصت ہوتے ہی اُس کا چہرہ بدلنے لگا تھا اب وہ ایک سہمی ہوئی اور حیادار عورت کے بجائے نوجوان لڑکی بنتی چلی جا رہی تھی۔ اِس کے ... دھری موٹے سوت کی چادر ڈھلک کر اُس کے شانوں پر آ رہی تھی اور ہوا نے اب اِس کے بالوں سے اٹھکھیلیاں کرنی شروع کر دی تھیں۔

حالات نے کملا بے چاری کو واقعی بہت چھوٹی سی عمر ہی میں مکمل عورت بنا دیا تھا اور خان نہیں چاہتا تھا کہ : یہ معصوم لڑکی جسے بھارتی سماج نے فاحشہ بنا رکھا تھا اُس کے اعصاب پر غالب آئے ؛ اُس نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا۔

"کہاں کی ہیں آپ؟" کھانا کھاتے ہوئے اچانک ہی اُس نے کملا پر سوال داغ دیا۔

"میں اب کہاں کی رہی ہوں مہاراج ــــ کہیں کی بھی تو نہیں رہی۔ نہ گھر کی نہ گھاٹ کی!" اُس نے بڑی لمبی آہ بھر کر خاصے دُکھیا لہجے میں کہا۔

"کوئی تو دیس ہوگا آپ کا؟"

"ہاں مہاراج۔ ہمارا دیس تھا۔ گھر تھا۔ ماتا پتا تھے۔ بہن بھائی تھے۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا۔" اس کا لہجہ قدرے گمبھیر ہو چلا تھا۔

"یہ سارا سنسار ہے ہی دُکھ کی نگری۔ یہاں سب روگ ہی روگ ہیں۔ ہے بھگوان!" ــــ خان نے اُس کی حالت پر کفِ افسوس ملا۔

"آپ نے ٹھیک ہی کہا مہاراج۔ ہم تو جنم جنم کے دُکھیا ہیں۔"

اس کی پہلے سے طے شدہ منصوبہ بندی میں کہیں بھی "رنی کے" کا ذکر تک نہ تھا۔

اب تک وہ حالات کے دھارے ہی پر بہتا ہوا یہاں آیا تھا۔

اُس نے قدم قدم پر نئی منصوبہ بندیاں کی تھیں۔ اور واقعی ایک تھکا دینے والی اعصابی جنگ خود سے لڑی تھی اور ــــ اب حالات نے اس موڑ پہ کملا کو اُس کے سامنے لاکر کھڑا کر دیا تھا۔

بھارت میں ان حالات میں کسی بھی عورت کا سہارا اُس کے لیے باعث اطمینان ہوسکتا تھا! اُس نے کمار سے ملاقات کے بعد جو نئی منصوبہ بندی کی تھی وہ سوچنے لگا تھا کہ: "اِس میں کہیں یہ دھان پان سی لڑکی فٹ بھی بیٹھتی ہے یا نہیں؟"

فی الوقت اُسے اپنے سوال کا کوئی مناسب جواب نہ ملا اور "اُس نے دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی کو مفید جانا۔ اس کے باوجود وہ کملا کو کھونا نہیں چاہتا تھا

"آپ شاید بنگال کی ہیں؟" اُس نے پیش رفت کی۔

"مہاراشٹر کی۔ میرا جنم شاید بمبئی میں ہوا تھا۔ میرے ماں باپ نے مجھے صرف دو سو روپلے کے عوض اُس کے ہاتھ بیچ ڈالا۔"

"تم اِس کی پہلی بیوی ہو کیا؟"

"نہیں" ــــ اُس نے کہا ــــ "پہلی بیوی تو دو بچوں کو جنم دے کر مر گئی میں تو دوسری ہوں۔ لیکن یہ بھی کیا معلوم سچ ہے یا جھوٹ ــــ گاؤں والے تو یہی کہتے ہیں۔ اِس گاؤں میں مجھ جیسی تین اور لڑکیاں بھی ہیں۔ وہ بھی خرید کر لائی گئی ہیں۔"

"اوہ ــــ!" خان نے ہمدردی ظاہر کی۔

"آپ اِس کے واقف ہیں کیا؟ شہر جاتا رہتا ہے ناں!"

"نہیں" ــــ بس حالات نے اچانک ہی تمہارے پتی سے ٹکرا دیا۔"

"اچھا ہوا۔ اِس طرح میں بھی تو آپ سے ٹکرا گئی ہوں۔" وہ خاصی بیباک ہو رہی تھی۔

"میں تو ایک آدھ روز کا مہمان ہوں" ــــ خان اس کارڈ کو ہر صورت ہاتھ میں رکھنا چاہتا تھا۔

کمار اب ایک لکڑی گھسیٹتا ہوا اُس طرف آتا دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں نے صورتحال کی نزاکت کا احساس بھی کر لیا تھا۔

کملا نے بڑے سلیقے سے دوبارہ موٹے سوت سے بنی ہوئی چادر اپنے سر پر ڈال کر دیہاتی عورتوں کی طرح لمبا گھونگھٹ نکال لیا تھا۔

○

کمار کے وہاں پہنچنے تک کملا نے اُس کے سامنے سے برتن ہٹا لیے تھے اور اب انہیں شاید مانجھنے جا رہی تھی۔

"آپ کا بہت دھنواد۔ اس کلجگ میں آپ ایسے اچھے لوگ ہی سنسار کو سورگ بنائے ہوئے ہیں۔" خان نے اُس کے نزدیک آتے ہی اُس میں ہوا بھرنا شروع کر دی۔

اُسے اس معاشرے کے دوغلے پن سے ابتدا ہی میں کراہت محسوس ہونے لگی تھی۔ بظاہر تو یہ شخص اتنا مذہبی بنا ہوا تھا کہ پنڈتوں کے پاؤں دھوتا پھر رہا تھا لیکن حقیقت میں وہ جنسی درندہ تھا اور محض اپنی جنسیت کو تسکین فراہم کرنے کے لیے اس ڈھلتی عمر میں بھی اُس نے کملا جیسی بدقسمت لڑکی خرید کر اپنے گھر میں سجا رکھی تھی۔

"منافقت اس معاشرے کی بنیاد ہے" ــــ اُسے دورانِ تربیت اپنے اُستاد کا کہا ہوا فقرہ یاد آگیا۔ "لیکن تم وہاں مصلح بن کر نہیں جاسوس بن کر اُن لوگوں کے

راز چرانے جا رہے ہو۔ جذبات کو کبھی خود پر غالب نہ آنے دینا۔ جس معاشرے میں جا رہے ہو اُس کا ایک مکمل اور مربوط حصّہ بن کر رہنا۔ اگر کبھی تم نے اُس سے ہٹ کر کچھ سوچنے یا کرنے کی ٹھانی تو بڑی بے رحمی سے مارے جاؤ گے۔"

اور اُسے بادلِ نخواستہ ہی سہی بہرحال ہندو بن کر رہنا تھا! فی الوقت اُس نے اِس معاشرے کے مذہبی پیشواؤں کی اولاد کا روپ دھار رکھا تھا جو اِس بات کا متقاضی تھا کہ وہ کمار سے بھی زیادہ بھرپور منافقت کا ثبوت دے۔

یہ اُس کی خوش نصیبی تھی کہ اُس کا سامنا بھی کمار جیسے روایتی ضعیف العقیدہ ہندو سے ہوا تھا جو ضرورت سے زیادہ براہمنوں کا تابعدار نظر آ رہا تھا۔ کمار کو اُس نے جلد ہی ایک لمبی کہانی سُنا دی کہ کس طرح اُس نے اپنے ماتا پتا کی مرضی کے خلاف باہر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس نے کمار کو بتایا کہ وہ گریجویشن کر چکا ہے لیکن اِس کے باپ کی خواہش ہے کہ وہ اُس کی جگہ مندر کی گدی سنبھالے اور اگلا پروہت وہ خود ہو۔

"ہم لوگ "وشنو ماتا" کے پجاری ہیں۔ یہ مندر میرے پردادا نے خود بنوایا تھا اور ماتا کے کئی تحائف ہمارے ہاں موجود ہیں۔ دادا کے بعد میرے پتا نے پروہت کی گدی سنبھالی تھی اور اب وہ مجھے یہاں بٹھانا چاہتے ہیں" —— اُس نے کمار کی مذہبی کمزوری سے بھرپور فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"مہاراج جی آپ کے پاس بھگوان کا دیا سب کچھ تو ہے۔ آپ کس چکر میں پڑ گئے" —— کمار نے اُسے سمجھایا۔

"بس ہماری بدھی (عقل) بگڑ گئی تھی —— ہے ماتا شیراں والی۔ ہم [illegible]

اُس نے خالص براہمنی انداز اپنایا —— اِن دنوں درخواست کرنی ہے [illegible] سے" اچانک ہی ایک خیال اُسے آ گیا تھا۔

"گیان —— ؟" کمار بسر و چشم حاضر تھا۔

"دیکھئے ہمارے پتا جی علاقے کے عزّت دار آدمی ہیں۔ یوں بھی ہم نے یہ کام اُن کی مرضی کے خلاف کیا تھا۔ اب بھگوان نے ہمیں سیدھا راستہ دکھا دیا ہے۔ ہم نے بھی توبہ کر لی۔ اب تو سارا جیون دھرم کی سیوا ہی میں بیتائیں گے۔ آپ اِس بات کا تذکرہ اِس گاؤں میں اور کسی سے نہ کیجیے۔ بس یہ راز ہمارے اور آپ کے درمیان ہی رہنا چاہیئے۔ آپ لوگوں کو یہی بتائیں کہ ہم آپ کے مہمان ہیں اور آپ سے ملنے آئے ہیں۔"

"جیسی اچھیا (مرضی) مہاراج کی" —— کمار نے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی اور خان دل ہی دل میں ایسے بیوقوف ہمدرد سے ملاپ پر ایک مرتبہ پھر سجدۂ شکر بجا لایا۔

○

کملا اس دوران برتن دھونے سے فارغ ہو چکی تھی۔ کمار نے ٹیوب ویل پر بنے ایک چھوٹے سے کمرے سے اُس کے لیے بستر نکال کر چارپائی پر بچھا دیا۔ وہ [illegible] چاہتا تھا کہ اُس کے معزز مہمان کی مدارت میں کسی بھی قسم کی کوئی کمی آئے۔ خان [illegible] کمال ہشیاری سے یہ باور کروا دیا تھا کہ "ماتا وشنو" کے مندر سے متعلق کچھ [illegible] اُس کے پاس موجود ہیں اور اگر ایسی کوئی بھی شے کمار کے گھر میں [illegible] تو وہ دنوں میں لکھ پتی بن جاتا۔

اس دوران ٹیوب ویل پر اکّا دُکّا لوگ گزرتے ہوئے کمار کی خیریت معلوم [illegible] رہتے! ابھی تک کسی نے خان کے متعلق دریافت نہیں کیا تھا۔ شاید [illegible] دیہاتوں کے لوگ تھے اور انہوں نے "پنڈت جی" کے ٹھاٹھ باٹھ ہی [illegible] کر لیا ہوگا کہ یہ کمار کے کوئی "خاص مہمان" ہیں اگر اس کے اپنے گاؤں

کا کوئی آدمی ہوتا تو وہ ضرور "پنڈت جی" کا جغرافیہ بھی معلوم کرتا جو انہوں نے کمار کو پہلے ہی سے سمجھا دیا تھا کہ اگر کوئی ان کے متعلق استفسار کرے تو اُسے یہی بتانا کہ مَیں تمہارے ایک پرانے پنڈت دوست کا چھوٹا بھائی ہوں اور ایک شادی کا پیغام دینے آیا ہوں۔

کملا کو اُس نے اس ہدایت کے ساتھ گاؤں کی طرف روانہ کر دیا تھا کہ وہ کسی سے خواہ مخواہ اس نئے مہمان کا ذکر نہ کرے۔ ابھی تک شاید اُس نے کملا کو پنڈت جی، کا مکمل تعارف نہیں کروایا تھا۔ دوپہر کے بعد جب کمار نے اُسے گھر لے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو خان نے فوراً معذرت کر لی۔

"ہم یہیں ٹھیک ہیں شریمان جی! رام رام کر کے وقت گزار لیں گے۔ ہمارا من بڑا بوجھل ہو رہا ہے اپنے پاپ (گناہ) کا پراشچت (کفارہ) ادا کیے بغیر ہمارا من ہلکا نہیں ہوگا ـــــ ہمیں یہیں رات گزارنے دیں۔" اُس نے کمار کو سمجھایا۔

"جیسی مرضی مہاراج کی" ـــــ کمار نے سرِ تسلیم خم کیا۔

اُس نے پنڈت جی کو کمرے کی چابی دے دی تھی۔ کمرے میں دو چار پائیاں ایک صراحی، پیتل کا لوٹا اور رامائن ایک اونچی جگہ پر ٹنگی ہوئی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی "امیت شرما جی" سیدھے رامائن تک پہنچے۔ پہلے دونوں ہا باندھ کر انہوں نے اُسے "ستکارا" پھر ہاتھوں میں پکڑ کر آنکھوں سے لگایا اور کے بعد دوبارہ وہیں ٹانگ دیا۔

"بس ہمارا سمے یہاں بہت اچھا گزرے گا۔ ہم تو یوں بھی شام کے بعد پا ہی کرتے ہیں۔" اس نے رامائن کی وہاں موجودگی پر اپنی بے پناہ خوشی کا اظ کر دیا۔

کمار نے کمرے کی چابی اُسے تھما دی اور خود گاؤں کی طرف چلا گیا۔ ٹیوب

اس نے بند کر دیا تھا۔ اِکا دُکا لوگ دُور دُور سے آتے جاتے رہے تھے، لیکن مقام شکر تھا کہ ابھی تک یہاں دیہات کی عورتیں کپڑے دھونے یا پھر کوئی نہانے کے لیے نہیں آیا تھا۔ بعد میں خان نے اس راز کی حقیقت کو بھی پا لیا؛ گاؤں کے لوگ کمار کے ٹیوب ویل پر اپنی عورتوں کو بھیجتے ہوئے گھبراتے تھے یوں بھی کوئی شریف عورت اس طرف پھٹکنے کی ہمت نہیں کرتی تھی۔



گاؤں سے واپسی پر کمار اُس کے لیے تازہ چائے کا گلاس بھر کر لے آیا۔ ایک چھوٹی سی پیتل کی بالٹی میں اُس نے دودھ الگ سے رکھا ہوا تھا اور لفافے میں موسم کے مطابق فروٹ بھی تھا۔

"اب ہم رات کا بھوجن نہیں کریں گے۔" خان نے اُسے اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا۔

"کیوں مہاراج! کیا غلطی ہو گئی مجھ سے" ـــــ؟ کمار گھبرا گیا۔

"کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔ ہم رات کو زیادہ سمے جاگ کر پوجا پاٹھ میں گزاریں گے۔ پر بھوجن کے ساتھ ٹھیک نہیں۔" خان نے اُسے تسلی دی۔

"ٹھیک ہے مہاراج" ـــــ کمار نے ہاتھ باندھے۔

اس نے مہاراج کو بتایا کہ بچوں کی وجہ سے وہ رات گھر گزارنے پر مجبور ہے۔ خان بھی یہی چاہتا تھا کہ فی الوقت وہ چلا ہی جائے۔ یوں بھی وہ جانتا تھا کہ "کملا" کے علاوہ اُس کی مجبوری اور کیا ہوگی۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ کمار اُسے کبھی اکیلا چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے گا۔

شام ڈھلتے ہی ٹھنڈک میں اضافہ ہونے لگا تھا۔ خان نے کمرے میں رکھی لالٹین روشن کر لی۔

"آپ اب جائیے ہماری پُوجا کا سمے ہو رہا ہے۔" اُس نے کُمار سے کہا۔

"ٹھیک ہے مہاراج ۔"

"صبح جلدی آجانا۔ ہم چاہتے ہیں کل شام تک گھر پہنچ جائیں۔ وہ لوگ پریشان ہو رہے ہوں گے۔" اُس نے کُمار کو اگلا پروگرام بھی سمجھا دیا۔

کُمار کے وہاں سے جاتے ہی اُس نے لالٹین کی لو خاصی گھٹا دی۔ کمرے کے اندر سے کنڈی لگائی اور لمبی تان کے لیٹ رہا۔ اِس دوران وہ چائے سے فراغت پانے کے بعد دودھ اور پھلوں سے بھی شوق فرما چکا تھا۔ کُمار کی حد سے بڑھی ہوئی عقیدت مندی نے اُسے ابھی تک سونے بھی نہیں دیا تھا۔ کیونکہ وہ مسلسل اس کا دماغ چاٹتا رہا تھا۔

اب جو فرصت نصیب ہوئی تو جیسے ساری تھکن دوبارہ عود کر آئی۔ آدھ گھنٹہ تک وہ نیند سے جنگ کرتا رہا۔ پھر اُس نے لالٹین بجھا دی اور لمبی تان کے سو رہا۔ وہ کب تک سوتا رہا؟ اِس کا احساس اُسے نہیں تھا۔

صُبح کُمار وقت مقررہ پر آیا تو وہ دیوانگی کی حد تک اس کا عقیدت مند ہو چکا تھا۔ اُس نے آتے ہی پنڈت جی کے چرن چھوئے۔ کملا اُس کے ساتھ حسبِ سابق تھالی اٹھا کر لائی تھی۔ اُس نے اپنے پتی دیو سے بھی زیادہ عقیدت کا مظاہرہ کیا اور آنکھ سے اشارہ کر کے مودب سی کھڑی ہو گئی۔

تعاقب

ہوٹل میں اپنی مخصوص میز پر وہ پچھلے آدھ گھنٹے سے براجمان تھا۔ یہاں لوگ اُسے اچھی طرح جانتے تھے اور اُس کی علمیت کی وجہ سے اِس کا احترام بھی کرتے تھے۔ منوہر لال اُس کا نام تھا۔ اور سارا محلّہ اسے "کامریڈ" کہہ کر پکارتا تھا۔ اس کی کمزوری سیاست سے زیادہ کیمونزم تھی لیکن حیرانگی کی بات یہ تھی کہ وہ کیمونسٹ پارٹی کا معمولی سا ممبر بھی نہیں تھا۔ جبکہ پارٹی کے ورکر اُسے "دیوتا" کا درجہ دینے لگے تھے۔

جب کبھی اس سے پارٹی والے عظیم انقلاب کے حصول کے لیے پارٹی میں شرکت کی درخواست کرتے۔ اُس کا ایک ہی جواب ہوتا ـــــ "فراڈ ہیں سب ـــــ سب فراڈ ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں یہ کیا خاک انقلاب لائیں گے ـــــ؟"

اور لوگ مطمئن ہو رہتے۔ واقعی وہ سچّا انقلابی تھا لیکن کیا مجال جو پولیس یا سی آئی ڈی میں اس کے خلاف ایک لفظ بھی کبھی لکھا گیا ہو۔ آج سے تین چار سال پہلے جب وہ اِس قصبے میں آیا تھا۔ تو اس کے متعلق بڑی عجیب عجیب افواہیں گشت کرنے لگی تھیں۔ خفیہ پولیس نے ایک عرصے تک اُس پر کڑی نظر رکھی تھی لیکن اب اُسے وہ لوگ پاگل سے زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں تھے۔

کامریڈ منوہر لال اسی ایک ہوٹل پر بیٹھا کرتا تھا۔ عموماً اس کے لیے کونے والی

میز خالی رہتی تھی اگر وہاں کوئی موجود بھی ہوتا تو اُس کی آمد پہ اُس کے احترام میں اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور کرسی اُس کے لیے خالی ہو جاتی۔

○

اُس روز کامریڈ نے حسبِ معمول پہلے آدھ گھنٹے سے اپنا لیکچر شروع کیا ہوا تھا اور لوگ بڑی عقیدت مندی سے اُس کے گرد اگرد چائے کی پیالیاں تھامے بیٹھے تھے جب ایک ناموس چہرہ اس چھوٹے سے ہوٹل میں نظر آیا۔

دو بڑے شہروں کے درمیان واقع ہونے کی وجہ سے اس قصبے میں مسافروں کی آمد و رفت لگی رہتی تھی۔ کسی نے اُس طرف توجہ نہ دی۔

اجنبی، منوہر لال کے سامنے والی میز پہ اس طرح بیٹھا تھا کہ کامریڈ کی نظریں اس کی تمام حرکات کا بخوبی جائزہ لے سکیں۔ اِس کے اندر داخل ہونے پہ کامریڈ نے ایک نظر اُس کے سر پہ بندھی پیلے رنگ کی پگڑی پہ ضرور ڈالی تھی لیکن چہرے سے کسی خاص ردِ عمل کا اظہار نہیں کیا تھا۔

کامریڈ کے سامنے بیٹھتے ہوئے اُس نے ایک مخصوص انداز سے زوردار انگڑائی لی۔ شاید سفر نے اُسے تھکا دیا تھا۔ کامریڈ نے اُسے انگڑائی لیتے ہوئے بھی دیکھا اور ایک مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پہ پھیل گئی۔ ہوٹل کا واحد بیرا جو مالک کا بھائی بھی تھا اس کے پاس آرڈر وصول کرنے آیا۔

"یار بڑی توڑ لگ رہی ہے سگریٹ کی۔ پہلے مجھے باہر سے "چار مینار" کی ڈبی تو لا دو۔" اُس نے یہ فقرہ اتنی اونچی آواز سے کہا تھا کہ کامریڈ منوہر لال چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"پھر چائے اور برفی لے آنا۔" اُس نے دس روپے کا نوٹ اُسے تھما دیا۔

"اچھا مہاراج جی۔" —— کہہ کر ہوٹل والے نے نوٹ پکڑ لیا اور سگریٹ لینے چلا گیا۔

○

"ادھر آجایئے آپ۔ میں بھی "چار مینار" ہی پیتا ہوں۔" کامریڈ نے اُسے مخاطب کیا۔

"اوہ! دھنّواد، دھنّواد" —— کہتا وہ کامریڈ کے پاس آ گیا۔

"کہاں جا رہے ہیں آپ؟"

"میں نے "موگا" جانا ہے۔ یہاں ایک کام کے لیے رُک گیا ہوں۔"

موگا کے نام پہ پھر کامریڈ کے کان کھڑے ہو گئے۔

"سگریٹ لیجئے آپ —— "چار مینار" سگریٹ خوب ہے۔ آپ شروع سے یہی برانڈ استعمال کر رہے ہیں؟" کامریڈ نے اِس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سگریٹ کی ڈبیا کھول کر اُس کی طرف سگریٹ بڑھا دیا۔

"نہیں۔ میں تو پہلے "بیڑی" پیا کرتا تھا۔" نووارد نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہاں موجود باقی لوگ اُنہیں گفتگو میں مصروف دیکھ کر اب ایک ایک کرکے "اچھا کامریڈ بھیا نمسکار" کہہ کہہ کر وہاں سے اُٹھنا شروع ہو گئے تھے۔

"آئے کہاں سے ہیں آپ؟" —— کامریڈ نے آخری "کوڈ" کا تبادلہ بھی کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"پہاڑوں کے پار والی بستی سے" —— اجنبی نے اس مرتبہ آواز قدرے نیچی رکھی تھی جو سوائے کامریڈ کے اور کسی تک نہ پہنچ سکی۔

"اوہ" —— کامریڈ کے ہونٹ گولائی اختیار کر گئے اور وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔

"ظاہر ہے تو ہے نا اُس طرف" —— نہ چاہتے ہوئے بھی یہ فقرہ اُس کے مُنہ

سے نکل گیا۔

"ہاں"۔۔۔ اجنبی نے مختصر سا جواب دیا۔

اس دوران ہوٹل والا اُس کے لیے سگریٹوں کی ڈبیا لے کر آگیا تھا۔ دونوں اُسے اپنی طرف آتے دیکھ کر خاموش ہو گئے۔

"آپ میرے ساتھ چائے ضرور پیجیئے"۔۔۔ اجنبی نے کامریڈ سے بڑے عاجزانہ لہجے میں درخواست کی۔

"ہاں! ہاں! ضرور پیوں گا لیکن میزبان مَیں ہوں۔ آپ تو یہاں اجنبی ہیں۔"

کامریڈ شاید "پہاڑوں کے پار والی بستی" میں کھویا ہوا تھا۔ جب کبھی کوئی اُس طرف سے آتا تھا تو اُس کی جذباتی حالت کچھ ایسی ہی ہو جاتی تھی۔ وہ بڑا منجھا ہوا ایجنٹ تھا لیکن اپنے وطن کی سمت سے آنے والی ہوا بھی اُسے تڑپا دیا کرتی تھی۔

کامریڈ نے ہوٹل والے کو اشارہ کر دیا تھا کہ وہ اجنبی مسافر کے پیسے لوٹا دے کیونکہ وہ اس کا مہمان ہے اور یہاں کسی کی مجال نہیں تھی کہ "کامریڈ بھیّا" کے حکم کو [illegible]

"آئیے باہر چل کر کھلی فضا میں بیٹھیں"۔۔۔ اجنبی نے خود ہی تجویز پیش کی۔

"اوہ! ہاں، ضرور، ضرور۔" کامریڈ ابھی تک شاید اُسی بستی میں گھوم رہا تھا۔



دونوں باتیں کرتے باہر آگئے۔ اُن کا رُخ بازار سے باہر اڈے کی طرف جانے والی سڑک کی طرف تھا۔ بازار کے خاتمے پر بنے ایک چھوٹے سے پارک میں جو بالکل ویران نظر آ رہا تھا۔ دونوں بیٹھ گئے۔

انہوں نے یوں تو ہوٹل ہی میں "کوڈ ورڈز" کا تبادلہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کو اپنی شناخت سے مطمئن کر دیا تھا پھر بھی احتیاطاً یہاں بھی اُنہوں نے ایک دوسرے کو چیک کر لیا۔

اجنبی نے ابھی تک اُسے اپنا کوئی نام نہیں بتایا تھا، نہ ہی کامریڈ منوہر لال نے ابھی تک اُس کا نام پوچھنے کی زحمت کی تھی۔۔۔ دونوں نے ابھی تک صرف موسم کے متعلق ہی گفتگو کی تھی۔

اچانک ہی اجنبی نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک بند لفافہ اُسے تھما دیا۔

"مجھے اب چلنا ہوگا"۔۔۔ اُس نے کامریڈ کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"ہاں۔ آپ چلیں۔" کامریڈ نے بادلِ نخواستہ اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

"خدا حافظ"۔۔۔ نووارد نے بڑی آہستگی سے کہا۔

"خدا حافظ"۔۔۔ کامریڈ کی آواز قدرے بھرّائی ہوئی تھی۔

نووارد سیدھا چلتا چلا گیا۔ کامریڈ وہیں بیٹھا رہا۔ باغ کے دروازے کے قریب ایک لمحے کے لیے وہ رُکا۔ مڑ کر اُس نے کامریڈ کی طرف دیکھا اور ہاتھ ہلا کر آگے بڑھ گیا۔

اُس کے باغ سے باہر نکلتے ہی کامریڈ نے بڑی بیتابی سے لفافہ چاک کیا۔ اندر سے ایک پیلے رنگ کا کاغذ کا ٹکڑا برآمد ہوا۔ جس پر مختصر الفاظ لکھے ہوئے تھے۔

"[illegible] وی بدل گئی ہے۔۔۔ اب پی۔ ایم نمبر لوٹ کرنا ہے" نیچے ایک خاص [illegible] دستخط تھے۔

کاغذ ہاتھ میں پکڑے وہ چند لمحے کچھ سوچتا رہا۔ پھر دوبارہ کاغذ پر نظریں دوڑا [illegible] جیب سے ماچس کی ڈبیا نکالی اور کاغذ اور لفافے کو جلا کر اُس کی راکھ [illegible] مسل ڈالی۔

گھڑی پر نظریں دوڑا کر اُس نے دل ہی دل میں ایک اندازہ لگایا اور اٹھ کر ٹہلتا ہوا بازار کی طرف آگیا۔ اِس مرتبہ اُس کا رُخ ہوٹل کے بجائے بازار کی دوسری سمت بنے اُس محلّے کی طرف تھا جہاں وہ ایک بڑے احاطے میں بنے بے شمار کوارٹروں میں سے ایک کوارٹر میں رہتا تھا۔ اِس بڑے احاطے میں رہنے والے تمام لوگوں کو اُس نے قریباً ایک ہی کنبے کا رُکن بنا دیا تھا اور سب لوگ الگ الگ رہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کو اپنے گھر کا فرد سمجھتے تھے۔

"کیا بات ہے بیٹا! آج بڑی جلدی گھر آ گئے"۔۔۔۔ اُس کے ساتھ والے کوارٹر میں رہنے والی جانکی دیوی نے پوچھا۔

"بس یونہی ۔۔۔۔ آج بہن بہت یاد آ رہی تھی"۔ اُس نے جانکی دیوی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

"تو بچّہ مل آنا اُس سے"۔

"ہاں موسی ۔۔۔۔ مَیں سوچتا ہوں۔ آج شام کو چلا جاؤں ۔۔۔۔" کہہ کر وہ اپنے کوارٹر میں جا گھسا۔

○

کامریڈ منوہر لال کے کچھ رشتہ دار ابھی زندہ تھے۔ اُس سے اکثر لوگ ملنے بھی آیا کرتے تھے اور کبھی کبھی وہ بھی اُن سے ملنے چلا جایا کرتا تھا۔ آج بھی وہ اپنی اُن سے ملنے جا رہا تھا اور اُس احاطے کے لوگ اُس کی چند روزہ جدائی کے تصور ہی سے پریشان ہو رہے تھے۔

"گھبراؤ نہیں ۔۔۔۔ مَیں کوئی مرنے نہیں جا رہا۔ دو تین روز میں لوٹ آؤں گا"۔ اُس نے سب کو پیار سے ڈانٹا اور اپنا چھوٹا سا اٹیچی کیس پکڑ کر باہر آ گیا۔ لاری اڈے تک ایک دو آدمی اُسے چھوڑنے جا رہے تھے۔ جنہیں اُس نے زبردستی واپس لوٹا دیا تھا۔

اڈے سے ٹکٹ خرید کر جب وہ لاری میں سوار ہو رہا تھا تو اُس کی جہاندیدہ آنکھوں نے اُس سُرخ پگڑی والے سکھ کی حرکات کا بخوبی جائزہ لے لیا تھا جس نے اپنی شناخت اُس سے خفیہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی تھی۔

○

ثاقب کا یہ کھیل اُس کے لیے نیا یا انوکھا نہیں تھا ۔۔۔۔ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی تھا اور ایسی کسی حرکت کی نشاندہی اِس کی چھٹی حِس کر دیا کرتی تھی۔ اگرچہ اب مقامی پولیس اور سیکورٹی کو اُس کے بھارتی ہونے کا یقین ہو چلا تھا لیکن وہ اب تک آج بھی بخوبی محسوس کر رہا تھا کہ پچھلے دو تین ماہ سے جب کبھی اُس نے احاطے سے باہر جانے کی کوشش کی۔ اُس کی نگرانی ضرور کی جاتی تھی۔

مقامی خفیہ پولیس کے ایک انسپکٹر نے، جو اس کے مداحوں میں شامل تھا اُسے اطلاع دی کہ حکومت کو اُس کے "نکسل باڑی" ہونے پر شک ہے۔ اِس سلسلے میں یوں

بھی اُسے دو تین مرتبہ مختلف حیلوں بہانوں سے بلا کر حکومت نے اُس کی تفتیش کی تھی اُس نے اپنے اعمال سے یہ ثابت کیا تھا کہ صرف "زبان" کی حد تک انتہا پسند کمیونسٹ ہے، لیکن اس طرح تو خفیہ پولیس بھی اُن کی جان چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔

"آج کا یہ تعاقب بھی شاید اِسی سلسلے کی کڑی ہو" اُس نے سوچا۔

لاری چل پڑی اُس نے ٹکٹ تو کسی اور شہر کا خریدا تھا، لیکن راستے میں ایک سٹاپ پر اچانک ہی اُتر جانے کا فیصلہ کر لیا — یہ علاقہ "بھوانی ماں" کا علاقہ کہلاتا تھا اور یہاں کا "بھوانی مندر" اپنی پُوجا کے لیے سارے پنجاب میں مشہور تھا۔ دُور دُور سے یاتری یہاں نذریں اُتارنے آیا کرتے تھے۔

اُس سے دو سیٹیں پیچھے بیٹھا خفیہ پولیس کا اہلکار اُس کے اچانک اُترنے پر پہلے تو چونکا پھر اُس کی باچھیں کِھل گئیں۔ اُس نے سوچا آج محنت راس آگئی اور ضرور وہ یہاں کامریڈ منوہر لال کا کوئی "خصوصی تعلق" تلاش کر لے گا۔

"بھوانی ماں" کے سٹاپ پر لاری سے قریباً ایک چوتھائی سواریاں اُتر گئی تھیں خفیہ پولیس کا سکھ اہلکار بظاہر خود کو حالات سے مکمل لاتعلق رکھنے کی شاندار ایکٹنگ کر رہا تھا لیکن اصل میں بُری طرح بوکھلا چکا تھا اور اس بوکھلاہٹ کے نتیجے ہی میں اُس نے اپنا پاؤں سامنے سیٹ پر بیٹھی ایک موٹی عورت کے پاؤں پر رکھ دیا۔ جس نے اونگھتے ہوئے اپنی ٹانگیں سیٹوں کے درمیانی راستے میں پھیلا رکھی تھیں۔

عورت شاید ابھی تک نیم خوابی کی کیفیت کا شکار تھی۔ اچانک پاؤں پر دباؤ پڑنے سے اُس نے گھبرا کر اتنی زور سے چیخ ماری کہ تمام سواریاں چونک کر اس طرف دیکھنے لگیں۔ عورت نے اس اثنا میں دروازے کی طرف بڑھتے سکھ کو دیکھ لیا تھا جس سے نادانستگی میں یہ حرکت سرزد ہوئی تھی۔

موٹی عورت غصے اور تکلیف کے مارے اچانک پہلے تو اُٹھ کر کھڑی ہوئی

[illegible] کو کوستے ہوئے دھڑام سے سیٹ پر گرتے ہوئے اپنا پیر پکڑ لیا۔ بس کی [illegible] سواریاں "بے چاری مظلوم عورت" کا ساتھ دے رہی تھیں اور انہوں نے [illegible] لعن طعن شروع کر دی۔

بس کی تمام سواریوں کی طرف سے باجماعت ہونے والی پھٹکار نے اُسے [illegible] آسمان پر چڑھا دیا تھا لیکن اس نے خاموش رہنے ہی میں عافیت جانی۔ وہ سمجھتا [illegible] اُن لوگوں کو اپنی "سرکاری شناخت" کروائے گا وہ مار مار کر اس کا بھرکس [illegible] ہوں گے۔

[illegible] اُسے گھُلائے دے رہی تھی کہ شاید کامریڈ پھر ہاتھ سے نکل گیا۔ لیکن [illegible] میں جان آگئی۔ جب بس سے نیچے اُترتے ہی اُس نے سڑک کے [illegible] ایک پان سگریٹ کی دُکان پر منوہر لال کو سگریٹ نوشی میں مصروف پایا۔ [illegible] ایک ہاتھ میں "کمپا کولا" کی بوتل پکڑ رکھی تھی اور کسی دوسری دُنیا میں گم [illegible] دے رہا تھا۔

[illegible] دل ہی دل میں بہت خوش ہوا اور سجدہ شکر بجا لایا۔ کامریڈ نے اُسے دیکھ [illegible] کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اُسی اطمینان سے اُس نے بوتل ختم کی اور سگریٹ [illegible] دو چار لمبے لمبے کش لے کر اُسے پاؤں کے نیچے پھینک کر مسل دیا۔ اب اُس [illegible] "بھوانی مندر" کی طرف تھا۔ دوسرے یاتریوں کی طرح وہ بڑے احترام سے چلتا [illegible] پہنچا۔

[illegible] کے پہلو پر موجود تالاب میں اُس نے بھی دوسرے لوگوں کی طرح اشنان [illegible] باہر موجود ناریل بیچنے والے سے دو ناریل خریدے اور مندر میں داخل ہو [illegible] اہلکار بڑی حیرت سے یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ اُس کی اطلاعات کے بالکل برعکس [illegible] دھارمک قسم کا ہندو تھا۔ اِس کے طریقہ ہائے عبادات سے بھی یہی

ظاہر ہو رہا تھا جیسے وہ کسی پروہت کی اولاد ہے اور ایسی عبادات اُس کا روزانہ کا معمول ہیں۔

خفیہ پولیس کے اہلکار کو بھی بادلِ نخواستہ اُس کے ساتھ ہی مندر میں داخل ہونا پڑا۔ کامریڈ منوہر لال کا خشوع وخضوع اور انہماک دیکھ کر وہ اُسے بجائے نکسل باڑی کے صدیوں پُرانا "تپ دھاری" سمجھنے لگا تھا۔ جب کامریڈ پجاری سے پرشاد لے کر واپس آیا تو سکھ اہلکار نے اُس کا پیچھا کرنے کی بجائے واپس لوٹ جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"درگا ماں" کے سٹاپ سے اپنے ٹھکانے تک وہ اپنے افسران بالا کو گالیاں دیتا آیا تھا کہ انہوں نے اُس کا وقت ضائع کروانے کے لیے خوانخواہ اُسے ذلیل کروایا۔ اگلے روز جب آفس پہنچ کر اُس نے "ڈائری" لکھی تو کامریڈ منوہر لال کو زبردست "دھارمک ہندو" قرار دیا اور جو لوگ اُسے "نکسل باڑی" بنانے پر تُلے ہوئے تھے اُن کے بارے میں اچھی خاصی قصیدہ خوانی کر دی۔



مندر سے باہر آ کر منوہر لال نے سکھ کو واپسی کا راستہ ناپتے دیکھ لیا تھا۔ بے اختیار ایک مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر رینگ گئی۔ وہ نپے تُلے قدموں سے چلتا "درگا ماں" بس سٹاپ تک پہنچ گیا۔

یہاں سے الوہر پہنچنے تک اُس نے تین مرتبہ بسیں بدلی تھیں حالانکہ وہ اگر چاہتا تو سیدھے راستے سے بھی یہاں آ سکتا تھا۔ الوہر کے بس سٹاپ پر اُتر کر اُس نے شہر کے چھوٹے سے بازار کا رُخ کیا۔ اور ایک شراب کے ٹھیکے کے سامنے رک کر کھڑا ہو گیا۔ ایک بوتل خرید کر اُس نے اپنے تھیلے میں ڈالی اور بڑے اطمینان سے چلتا ہوا شہر کے واحد بڑے بازار کے کونے پر بنے ایک آشرم کی طرف چل دیا۔

شام ڈھل رہی تھی جب وہ آشرم کے دروازے پر پہنچا۔ اندر "بھجن کتھا" اپنے نقطۂ عروج کو چھو رہی تھی۔ وہ ان سب باتوں سے لاتعلق سا آشرم کے رہائشی حصے کی طرف بڑھنے لگا۔ پندرہ بیس کوٹھڑیاں ایک قطار میں بنی ہوئی تھیں۔ کوٹھڑی کاروں کی اس قطار کے سامنے سے گزر کر وہ آخری کونے والے کمرے کی طرف بڑھا۔

یوں دکھائی پڑتا تھا جیسے وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف ہو۔ بھجن کتھا کی وجہ سے آشرم کا کوئی سیوادار وہاں نظر نہیں آ رہا تھا۔ کامریڈ نے ایک لمحے کے لیے رک کر کچھ سوچا پھر کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اندر ایک کونے میں سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں —— کوئی بھی شخص باہر سے عمارت دیکھ کر یقین نہیں کر سکتا تھا کہ اس کمرے میں کوئی خفیہ راستہ اوپر جانے کا بھی ہوگا۔

سیڑھیوں کے ذریعے بغیر آواز پیدا کیے وہ اُوپر کوٹھے پر چلا گیا۔ کوٹھے پر چارپائیاں بھی بچھی تھیں۔ ایک کونے میں بچھی چارپائی پر اُسے ایک پجاری لیٹا نظر آیا۔

"ارے منوہر تم!" اُسے پجاری کی آواز سُنائی دی۔

"ہاں میں ہوں کاکا!" —— اُس نے پجاری کو جواب دیا۔

"کب آئے؟" پجاری نے ایک اور چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"آج ہی اور ابھی!"

"کیا بات ہے اس مرتبہ بڑی دیر لگا دی ——" دوران گفتگو پجاری اُس کے ہاتھ میں پکڑے تھیلے پر مسلسل نظریں گاڑے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا رہا۔ کامریڈ نے اس کا مدعا بھانپ لیا تھا۔ اُس نے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور ایک لفافے میں لپٹی بوتل اُسے تھما دی۔ یہ وہی بوتل تھی جو اُس نے اُسی شہر کے ایک گھٹیا سے شراب خانے سے تھوڑی دیر پہلے خریدی تھی لیکن بوتل کا لیبل اس دوران صاف ہو چکا تھا۔

"لے کاکا کیا یاد کرے گا۔ تیرے لیے خاص طور سے "پہلے توڑ" کی لایا ہوں سالنیوں

کو ایک ہفتہ پہلے بتانا پڑتا ہے۔"

"ارے جیتا رہ بھتیجے! تیری ان ہی اداؤں نے مار ڈالا ہے ہمیں ـــــ" اس نے ندیدے بچوں کی طرح جھپٹ کر اُس کے ہاتھ سے بوتل چھین لی ـــــ "ابھی آیا" ـــــ کہہ کر وہ ایک کونے میں بنی کوٹھڑی کی طرف بڑھ گیا۔

یہ کوٹھے پہ بنا واحد کمرہ تھا اور شاید اُس کا ذاتی کمرہ۔ اُس نے کمرے میں پہنچ تک بیسوں مرتبہ بوتل کو چوما تھا اور اُسے اپنے کمرے میں چھپا کر باہر آ گیا۔ لیکن پھر تیزی سے اندر گیا۔ اس مرتبہ وہ باہر آیا تو ہاتھوں میں بستر تھامے ہوئے تھا۔ اُس نے ایک خالی چارپائی پہ بستر لگا دیا اور منوہر لال کو وہاں بیٹھنے کو کہا۔

منوہر لال بھی "نہ نہ" کرتا وہاں جا بیٹھا۔

اُسے وہاں بٹھا کر پجاری جھومتا ہوا نیچے اُترا اور چند منٹ بعد اُس کی واپسی ایک نوعمر لڑکے کے ساتھ ہوئی۔ جس نے ہاتھوں میں ٹرے پکڑ رکھی تھی جس میں تازہ کھانے کی اشتہا انگیز خوشبو منوہر لال کی بھوک کو چمکانے کے لیے کافی تھی۔

"بھجن کیرتن" بدستور جاری تھی لیکن وہ کھانا کھاتے ہی اُسی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اٹھا اور بستر سمیت پجاری کے کمرے میں جا گھسا۔ رات گئے جب "پوجا" سے فارغ ہو کر پجاری جی اُوپر آئے تو اُن کے کمرے میں منوہر لال لمبی تان کر سو رہا تھا۔ پجاری جی نے ایک نظر اُس کے چہرے پہ ڈالی۔

"جیتے رہو بھتیجے! بھگوان تمہیں لمبی عمر دے کتنا خیال رکھتے ہو اپنے چچا کا" اُس نے دل ہی دل میں کہا۔ اور بوتل ہاتھ میں پکڑے بڑی آہستگی سے باہر آ گیا۔



صبح اُٹھ کر سب سے پہلے کامریڈ نے اشنان کیا۔ اُس کے لیے پجاری جی نے مندر پہ ایک غسل خانے کو تالا لگوا کر رکھا تھا جو کامریڈ کو دیکھتے ہی رات والے …

لڑکے نے کھول دیا ـــــ اشنان سے فارغ کر کامریڈ بادل نخواستہ "بھجن کیرتن" میں شمولیت کے لیے چلا گیا۔

"کتھا" کے خاتمے پر اس نے حسبِ روایت پرشاد بھی حاصل کیا۔ اور پجاری کے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ پجاری ابھی تک نیچے مصروف تھا، لیکن اس نے اپنے "معزز مہمان" کو بھلایا نہیں تھا۔ وہی نوعمر لڑکا کامریڈ کی آمد کے تھوڑی ہی دیر بعد اُس کے لیے گرم گرم پوریاں حلوہ اور چائے لے کر آیا۔

"پجاری جی ابھی آتے ہیں ـــــ آپ ناشتہ کیجیے۔" اُس نے بڑے مؤدب لہجے میں کامریڈ کو مخاطب کیا۔

"ٹھیک ہے ـــــ جاؤ تم" ـــــ اس نے لڑکے کی طرف دیکھے بغیر بڑی شانِ بے نیازی سے جواب دیا۔

ناشتہ کرتے ہوئے وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اُس کی اطلاع کے مطابق اس "پارسل" بہت احتیاط سے "پوسٹ" کیا گیا تھا لیکن ابھی تک وہ اپنی جگہ نہیں پہنچا تھا۔ اس کے ساتھ ہی آر۔وی" بھی بدل دی گئی تھی۔ اُسے تشویش صرف اتنی تھی؛ کہ کہیں "پارسل" غلط ہاتھوں میں نہ چلا گیا ہو۔ کیونکہ اُن لوگوں نے بہت جان سوزی کے بعد یہ "راستہ" تلاش کیا تھا۔

ایک بات تو صاف ظاہر تھی کہ؛ "محفوظ راستے" پر سے کسی "پارسل" کا گم ہو جانا اُس کی اپنی غلطی سے بہت کم ممکن تھا ضرور اس میں کسی "ڈبل کراس" کا ہاتھ تھا اور اُن کے درمیان ـــــ کسی "ڈبل کراس" کی موجودگی ایک ہی کے لیے نہیں سب کے لیے … اور تباہی کا باعث بھی بن سکتی تھی۔

کچھ بھی تھا اُسے بہرحال ابھی صرف "دیکھنا اور انتظار کرنا" تھا۔



پنڈت جی کے منع کرنے کے باوجود کمار بہ ضد تھا کہ وہ بھی بس سٹاپ تک اُن کے ساتھ ضرور جائے گا ــــ اور جب وہ ساتھ ہو ہی گیا تو چلتے چلتے خان نے اُسے ٹٹولا، "آپ کا گاؤں بڑا خوبصورت ہے۔ ہم تو یہی سمجھے تھے کہ راجستھان کا یہ علاقہ صحرا ہوگا۔"

"مہاراج جی! آپ تو پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ آپ کو علم نہیں راجستھان کا تو بس نام ہی ہے ــــ یہ سارا گنگا نگر تک کا علاقہ پنجاب میں ہے ــــ صدقے جائیے ہماری سرکار کے جس نے پنجابی صوبے کا نشٹ مارنے کے لیے اُس کے ٹکڑے کر دیے۔ چنڈی گڑھ تو گیا ہی تھا۔ ہریانہ میں بھی خاصا علاقہ شامل کر دیا اور اس طرف ڈنڈی مار کر گنگا نگر بھی لے لیا ــــ اب لے لیں سکھ پنجابی صوبہ ــــ!!" کمار خاصا سمجھدار نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"ہم نے تو پہلی ہی نظر میں دیکھ لیا تھا کہ آپ بڑے کام کے آدمی ہیں" ــــ خان نے اُس کی سیاست سے نجات پانے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"دھنّواد" ــــ کمار نے انکساری سے کہا۔

"کمار جی! جب ہم کسی کو اپنا سجن بنا لیتے ہیں تو اُس سے دل کی بات چھپایا نہیں کرتے" ــــ اُس نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔ "دھرم کرم اپنی جگہ ــــ اور دھندا اپنی جگہ۔"

اپنے آخری فقرے کا اُس نے بڑا خوشگوار ردّعمل کمار کے چہرے پر دیکھا۔ اُس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

"بالکل بجا کہا مہاراج"

"ہمارے ماتا پِتا نے آج تک دھرم کی ٹھیکیداری کر کے کمایا ہی کیا ہے؟"

"بالکل بجا کہا مہاراج!" ــــ کمار نے اگلی بات اُس کے منہ سے نکلوانے کے لیے اس کی مزید حوصلہ افزائی کی۔

"سچی بات تو یہ ہے بھیّا نرے دھرم سے پیٹ نہیں بھرتا۔ اب تم سے کیا پردہ ہم تھوڑا بہت دھندا بھی کرتے ہیں۔ کبھی کبھی اُدھر سرحد پار سے کوئی مال اِدھر منگوا لیا اور کبھی اِدھر سے اُدھر بھیج دیا۔ مہینے میں ایک آدھ چکّر بھی لگ جائے تو چاندی ہو جاتی ہے!"

اُس کی بات مکمل ہوتے ہی کمار نے زور سے اُس کا ہاتھ دبا کر گرمجوشی کا اظہار کیا ــــ "میں تو پہلے ہی سمجھتا تھا مہاراج جی! میری ساری زندگی انہی دھندوں میں گزری ہے لیکن آپ پنڈت جی مہاراج ہوتے کُھل کر کہہ نہ سکا۔"

"آدمی تو بڑے سیانے ہو ــــ کمار جی! ہم نے بھی یونہی تمہیں نہیں چُن لیا۔" [illegible] ہی مسکرائے۔

دونوں کھیتوں کے بیچوں بیچ چلے جا رہے تھے۔ سڑک یہاں سے نزدیک ہی تھی۔ "[illegible] یہاں سے پیدل ہی چلنا چاہیئے ــــ باتیں بھی کرتے جائیں گے!" خان نے تجویز [illegible] کی۔

"ٹھیک ہے مہاراج! بالکل ٹھیک ہے۔" کمار تو جیسے اُس کا دُم چھلا بن کر رہ گیا تھا۔ اُس نے کچھ سوچ کر ایک نیا راستہ پکڑ لیا۔

"[illegible] سکھدیو کا میں نے ذکر کیا تھا وہ ہمارا کچھ مال لے کر بھاگ گیا ہے۔ [illegible] تھا بس ہم نے ہی اعتبار کر کے غلطی کی۔ خیر! بچ کر تو بیٹا جا نہیں سکتا۔ سُنا [illegible] کہ "گاؤں کے نزدیک ہی کہیں پچھلے دنوں نظر آیا تھا۔ اِسی اطلاع پر ہم [illegible] اس طرف ــــ کمار جی! آدمی تم بڑے جی دار ہو اور سمجھدار بھی۔ سچی بات [illegible] اس علاقے میں تم جیسے کھرے بندوں کی تلاش ہی رہتی ہے۔ اگر چاہو

تو ہم تمہیں دِنوں میں لکھ پتی بنا دیں گے ——" آخری بات کہہ کر خان نے اُس کا ہاتھ بھی گرمجوشی سے دبا دیا تھا۔

"مجھے ہمیشہ اپنا وفادار پائیں گے مہاراج —— کتوں سے بھی زیادہ وفادار"۔ جوشِ جذبات سے کمار کی آواز کانپنے لگی تھی۔

خان چلتے چلتے اچانک رُک گیا۔ اُس کا ہاتھ اپنی قمیص کی جیب میں رینگ گیا اور باہر نِکلا تو نوٹوں کی ایک گڈی اُس میں لہرا رہی تھی۔ کمار کی رال ٹپک رہی تھی اور ندیدے بچّوں کی طرح اس کی آنکھیں نوٹوں پر جمی تھیں۔ سو سو کے پانچ نوٹ گڈی سے الگ کر کے خان نے باقی نوٹ جیب میں ڈال لیے —— اُس نے کمار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور پانچوں نوٹ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیے ——

"ہم یاروں کے یار ہیں کمار جی! یہ صرف ہمیں ایک رات ٹھہرانے کی قیمت ہے —— اگر سیدھی طرح چلتے رہو گے تو ساری زندگی عیش میں گزرے گی"۔ اِس نے اپنا مُنہ کمار کے کان کے قدرے نزدیک کر لیا تھا —— "اِس گروہ میں بڑے بڑے کروڑپتی اور افسر شامل ہیں لیکن کوئی کسی کے معاملے میں دخل نہیں دیتا —— کمار جی! ہمارے ہاتھوں میں پہنچ کر ہر چیز محفوظ ہو جاتی ہے —— پولیس کبھی تمہاری ہوا کی طرف بھی نہیں دیکھے گی —— لیکن شرط ایک ہے"۔

"کہ کہ کیا مہاراج" —— کمار کا چہرہ شدّتِ جذبات سے سُرخ ہو رہا تھا۔ یہ پانچ سو روپیہ اُس کے نزدیک پانچ لاکھ کے برابر تھا۔ اُس نے واقعی زندگی میں کبھی کبھار ہی اتنی بڑی رقم دیکھی تھی —— "کبھی یہ تصور بھی نہ کرنا کہ ہم سے غدّاری کر کے تم بچ جاؤ گے —— مَیں نے کہا نا —— ہمارے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔ ہم جتنے اچھے دوست ہیں اُتنے ہی بُرے دُشمن"۔

"ایسا کبھی نہ ہو گا مہاراج! مَیں بھی جاٹ کا بچّہ ہوں۔ جو زبان سے کہہ دیا سو کہہ دیا

[illegible] کٹ جائے پر زبان نہیں کٹے گی"۔

"شاباش" —— خان نے اُس کی پیٹھ پر تھپکی دی۔

"مجھے کرنا کیا ہو گا؟" اُس نے بے چینی سے پوچھا۔

"کچھ نہیں —— بس عیش کرو اور پیسے کماؤ" —— خان نے بڑے پرسکون لہجے میں

[illegible]

"پھر بھی مہاراج آخر کوئی سیوا تو کرنی ہی ہو گی"۔

"ہاں! جیسے آج میں اچانک تم سے ملا ہوں۔ کبھی کبھی کوئی "مہمان" اسی طرح دن یا [illegible] کسی سمے میں تمہارے پاس آیا کرے گا —— اپنی پہچان کروانے کے لیے وہ [illegible] سامنے میرا نام لے گا۔ بس اتنا کافی ہے —— وہ تمہارے پاس ایک آدھ دن [illegible] گزارے گا اور چلا جایا کرے گا —— لیکن ہر آنے والا تمہاری جھولی بھر جایا کرے گا [illegible] ذرا آنکھیں اور کان کھُلے رکھا کرو۔ علاقے میں اِردگرد جو کچھ سکیورٹی والے کریں [illegible] رکھنا تمہارا کام ہے —— تمہارا فرض ہو گا کہ اپنے کسی آدمی کی ہوا بھی سکیورٹی [illegible] لگنے دو"۔

"ہاں مہاراج —— یہ بھی کوئی کام ہے" —— وہ خوشی سے دیوانہ ہوا جاتا تھا۔

[illegible] اتنے سے کام کا معاوضہ بھی ہزاروں روپے ملا کرے گا۔ اور ہاں جب کبھی [illegible] کرنے کو چاہے تو ہمیں اشارہ کر دینا —— بھارت کے جس بڑے شہر کی [illegible] ہم تمہیں سیر کروائیں گے اور باقی سب کچھ بھی —— ہاں ایک بات اور [illegible] کسی آدمی کو جو تم سے ملنے آئے کبھی شراب اور عورت کے چکّر میں نہ [illegible] اُس کے سامنے کبھی خود اِن دونوں کا نام لینا۔ اس کے لیے الگ سے [illegible] ہو گا۔ ہم کام کے دوران کوئی غیر ذمّہ دار حرکت برداشت نہیں کرتے"۔ خان [illegible] گرفت میں لے لیا تھا۔

"آپ کا ایڈریس کیا ہوگا مہاراج ـــ؟" اُسے کام کی بات تو اب یاد آئی تھی۔

"کوئی نہیں ـــ ہم میں سے کسی کا کوئی ایڈریس نہیں ہوتا ہم لوگ خود ہی تم سے رابطہ قائم کر لیا کریں گے۔"

"اگر کوئی بات آپ تک جلدی پہنچانی ہو؟" ـــ کُمار عقلمند نظر آنے کی کوشش کرنے لگا۔

"کہا نا کہ ہمارا آدمی تم سے ملتا رہے گا ـــ ہم ہفتے یا پندرہ دن میں ایک آدھ بار تم سے رابطہ کیا کریں گے ـــ جب آہستہ آہستہ تم اپنا اعتماد قائم کر لو گے اور ہمارے زیادہ نزدیک آجاؤ گے تو پھر اس کی ضرورت بھی باقی نہیں رہے گی ـــ دیکھو کُمار جی! سب کچھ ہو جائے گا لیکن دھیرے دھیرے ـــ زیادہ گرم گرم کھانے کی کوشش میں اپنا مُنہ نہ جلا لینا ہاں ـــ، ہمیں بھاڑے کے ٹٹو تو یہاں ہزاروں مل جاتے ہیں۔ ہم کسی سے بھی مدد لے سکتے ہیں لیکن ہمارا اصول ذرا الگ ہے۔ بس میرا من تم پر آ گیا اور مَیں نے تمہیں منتخب کر لیا ـــ اگر ہماری باتوں سے اتفاق ہو تو ہاں کرنا ـــ ورنہ کوئی زبردستی نہیں۔ مَیں تمہیں اور پیسے بھی دے دوں گا اور تمہاری ضرورت بھی پوری کرتا رہوں گا۔ کیونکہ مَیں نے تمہارا نمک کھا لیا ہے لیکن ایک دفعہ جب تم دھندے میں ہمارے ساتھی بن جاؤ گے تو پھر ہمارے بتائے ہوئے اصولوں پر عمل کرنا ہوگا ـــ ورنہ موت کسی بھی لمحے تمہیں آ لے گی۔"

"مَیں بچّہ نہیں ہوں مہاراج۔" کُمار نے سرِ تسلیم خم کیا۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ وہ مختلف پگڈنڈیاں مُڑتا چلا جا رہا تھا۔ باتوں ہی باتوں میں اُنھیں وقت کا اندازہ بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ یوں بھی خان نے اتنی اہم اور دلچسپ گفتگو شروع کر رکھی تھی کہ کُمار کے لیے زمان و مکان کا احساس بھی ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس کا جی چاہتا تھا کہ اسی طرح پنڈت جی اُس کے لکھ پتی ہونے کی باتیں کرتے رہیں۔

اُس نے کھیتوں میں ایک ایسا راستہ اختیار کیا تھا کہ دو ڈھائی گھنٹے پیدل چلنے کے بعد خان کو شہر کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس دوران وہ کسی بھی چونگی یا چیک پوسٹ کے نزدیک سے نہ گزرے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں اُنھوں نے تقریباً پانچ میل کا سفر طے کر لیا تھا۔ راستے میں شاید ہی کہیں کوئی ان کے قریب سے گزرا ہو۔ خان نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کُمار میں ایک اچھے "گائیڈ" کی تمام صلاحیتیں موجود ہیں اور وہ ایسے راستوں سے بھی آگاہ تھا جو اُس کی دانست میں محفوظ راستے تھے ـــ ایسے ہی آدمی کی تلاش تھی۔ لاشعوری طور پر ہی سہی لیکن قدرت نے اس سے بڑا اہم کام لے لیا تھا۔ اور کُمار کی دریافت اُس کا کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔

شہر میں داخل ہونے سے پہلے اُس نے کُمار کو رُکنے کا اشارہ کیا۔ اِس مرتبہ پھر اُس کا ہاتھ جیب میں رینگا اور سو روپے کا ایک نوٹ نکال کر اُس نے ہکّے بکّے کُمار کو تھما دیا۔

"یہ تمہارے بچّوں کی مٹھائی ہے۔ اس میں تمہارا کوئی حصّہ نہیں۔ یہاں سے تم الگ ہو جاؤ۔ رام رام۔"



اُس نے ششدر کُمار کو وہیں چھوڑا اور شہر کی طرف گھوم گیا۔ کُمار حیرانگی سے اُس کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ بمشکل اُس کے مُنہ سے "رام رام" نکلا! اس آخری وار نے اُسے بالکل ہی گھائل کر دیا تھا اور وہ ذہنی طور پر خان کے ایک اشارے پر جان دینے کے لیے بھی تیار ہو گیا تھا۔

کُمار کو وہیں چھوڑ کر وہ دوسری سمت گھوم گیا۔ کُمار اُسے تب تک جاتے ہوئے دیکھتا رہا جب تک خان درختوں کے جھنڈ میں غائب نہیں ہو گیا۔ اب وہ اُس نالے کی طرف جا رہا تھا جو شہر اور اس علاقے کے درمیان حد بندی کا کام دے رہا تھا۔ نالے کے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر لکڑی اور لوہے کے گارڈروں کی مدد سے پُل بنے ہوئے

تھے جن پر سے لوگ آر پار آ جا رہے تھے۔

خان بھی ایک لکڑی کا پُل عبور کر کے شہر میں داخل ہو گیا۔ اُس کے سامنے شہر کا بازار پھیلا ہوا تھا۔ اس بازار میں ضروریات زندگی کی ہر شے دستیاب تھی اور دُکاندار ایک دوسرے سے زیادہ بلند آواز میں اپنی اپنی اشیاء کی تشہیر کر رہے تھے۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ لوگوں کی بھیڑ کے بیچوں بیچ راستہ بناتا بڑے اطمینان سے چلا جا رہا تھا۔

ایک قدرے ماڈرن سٹور پر رُک کر اُس نے اپنے لیے ایک ریڈی میڈ پتلون خریدی اور وہیں اپنے جسم پر "فِٹ" بھی کر لی۔ پُرانے کپڑے تھیلے میں مُنتقل ہو چکے تھے! دُکان سے باہر آ کر اُس نے وہ تھیلا ایک چھوٹے سے ہوٹل کے نزدیک رکھ دیا ـــ بالکل اِسی طرح جیسے کوئی بھول گیا ہو۔

تھیلے سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر وہ اُس کا کن انکھیوں سے جائزہ لیتا رہا۔ بمشکل دو ہی منٹ بعد اُس نے دبے قدموں ایک ہندو لالے کو تھیلے کی طرف بڑھتے دیکھا۔ پہلے تو وہ تھیلے کے پاس لاتعلق سا کھڑا ہو گیا۔ پھر اُس نے لوگوں کی نظر بچا کر تھیلا بغل میں دبایا اور بڑی تیزی سے بھیڑ میں غائب ہو گیا۔ خان نے اُسے دُور تک جاتے دیکھا اور پھر خدا کا شُکر ادا کیا کہ تھیلا کسی "خاص آدمی" کے ہاتھ نہیں لگا۔ وہ تصوّر کر سکتا تھا کہ لالہ جی نے گھر پہنچ کر ہی دَم لیا ہو گا! بازار میں ہی واحد سڑک کے فٹ پاتھ پر لگے خوانچوں کی قطار میں بیٹھے ایک عینک فروش سے اُس نے بظاہر ایک قیمتی عینک بھی خرید لی تھی۔

سیاہ شیشوں کی اس عینک نے اس کے چہرے کو خاصا رعب دار بنا دیا تھا۔ اُس کی منزل بریف کیس فروخت کرنے والوں کی دکان تھی۔ بازار میں ہی واحد دُکان سے اُس نے ایک بریف کیس بھی خرید لیا اور جب آنکھوں پر چشمہ لگائے بریف

[illegible] میں تھامے وہ باہر نکلا تو خاصا معزز شہری دکھائی دے رہا تھا۔

ایک چاندی کی زنجیر میں ٹنگی "ویشنو ماتا" کی مورتی اُس کے گلے کا ہار پہلے ہی [illegible] تھی، اور وہ کسی بگڑے ہوئے ہندو گھرانے کا پڑھا لکھا نوجوان سرکاری ملازم نظر [illegible] تھا۔

لاری اڈے پر پہنچ کر اُس نے بڑے اطمینان سے "ٹکٹ گھر" سے بھٹنڈہ کا ٹکٹ [illegible] اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سگریٹ نہیں پیتا تھا، لیکن اُس وقت اُس [illegible] میں "گولڈ فلیک" کی ڈبیا اور ماچس پکڑی ہوئی تھی۔ سگریٹ سُلگا کر وہ بڑے [illegible] انداز میں اُس کے کش لگا رہا تھا۔ رات کی نیند گو کہ مختصر تھی لیکن اتنے معمولی سے [illegible] خان کو بالکل تازہ دم کر رکھا تھا۔ اس کے نزدیک سے گزرنے والے [illegible] سی نظر ڈال کر آگے نکل جاتے۔ اُس کے متعلق کسی کے ذہن میں شک [illegible] ہو سکتا تھا۔

سگریٹ اُس نے قریباً آدھا پینے کے بعد بڑی لاپرواہی سے اپنے جوتوں تلے [illegible] لاری نے ہارن بجا دیا تھا اور وہ اب نپے تُلے قدموں سے لاری کی طرف بڑھ رہا [illegible] کی سیٹ پر ایک ریٹائرڈ قسم کا ہندو لالہ بیٹھا تھا۔ اُس کی آنکھوں پر لگے چشمے [illegible] شیشے اِس بات کی چُغلی کھا رہے تھے کہ آدمی کچھ شُد بُد بھی رکھتا ہے۔

[illegible] پر خان بیٹھا وہ دو آدمیوں والی سیٹ تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ اسی [illegible] دو لڑکیاں براجمان تھیں۔ خان نے اُن لوگوں کی گفتگو سے اندازہ لگا لیا تھا [illegible] کے لوگ ہیں۔

[illegible] ـــ اُس نے بڑے مؤدب لہجے میں اپنے ہمراہی کو مخاطب کیا۔

[illegible] بات نہیں ـــ کوئی بات نہیں" ـــ بوڑھا اُس کی بھرپور شخصیت تلے [illegible] تھا۔

بس کی روانگی تک اُن لوگوں کی آپس میں ہونے والی گفتگو سے خان کو بہت کچھ سمجھ آگیا تھا۔ وہ جان چکا تھا کہ یہ لوگ کسی شادی کی تقریب میں شرکت کرنے کے بعد واپس جارہے ہیں۔ یہ فیملی دہلی کی رہنے والی تھی لیکن اپنے کسی عزیز کے ہاں کسی تقریب میں یہ لوگ بھٹنڈہ سے ہو کر جانا چاہتے تھے۔

"کیا شُبھ نام ہے آپ کا؟" بوڑھے کو شاید بولنے کا مرض تھا۔

"جی اُرون کُمار ___" خان کے مُنہ میں جو آیا وہی کہہ دیا۔

"کیا کرتے ہیں ___؟" بوڑھا اُس سے مکمل تعارف پر تُلا ہوا تھا۔

"لمبی کہانی ہے شریمان جی۔" خان نے اب اُسے سنانے کے لیے ایک کہانی تیار کر لی تھی۔

"اس سے بھی زیادہ۔" بوڑھے کی حِس مزاح پھڑکی۔ بس کا ایک کنڈیکٹر بہت بے ڈھب اور خاصا لمبا تھا۔ اُس نے کنڈیکٹر ہی کی طرف اشارہ کیا۔

خان نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ بھی کام کا آدمی نکلا تھا کم از کم وہ سفر کی بوریت سے تو بچ جائے گا ___ لیکن اتنا ہی کیوں اُس نے تو مستقبل کے متعلق بھی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ اگر بوڑھا خود ہی اُس کے جال میں پھنسا جا رہا تھا تو وہ کون ہوتا ہے اُسے روکنے والا؟" اُس نے سوچا۔

"آپ نے بالکل صحیح اندازہ لگایا۔ نہ صرف اتنی لمبی بلکہ اس سے بھی زیادہ بے ڈھب" خان نے گو کہ مُسکراتے ہوئے کہا تھا۔ لیکن اس کا لہجہ بوڑھے کے جذبہ ترحم کو بیدار کرنے کے لیے کافی تھا۔

"بہت گہری باتیں کرتے ہو مہاشے! کہیں کوئی عشق کا چکر تو نہیں" ___ اس مرتبہ بوڑھے نے قریباً اُس کے کان کے نزدیک منہ لا کر سرگوشی کی تھی۔

"ارے نہیں انکل ___ اتنی فرصت ہی زندگی میں کہاں ملی۔ لیکن آپ اپنا پریچے

تعارف تو کروا دیجئے۔"

"ہاں بھئی یہ تو میں بھول ہی چلا تھا جگن ناتھ سہائے نام ہے میرا۔ آج سے چھ سال پہلے تک ریلوے میں سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اب ریٹائرڈ ہوں اور گھر بیٹھا مکھیاں مار رہا ہوں۔"

بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال اُس کے ذہن میں لپکا اور اُس نے کہہ دیا۔ "خیر! کام ملنے کے بعد آپ بیکار تو رہنے کے نہیں۔"

بوڑھے نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ اگلی سیٹ پر بیٹھی دونوں اُس کی لڑکیاں پلٹ کر اسے دیکھنے لگیں۔

"سوری ___" اس نے لڑکیوں سے کہا پھر خان سے مخاطب ہوا ___ "عجیب زمانہ آگیا ہے یار نہ کوئی کھل کر ہنسنے دیتا ہے نہ رونے دیتا ہے۔ ہاں کچھ اپنا جغرافیہ بھی بتاؤ مہاشے!"

خان نے اس سے نظریں ہٹا کر اپنے چہرے پر خاصی سوگواری پیدا کی اور بس کی کھڑکی سے باہر گھورنے لگا۔ پھر چند لمحے بعد ٹھنڈی سانس لے کر بولا ___ "بڑی عجیب بات ہے انکل! آپ کے نزدیک بیٹھتے ہی ___ آپ سے پریچے حاصل کرنے سے بھی پہلے چند لمحوں میں آپ کو اپنا جاننے لگا تھا۔ یوں لگتا ہے کہ ضرور کسی پچھلے جنم میں میرا اور آپ کا کوئی سمبندھ رہا ہے۔ ضرور ایسا ہے ___ ورنہ یوں اتنی جلدی میں کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔"

اس مرتبہ اس کی ایکٹنگ اتنی شاندار تھی کہ وہ خود اپنے آپ کو دل ہی دل میں داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ کیونکہ بوڑھا خاصا سیریس ہو گیا تھا۔

"ہاں بیٹا ___ ایسا ہوتا ہے۔ خود میرے ساتھ بھی زندگی میں کئی مرتبہ ایسا ہوا ہے۔ ایک بار تو بالکل یوں لگا جیسے میں اپنے مدار سے بچھڑا ہوا کوئی ستارہ تھا جو واپس لوٹ آیا

ہوں ــــ جیسے کوئی کونج اپنی ڈار سے بچھڑ کر واپس اُن سے مل جائے۔ تمہارا من بڑا بوجھل ہے کہہ ڈالو دل کی بات ــــ دل ہلکا ہو جائے گا بیٹا! اس دُنیا میں کسی کے پاس کسی کی بات سُننے کی فرصت بھی تو نہیں ہے!" پھر وہ خود بھی مُسکرا دیا ــــ "لیکن میں… پاس ہے۔ میں تو ریٹائرڈ ہو چکا ہوں ناں!" ــــ اُس کا لہجہ خاصا گھمبیر ہو چلا تھا۔

آگے بیٹھی لڑکیوں نے اب اس میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی۔ وہ اُسے اپ… "پتاجی" کا کوئی پرانا جاننے والا سمجھنے لگی تھیں۔ دونوں کے کان اُن کی گفتگو ہی پر لگے… تھیں۔ یہ اندازہ خان نہ لگا سکا کہ وہ اُس کھٹارہ نما بس کے شور میں اُس کی آواز سُن… لی تھی، …یا نہیں؟

لڑکیوں نے اپنی نشستوں پر اب پہلو بدلنے شروع کر دیے تھے۔ بھارتی ناریوں کی فطری کمزوری اُن پر بھی غلبہ پانے لگی تھی۔ دونوں اب خاصی ترچھی ہو کر بیٹھ رہی تھیں… ہاتھ والی لڑکی تو اب اس پوزیشن میں آ چکی تھی کہ براہِ راست خان کی آنکھوں میں… سکے۔

خان نے بوڑھے کو کریدنا شروع کر دیا۔ اُس کی کہانی برصغیر کے ہر ریٹائرڈ آدمی… ملتی جلتی تھی؛ زندگی بھر محنت کی اب ذرا آرام کا وقت آیا تو اپنوں نے دھتکار… کر دیا۔

اب یہی المیہ بوڑھے جگن ناتھ سہائے کی جان کا روگ بنا جا رہا تھا۔ خان کے… اظہارِ ہمدردی کے لیے الفاظ کا بے پناہ ذخیرہ موجود تھا جس کا اُس نے بے دریغ ا… کیا اور جب وہ لوگ ایک اسٹاپ پر رُکے جہاں بس نے قریباً پندرہ بیس منٹ ٹھ… تھا تو بوڑھا سہائے اُس کی مکمل گرفت میں آ چکا تھا۔

بس سٹینڈ میں بنے ایک ہوٹل کے کیبن میں جگن ناتھ کی ساری فیملی موجود تھی… دانستہ باہر کھڑا رہا لیکن سہائے اُسے ضد کر کے اندر لے گیا۔ اُس نے اپنی فیملی کا ا…

…اس سے کروایا۔ بڑی بیٹی مسز سوشیل شادی شدہ اور دو بچوں کی ماں تھی لیکن اُس نے اپنے …ے غفلت نہیں برتی تھی اور اگر سہائے نہ بتاتا تو خان اُس کے بجائے سہائے کی دوسری بیٹی آشا کو اُن بچوں کی ماں سمجھ لیتا۔ تیسری بیٹی جو اب تک خاصی ٹیڑھی ہو کر خان کو کن انکھیوں سے دیکھتی آئی تھی سوشیل سے چھوٹی اور آشا سے بڑی تھی اور ایک کالج میں گریجوایشن کے آخری سال کی طالبہ تھی۔

"کیا شبھ نام ہے آپ کا؟" خان نے خود ہی اُس کا تعارف دریافت کیا تھا۔

"جی رمّا" ــــ اُس نے خاصی لجاجت کا مظاہرہ کیا۔

اگر وہ اکیلی ہوتی تو خان ضرور اس کے اس اندازِ تکلم پر کوئی تبصرہ کر کے اُس کے دل میں اپنے لیے پہلے سے موجود جگہ پر قبضہ جمانے کی کوشش کرتا لیکن یہاں اُس نے ایک خاص انداز سے مُسکرانے ہی پر اکتفا کیا۔ یہ الگ بات کہ اُس کے مُسکرانے کی یہ ادا بھی رمّا کو ضرورت سے زیادہ بھا گئی۔ سہائے کے واحد لڑکے کا نام کشور سہائے تھا جو …دسویں جماعت کا طالب علم لیکن اپنی عمر سے کہیں بڑا دکھائی دیتا تھا۔

خان نے اپنی طرف سے خاصی "پُرتکلف" چائے کا آرڈر دیا سوائے رمّا اور سہائے کے سب ہی نے چائے نوشی اور اُس سے متعلقہ لوازمات نوشِ جان کرنے میں بُخل سے کام لیا تھا۔ سوشیل کے دونوں ہی ننھے بچے ننھاسری وانس اور مینا کشی اس معاملے میں کچھ زیادہ ہی بے تکلف واقع ہوئے تھے۔ اپنی ماں کی آنکھیں دکھانے اور گھورنے کو انہوں نے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔

…کو بل دیتے ہوئے خان نے جس "بے رحمی" سے اُسے "ٹِپ" کیا تھا اُس پر اس …کی فیملی کا چونکنا بالکل فطری بات تھی۔

…بس میں سوار ہونے تک وہ رمّا کو اپنی وجاہت اور باقیوں کو امارت کا قائل …تھا۔

بس کے چلتے ہی بوڑھا سہائے اُس کا 'دُکھ' جاننے پر بضد ہوا اور خان کو بادل نخواستہ اُسے بتانا ہی پڑا کہ 'پتاجی کے سورگباشی (مرنے) ہونے کے بعد اُس کے دونوں بڑے بھائی جو شادی شدہ ہیں سانپ بن کر دولت پر بیٹھ گئے ہیں۔ ماں بچپن ہی میں [illegible] گئی تھی۔ جب وہ بڑے بھائیوں کو خود پر ہونے والی زیادتیوں کا احساس دلاتا ہے تو وہ اُلٹا اُسے آوارہ گرد اور لاپرواہ کہہ کر موردِ الزام ٹھہرانا شروع کر دیتے ہیں اور اپنا حصہ لے کر الگ ہو جانے کی دھمکی دیتے ہیں!

"لے لو ناں تم اپنا حصہ اور علیحدہ بزنس کر لو۔"

بوڑھے سہائے کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

"انکل اکیلا آدمی کچھ نہیں کر سکتا ——— کچھ نہیں کر سکتا۔" خان نے ٹھنڈی آہ بھر [illegible]

"بیٹا! تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ پچھلے جنم میں ضرور تمہارا میرے ساتھ کوئی ناطہ ہے۔ پھر بھی خود کو اکیلا محسوس کرتے ہو؟" سہائے نے بڑے گھمبیر اور ہمدردانہ لہجے میں تسلی دلائی۔

جواب میں جس ردِعمل کا اظہار خان نے کیا تھا وہ سہائے کے لیے بالکل [illegible] تھا۔ اُس نے جگن ناتھ سہائے کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر بڑی نرمی [illegible] انتہائی محبت سے دبا دیا تھا اور جب سہائے کی نظر اُس کے چہرے پر پڑی تو وہ [illegible] کر ہی تو رہ گیا تھا:

——— بے چارے ارون کمار کی آنکھوں میں تیرتے آنسو اُس کی عینک کے شیشوں سے بھی صاف دکھائی پڑتے تھے!

خان نے جیب سے رومال نکال کر عینک کو ایک ہاتھ سے اوپر اُٹھائے [illegible] آنکھوں سے آنسو پونچھے اور اپنا منہ کھڑکی کی طرف کر کے خود کو دل ہی دل میں [illegible]

[illegible] دیا تھا۔

سہائے نے اُس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے اُسے حوصلہ دلایا اور مردوں کی طرح زندگی گزارنے کا مشورہ بھی دیا! دونوں پھر نارمل لہجے میں باتیں کرنے لگے۔ اس دوران سہائے نے خود ہی ایک تجویز اُس کے سامنے رکھ دی۔

"مجھے اگلے مہینے تک اپنے بقایاجات مل جائیں گے۔ اگر تم مناسب سمجھو تو مل کر کوئی بزنس کر لیں گے ——— بیٹا! تم مجھے اپنے سورگباشی پتا سے بڑھ کر پاؤ گے۔"

خان چند لمحے کچھ سوچتا رہا پھر اُس نے ایک گہری سانس لی اور سہائے سے مخاطب [illegible]

"انکل! آپ کو اپنے بقیہ جات کی ضرورت بھی پیش نہیں آئے گی۔ انہیں کسی اور وقت کے لیے سنبھال رکھیے ——— میرے پاس دولت بہت ہے لیکن پیار نہیں۔ مجھے آپ کی پدرانہ شفقت ہی چاہیئے تھی وہ مل گئی ——— میں آپ سے دہلی میں ملوں گا [illegible] کروں گا جو آپ چاہیں گے۔"

بوڑھا سہائے جوشِ محبت سے پگھل پگھل گیا۔ اُس نے کپکپاتے ہاتھوں سے خان کے دونوں کندھے دبا کر اپنی اس کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔ بوڑھے نے نہ [illegible] اُسے دہلی میں اپنے گھر کا پتہ سمجھایا تھا بلکہ رما کو یہ بھی کہا تھا کہ وہ اپنی ڈائری [illegible] ورق پر ارون کمار کو ایڈریس لکھ کر دے دے۔

[illegible] یہ خوبصورت فریضہ بڑے احسن طریقے سے اور مسکراتے ہوئے ادا کیا تھا۔ [illegible] صرف ایک کاغذ پر ایڈریس لکھا بلکہ ایک ٹیلیفون نمبر کونے میں لکھ کر "پی پی [illegible]" بھی انگریزی میں لکھ دیئے تھے۔ یہ کام اُس نے اتنی ہوشیاری سے کیا [illegible] ساتھ بیٹھی بڑی بہن سوشیل کو شک تک نہیں ہونے دیا۔

[illegible] والا کاغذ بھی اُس نے براہِ راست خان کو تھمایا تھا۔ جس نے ایک کونے

میں لکھے ٹیلیفون نمبر پر مسکراتے ہوئے اُس کا شکریہ ادا کیا۔

بٹھنڈہ آگیا —— !

سب لوگ اُتر گئے۔ یہاں سے انہیں الگ ہو جانا تھا۔ سہائے نے خان کو اُس گھر کا ایڈریس بھی سمجھا دیا تھا جہاں اُن لوگوں نے شادی کی تقریب میں شرکت کرنی تھی۔ یہ اُس کے سالے کا گھر تھا۔ اور اُس نے خان سے بضد ہو کر وعدہ لے لیا تھا کہ وہ ضرور کم از کم اُس شادی میں شرکت کے لیے آئے گا۔

خان نے "اُن کی خوشی کے لیے" بادلِ نخواستہ یہ وعدہ کر لیا تھا۔ ورنہ وہ تو بظاہر اتنا مجبور تھا کہ اپنے کاروباری اوقات میں سے ایک گھنٹہ بھی فراغت کے لیے نہیں نکال سکتا۔ جب سہائے نے اُس سے یہاں کا ایڈریس دریافت کیا تو اُردن کمار جی نے بڑی خوش اسلوبی سے اُسے ٹرخا دیا:

"انکل عجیب بات پوچھی آپ نے بھی..... بھئی ایڈریس کیسا؟ تمام مارکیٹیں ہی اپنا ایڈریس ہیں۔ مَیں یہیں پر گھوموں گا۔ کچھ پیسے لینے ہیں اور کچھ نئے آرڈرز ——"

"اچھا اچھا بیٹا جیسے تمہاری مرضی —— لیکن شادی پر آنے کا وعدہ نہیں بھولنا!" ... نے ضدی بچّوں کی طرح خان سے یقین دہانی حاصل کی۔

جاتے ہوئے وہ مینا کشی کو لاری اڈے سے خوبصورت گڑیا کا تحفہ خرید کر دینا نہیں ... تھا۔ ننھی مینا کشی کب سے اس گڑیا پر نظریں جمائے ماں سے اس کے حصول کے لیے ... لیکن ہر مرتبہ مسز سوشیل اُسے گھور کر رہ جاتی۔

"رہنے دیتے بھائی صاحب! اِس کی تو عادت ہی یہی ہے۔ ہر چیز کے لیے ... ہے۔" مسز سوشیل نے احساسِ تشکر میں ڈوبنے کے باوجود فرار کی راہ ڈھونڈنی چاہی۔

"کوئی بات نہیں۔ میری بھی یہی عادت ہے —— لیکن میرا کیس ذرا مختلف ہے ... کوئی لے کر نہیں دیتا —— ویری! وہ لوگ بہت خوش قسمت ہوتے ہیں جن کی خوا...

... کرنے کے لیے کوئی موجود ہو۔" اُس کا لہجہ اتنا گھمبیر تھا کہ مسز سوشیل دہل کر ہی تو رہ گئی۔

رما کے دل میں تو اُس کے لیے اب محبّت کے ساتھ ترحّم اور ہمدردی کے جذبات بھی بیدار ہونے لگے تھے۔ اُن لوگوں سے رخصت ہوتے ہوئے خان نے خاص طور سے رمّا ہی کی طرح ہاتھ باندھ کر پرنام کیا تھا۔ جو اپنے سینے کے سامنے دونوں ہاتھ باندھے بالکل ... کی تصویر کی مانند اُسے تب تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی جب تک وہ ایک نزدیکی ... کے پیچھے غائب نہ ہو گیا۔



منوہر لال سورج چڑھنے تک پجاری کے ہاں ہی ٹِکا رہا پھر اُس نے پجاری سے ... جانے کی "آگیا" (اجازت) لی اور شام تک لوٹ آنے کا وعدہ کر کے باہر آگیا! اُس ... کپڑے تو سادہ سے کھدر کے پہن رکھے تھے لیکن چہرے مہرے سے کوئی پہنچا ہوا ... درمیانی قسم کا فلاسفر نظر آ رہا تھا۔

مندر سے باہر آ کر اُس نے سگریٹ سلگایا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا اُس کے ... بس سٹینڈ کی طرف جا رہا تھا۔

—— قریباً ایک گھنٹہ بعد وہ ابوہر کے بارڈر سکیورٹی فورس کے کمپنی ہیڈکوارٹر کے سامنے کھڑا تھا۔

... "پر اُس نے اپنا نام پتہ لکھایا اور ایک کیپٹن سے ملاقات کی خواہش ظاہر ... ملاقات"؟ دریافت کرنے پر اُس نے کلرک کو قریباً گھور کر دیکھا۔

"اُس سے پوچھ لو۔"

کلرک نے ایک لمحے کے لیے اُس کی طرف دیکھا لیکن اُس کی آنکھوں سے نکلنے والی ... کلرک کو دوبارہ اُس کے چہرے کی طرف دیکھنے کی ہمت نہ دلائی۔ وہ سہم کر رہ ... اُس نے ایسی آنکھیں نہیں دیکھی تھیں! اُس نے "انٹر کام" پر کیپٹن دوبے کا نمبر

ملایا اور جیسے ہی اُس کے مُنہ سے ملاقاتی کا نام نکلا۔ دوسری طرف سے کیپٹن نے اُسے ڈانٹ دیا۔

"ابھی تک وہ باہر ہی کھڑے ہیں؟" ـــــ وہ اتنی زور سے چیخا کر کلرک کی گھگی بندھ گئی۔

"یس سر ـــــ میں ابھی بھیج رہا ہوں سر!" اُس کی زبان لڑکھڑائی۔

"شٹ اپ۔ میں جیپ بھیجتا ہوں اُنہیں لینے کے لیے۔" کیپٹن نے فون کریڈل پر پٹخ دیا۔

منوہر لال جو کلرک کے چہرے پر بدلتی کیفیتوں سے لُطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس گفتگو کے خاتمے پر اُس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

"میرے خیال سے تمہیں "مقصدِ ملاقات" کا علم ہو گیا ہو گا؟"

"شما کر دیجیے مہاراج! میں یہاں نیا نیا آیا ہوں۔" اُس نے لاشعوری طور پر ہاتھ بھی باندھ دیے۔

منوہر لال بغیر کوئی جواب دیے سامنے سے آتی جیپ کی طرف متوجہ ہو گیا ـــــ جیپ اس کے نزدیک آکر رُک گئی۔ ایک مستعد نائیک نے ڈرائیور کی سیٹ سے اُتر کر اُسے دیکھتے ہی ایڑیاں ملا کر تعظیم دی۔ شاید وہ اِس کا شناسا تھا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر اُس نے منوہر لال کو پرنام کیا اور بڑے مؤدب لہجے میں اگلی سیٹ پر بیٹھنے کی دعوت دی۔

منوہر لال اُس کے ساتھ بیٹھ گیا! دو تین منٹ جیپ کمپنی ہیڈ کوارٹر کی مختلف روشوں پر دوڑتی رہی بالآخر ایک میدان کے کونے میں بنے بیرک نما کمرے کے سامنے رُک گئی۔ بارک کے دروازے پر کیپٹن دُوبے بانہیں پھیلائے اُس کا مُنتظر تھا۔

"ارے تم کہاں سے ٹپک پڑے مہاراج!" کیپٹن دُوبے نے اُسے دیکھتے ہی نعرہ لگا...

"بس زندہ تھا آگیا ـــــ" منوہر لال نے ہنستے ہنستے اُس کی پیٹھ پر دھول جمائی۔

"یار اتنی دیر نہ لگایا کرو۔ ورنہ کسی روز ہم مر جائیں گے شریمان جی!" کہہ کر کیپٹن دُوبے اُس کی کمر کے گرد بازو حائل کر کے اُسے بڑی بے تکلفی سے اندر اُسی بیرک میں لے آ...

جہاں اُس کا دفتر تھا۔

اُس کی میز کے ایک کونے پر بی ایس ایف کا مخصوص چھوٹا سا جھنڈا لہرا رہا تھا اور ...پر گاندھی کی تصویر لٹک رہی تھی۔ میز کے ایک کونے میں ایک حوالدار ہاتھوں میں کاغذ پنسل تھامے بیٹھا تھا۔ اُنہیں اِس طرف آتے دیکھ کر وہ اور مؤدب ہو کر بیٹھ گیا۔

"تم جاؤ یار ـــــ ذرا ٹھہر کر آجانا ـــــ" دُوبے نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے ...لے کو کہا۔

"نہیں ـــــ" منوہر لال کی آواز میں ناصحانہ پن کچھ زیادہ ہی سمٹ آیا تھا! "اسی لیے اس تمہیں ملنے نہیں آتا۔ تم سرکاری کام کو مجھ پر اہمیت نہ دیا کرو۔" اُس نے دُوبے ...مخاطب کیا۔

"بس ہو گیا بھاشن شروع" ـــــ اُس نے منوہر لال کی طرف دیکھا اور حوالدار کو ...کا اشارہ کیا۔

حوالدار کے کُرسی پر بیٹھتے ہی دُوبے نے پُش بٹن پر ہاتھ رکھ دیا! دوسرے ہی لمحے ...مؤدب اردلی اُس کے سامنے کھڑا تھا۔

"دس منٹ بعد چائے اور بسکٹ لے آنا ـــــ" اُس نے اردلی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

منوہر لال اُس کی میز پر رکھے ایک انگریزی اخبار کی ورق گردانی کرنے لگا۔ اُس ...دانستہ دُوبے کو "کام مکمل کرنے" کا موقعہ دیا تھا۔

"...اں کہاں پہنچے تھے۔" دُوبے نے حوالدار کو مخاطب کیا۔ شاید وہ اُسے کچھ لکھوا ...رہا تھا۔

"سر!" ـــــ حوالدار نے مؤدب لہجہ میں کہنا شروع کیا۔ "لاش پوسٹ مارٹم کے لیے ...دی گئی ہے۔"

"اچھا آگے لکھو۔" اُس نے دوبارہ سٹارٹ لیا۔

"یس سر" حوالدار کا قلم تیزی سے چلنے لگا۔

"پاک سپائی کے لیے تین متبادل ناکہ بندیاں کی گئیں۔ دو مرتبہ وہ ہاتھوں میں آکر مقامی پولیس اور ہوم گارڈز کی نااہلی کی وجہ سے نکل گیا ــــ آرمی انٹیلی جنس کی مِس سلوچنا کو اُس نے ریلوے لائن کے نزدیک "ڈاج" کیا ہے ــــ مِس سلوچنا نے جو شباہت اُس کی بتائی ہے۔ اُس سے سپائی کی پہچان مشکل ہے"....

تینوں "چیک پوسٹوں" کی رپورٹ منسلک ہے۔ میرے خیال کے مطابق وہ اس علاقے سے نکل چکا ہے۔ مزید تحقیقات جاری ہے۔"

اس نے حوالدار کو کہا کہ ٹائپ کرنے کے بعد فلاں فلاں آفس کو ایک ایک کاپی ڈسپیچ کر دے۔ اخبار کی سطروں پر نظریں جمائے منوہر لال کو اس رپورٹ کے خاتمے پر گویا نئی زندگی نصیب ہوئی تھی۔ اس کے لیے یہ امر باعث اطمینان تھا کہ "پاک سپائی" ابھی تک گرفتار نہیں ہو سکا۔ اس مختصر گفتگو سے وہ کم از کم ایک نتیجے پر تو پہنچا تھا کہ اس مرتبہ بھارتی انٹیلی جنس کا سابقہ کسی عام ایجنٹ سے نہیں بلکہ تربیت یافتہ اور مکمل "پاک سپائی" سے انہیں پالا پڑا ہے۔

حوالدار کی روانگی کے بمشکل دو منٹ بعد ہی مودب اردلی چائے کی ٹرے اٹھائے اندر آگیا۔ دونوں ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ یہ ملاقات شاید ڈیڑھ ماہ کے بعد ہوئی تھی جسے وہ لوگ "خاصی مدت" سمجھ رہے تھے۔ دونوں کے درمیان اتنی بے تکلفی تھی کہ دوبے کے سٹاف کے اکثر لوگ بھی منوہر لال کو پہچاننے لگے تھے۔

"کیا چکر ہے مہاراج کہیں کوئی اور جنگ تو نہیں کروانے لگے۔ پھر پاکستانی گھس پیٹھیوں کی خبریں آنے لگی ہیں اخباروں میں" منوہر لال اب اپنے مطلب کی طرف آرہا تھا۔

"ارے چھوڑو یار۔ اپنے دھندے میں تو یہ سب کچھ چلتا ہی رہتا ہے۔ ادھر کا مال

اُدھر اور اُدھر کا مال ادھر لیکن یار اس مرتبہ تو حد ہی ہو گئی۔"

"کیا؟" ــــ چائے کی پیالی میں چمچہ ہلاتے ہوئے منوہر لال بالکل یوں اُس کی طرف متوجہ ہوا جیسے واقعی کوئی انہونی بات ہو گئی ہو۔

"اس مرتبہ جو پاک سپائی اُدھر سے آیا ہے۔ ہم نے اُسے پھانسنے کا مکمل منصوبہ بنا لیا تھا ــــ اپنا ایک خاص آدمی اُس کے ساتھ چپکایا تھا لیکن کمال کر دیا بچے تے"

دوبے نے چائے کا ایک لمبا گھونٹ بھرا۔

منوہر لال استفہامیہ نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُس نے مُنہ سے کچھ نہ کہا۔

"یار! وہ نہ صرف خود بچ کر نکل گیا بلکہ جاتے جاتے اُس ڈبل کراس کا جو ہم نے اِس کے ساتھ چپکایا تھا بھی صفایا کر گیا۔"

"اور تم لوگ مُنہ دیکھتے رہ گئے" ــــ منوہر لال نے اُس کا تمسخر اُڑایا۔

"بس ایک یہی کمی ہے تم میں۔ جو ہر وقت "شدھ بھارتی" بننے کے چکر میں پڑے رہتے ہو۔ یار! تم اُن کو کیا سمجھتے ہو۔ وہ کوئی کم نہیں کسی بات میں۔ ارے یہ تو شکر کرو کہ ہماری "جن سنکھیا" (آبادی) زیادہ ہے۔ اُن سے اور "خفیہ" میں لاکھوں حرام خور دیش کی کمائی پر پل رہے ہیں جو کبھی بھول چوک سے کوئی ایک آدھ پاکستانی ہمارے ہاتھ آ جاتا ہے ــــ وہ بھی ہماری کوشش سے نہیں گردشِ حالات کی وجہ سے۔"

"اچھا یار لعنت بھیجو کوئی اور بات کرو ــــ وہ اُس کی سناؤ تمہاری شاردا کا کیا حال ہے" منوہر لال نے مطلوبہ مقصد حاصل ہونے پر خود ہی گفتگو کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔ وہ دوبے سے بھی زیادہ محتاط ایجنٹ تھا اور شاید یہی اُس کی کامیابی کا راز بھی تھا۔ دوبے کی میز سے کچھ فاصلے پر اُس کے کلرکوں کی میزیں بچھی تھیں اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہاں سے کوئی اٹھ کر اگر کسی کام سے اس طرف آئے بھی تو اُس کے

کانوں میں اِس گفتگو کی بھنک بھی پڑ سکے۔

"وہ شاردا....." دُوبے نے کھوکھلا قہقہہ لگایا۔

اس مرتبہ منوہر لال کے چونکنے کی باری تھی۔ آج تک کیپٹن دُوبے کے لہجے میں اُس نے ایسی یاسیّت کبھی نہیں دیکھی تھی۔

"کیا ہُوا ؟"۔ وہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"بھاگ گئی سالی"۔۔۔ دُوبے نے جذبات سے عاری لہجہ اپنایا۔

منوہر لال حیران تھا کہ کیپٹن دوبے جیسا عیاش ہندو نوجوان بھی کبھی کسی فاحشہ سے محبت کر سکتا ہے اُس نے تو شاردا کو یونہی اُس کے ساتھ چمٹا دیا تھا لیکن بات تو دُور نِکل چکی تھی۔ اگر یہ سب کچھ سچ تھا تو منوہر لال کے لیے یہ "بنچر گفٹ" ہوتا۔ اس شاردا کے معاملے میں دُوبے کو مختلف بہانوں سے کریدا اور اِس نتیجے پہ پہنچا کہ دائم بھارتی سکیورٹی فورسز انٹیلی جنس کے کیپٹن دُوبے کو شاردا نامی اِس فاحشہ سے محبت ہو گئی تھی جسے اُس کی امرتسر میں پوسٹنگ کے دوران منوہر لال نے ایک منصوبے کے تحت دُوبے سے ٹکرایا تھا۔

دوپہر کا کھانا دونوں نے اکٹھے کھایا۔ اس دوران منوہر لال اُس سے خاصی کام کی باتیں جان چکا تھا۔ دُوبے نے اُس کے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا۔ یہ اُس کا بہت بڑا المیہ تھا کہ اُس کے باپ نے جو بی ایس ایف کا بہت بڑا آفیسر تھا اپنے بیٹے کو بھی اس کی مرضی کے بالکل خلاف یہاں بھرتی کروایا تھا۔ دُوبے بُنیادی طور پر آرٹسٹ تھا اور آرٹ ہی کی دُنیا میں بہت آگے نکل جانے کی حسرت دِل میں لیے بیٹھا تھا۔ منوہر لال سے اُس کی دوستی کی سب سے بڑی وجہ یہی تھی کہ اُس نے دُوبے کے دل میں جھانک کر اس کے اندر ایک عرصے سے مچلتی آرزوؤں کا نوحہ سُن لیا تھا اور اس کے اندر بیٹھے آرٹسٹ کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ اُن دونوں کی ملاقات بھی اچانک ہو گئی تھی۔

یہ اُن دِنوں کی بات تھی جب کیلاش دُوبے ابھی اکیڈمی سے فارغ ہو کر آیا ہی تھا۔۔۔ اُس نے آرمی میں کمیشن لیا تھا۔ ایک روز ایک کلب میں اُس سے منوہر لال ٹکرا گیا تھا۔ اُس دن بھی منوہر لال نے ایسے ہی سادے کپڑے پہن رکھے تھے لیکن اُس کی آنکھوں اور باتوں میں موجود مقناطیسیت نے تو گویا دُوبے کو جکڑ کر رکھ دیا تھا۔ پھر وہ جہاں بھی گیا منوہر لال اُس سے ملنے کو آتا رہا۔ اُس کی کوئی بات کوئی حرکت منوہر سے پوشیدہ نہیں تھی۔

آرمی سے وہ کیپٹن ہونے کے بعد اب ڈیپوٹیشن پر یہاں بی ایس ایف (بارڈر سکیورٹی فورسز) میں آگیا تھا۔ اُس کی پوسٹنگ اکثر پنجاب ہی کے سرحدی علاقے میں ہوتی تھی اس لیے دونوں ایک دوسرے سے بآسانی رل لیا کرتے تھے۔

منوہر لال نے ابھی تک براہِ راست اُس سے کوئی "خاص تعلقات" استوار نہیں کیے تھے۔ اُس نے ہندو نوجوانوں کی فطری کمزوری شراب اور عورت ہی کے ذریعے اِس کے اکثر مطلب کی بات نکلوائی تھی۔ شاردا بھی منوہر لال کی ٹکرائی ہوئی ایک ایسی ہی لڑکی تھی جسے "کام نکلنے" پر اُس نے حسبِ وعدہ پردہ سکرین سے غائب کر دیا تھا لیکن اُسے علم نہیں تھا کہ کیپٹن دُوبے شاردا کے اتنا قریب بھی آ سکتا ہے۔

سہ پہر تک دونوں اکٹھے رہے پھر منوہر لال اُس سے حسبِ سابق بہت جلدی ملنے کا وعدہ کر کے الگ ہو گیا۔ دُوبے اُس کے "نہ نہ" کرنے کے باوجود اُسے جیپ میں بس سٹینڈ تک چھوڑنے آیا تھا۔

اُس سے اُترتے ہی اُس نے ایک میڈیکل سٹور کا رُخ کیا اور وہاں سے کچھ گولیاں لے کر اُس نے جیب میں ڈال لیں۔ پھر شراب کے ٹھیکے سے اُس نے گھٹیا سی دیسی شراب کی بوتل خریدی اور بازار کے پرلی طرف واقع قدرے اُجاڑ جگہ کا رُخ کیا۔ ایک گوشہ

عافیت میں بیٹھ کر اُس نے شراب کی بوتل کا ڈھکن کھولا۔ اچانک اٹھنے والی بدبو کے بھبھوکے نے اُس کو چکرا کر ہی تو رکھ دیا تھا۔

اپنی ناک سکیڑتے ہوئے اُس نے اپنی جیب سے گولیاں نکال بوتل میں انڈیل دیں بوتل میں کچھ بُلبلے پیدا ہوئے اور اس میں موجود شراب کی رنگت بھی بدل گئی۔ بوتل پر لگا لیبل بھی اُس نے پھاڑ کر الگ کر دیا اور اِس کا مُنہ بند کر کے اُسے دوبارہ نزدیکی کھیت کی نالی میں موجود پانی سے اچھی طرح دھولیا تاکہ لیبل کا نام ونشان تک باقی نہ رہے۔

اپنے تھیلے میں بوتل ڈالنے سے پہلے اُس نے بوتل کو اچھی طرح ہلا جُلا کر دیکھ لیا تھا کہیں بوتل کے پیندے میں تو کوئی گولی نہیں بیٹھی ہوئی لیکن تمام گولیاں شراب میں اچھی طرح حل ہو چکی تھیں۔

آشرم کے دروازے ہی پر اُس کا "پجاری کاکا" جانے کتنی شدت سے اُس کا مُنتظر تھا۔ منوہر لال کو آتے دیکھ کر وہ بڑی بے چینی سے آگے بڑھا اور بے اختیار اُس سے لپٹ گیا۔ اُس کی گھاگ نظروں نے تھیلے کے اندر کا بھی شاید ایکسرے کر لیا تھا۔ منوہر لال نے بھی کچھ کہے سُنے بغیر تھیلا اُس کے ہاتھ میں تھما دیا خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگا۔ پجاری پالتو کتے کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے دُم ہلاتا آ رہا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر وہ بستر پر لیٹ گیا۔

"بھتیجے پرماتما تجھے سُکھی رکھے۔ کتنا خیال رکھتے ہو اپنے چاچا کا۔" پجاری نے بوتل چومتے ہوئے کہا۔

"بس کاکا۔ دیکھ لو تمہاری خاطر کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑتی ہے۔ اِدھر البوہ میں میرا ایک دوست ہے اِس دھندے میں! اُسی سے لایا ہوں خاص طور سے تمہارے لیے۔ یاد کرو گے کاکا اپنے بھتیجے کو۔" اُس نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

پجاری نے بے شرموں کی طرح دانت نکال دیے۔ اُس نے بوتل کو اپنی چارپائی کے نیچے ایک ٹرنک میں رکھ کر اُسے دوبارہ تالا لگا دیا تھا اور اِس کے گرد اگرد لپٹی لوہے کی زنجیر کو چارپائی سے باندھ کر باہر آ گیا۔

چند منٹ بعد ہی آشرم کا ایک خدمت گار اُس کے سرہانے پُرتکلف چائے لیے کھڑا تھا۔ منوہر لال اُٹھ کر چارپائی پر ہی ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ رہا۔ خدمت گار ہدایت "ہاتھ اُس کی ٹانگیں دبانے کے لیے آگے بڑھائے لیکن منوہر لال نے ڈانٹ کر وہاں سے بھگا دیا۔

شام تک وہ بے سُدھ سوتا رہا۔ آج تین چار روز کے بعد وہ اطمینان کی نیند سویا تھا۔ جب وہ اُٹھا تو پجاری کاکا اُس کے دیے ہوئے "دو آتشہ" سے باہر کوٹھے پر رہا تھا۔ میلے سے کپڑوں میں ملبوس ایک درمیانی عمر کی "بھگت" کو اُس نے پکڑ رکھا تھا۔ منوہر لال اُس کے نزدیک سے گزر کر چپ چاپ آگے بڑھ گیا۔ [illegible] کی طرف جا رہا تھا۔

ایک ہی عیب ہے تم میں بھتیجے جو ہر وقت "ویشنو" بنے رہتے ہو۔ اگر شراب پیو تو واقعی دیوتا بن جاؤ۔" پجاری نے اس کے پیچھے لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

[illegible] میں آکر منوہر لال نے اپنا کھانا خود تیار کیا اور وہیں کھا کر آشرم سے باہر [illegible] کافی دیر تک وہ ایک تنور نما ہوٹل میں بیٹھا چائے اور سگریٹ سے دل [illegible] آشرم میں واپس آگیا۔ پجاری کاکا کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اس نے [illegible] دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ اور اپنی کوٹھڑی میں آکر لیٹ رہا۔

[illegible] اُس نے پجاری کاکا سے بمشکل جانے کی اجازت لی اور بھجن کتھا ختم [illegible] جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔



بھٹنڈہ کا وہ غالباً سب سے مہنگا ہوٹل تھا جہاں اُس نے قیام کیا۔ ایک موؤب
ویٹرس نے اُس کے کمرے تک اُس کی راہنمائی کی تھی۔ خان کو یہ بات پہلے پہل تو
عجیب لگی لیکن اُسے یاد آگیا انسٹرکٹر نے بتایا تھا: "وہاں کسی بھی بے حیائی کے مظا
پر قطعاً ابنارمل ہونے کی ضرورت نہیں، نہ ہی خود کو اُس ماحول سے الگ رکھنے کی کوشش
کرنا۔"

اُس نے اپنے کمرے ہی میں ایک کارڈ پر کر کے ویٹرس کی طرف بڑھا دیا
جس نے جھک کر بظاہر موؤب ہونے کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے تمام جسمانی خطوط
کر کے اُس سے "شکریہ" کہہ کر کارڈ دوبارہ وصول کر لیا تھا۔
دروازہ پر رُک کر اُس نے دوبارہ اُس انداز میں جھک کر اُسے تعظیم دی
دروازہ بند کر کے باہر نکل آئی۔ دروازے کے باہر اُس نے کارڈ پر لکھے لفظ "ویلشنو
مسکراتے ہوئے نظر ٹھہرائی پھر آگے نکل گئی۔

خود کو "ویشنو" لکھ کر خان نے بہرحال ہوٹل والوں کو اس بات کا پابند کر
کہ وہ اُسے بغیر گوشت کے کھانوں کا مینو ہی بھیجا کریں۔ ایسے بڑے ہوٹلوں
ٹاپ گاہکوں کی آمد ہوٹل کے عملے کے لیے نیک شگون نہیں ہوتا تھا۔ وہ لوگ
ان گاہکوں سے مایوس ہی رہا کرتے تھے، کیونکہ وہ لوگ "ریزرو" ہی رہتے
"ریزرو" رہنے والے گاہکوں سے ہوٹل کے عملے کو زیادہ "معاشی تعاون" کی ا
بندھتی تھی۔

شام کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لیے چہل قدمی کو بازار میں نکل گیا۔ اُ
ذہن میں جلد ہی ہوٹل کے گرد اگرد موجود سڑکوں اور اِدھر کو آنے والے راستوں
لیے تھے۔ شام کے بعد جب وہ ہوٹل واپس لوٹا تو یہ شہر اس کے لیے اجنبی
تھا۔ اُسے یہاں کے بیشتر گلی محلوں کے نام ازبر تھے۔

اپنی آمد پر اُس نے ہوٹل کے ڈائننگ ہال کا رُخ کیا۔ اُس نے کونے والی ایک
سنبھال تھی۔ ہال میں ہلکا ہلکا لیکن بہت بے ہودہ میوزک بج رہا تھا اور اسی مناسبت
لوگ موجود تھے۔ چونکہ یہ اس شہر کا غالباً سب سے مہنگا ہوٹل تھا اس لیے
شہر کے شُرفا اُمڈ آئے تھے۔

ان بھی ہفتہ کی شام تھی جس کے لیے یہ ہوٹل خاصی شہرت رکھتا تھا۔ خالی
ہی سے ریزرو ہو چکی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک موؤب بیرا اُس کے
لیے کھڑا تھا۔ خان نے اپنے لیے سبزیوں کے سوپ کا آرڈر دیا اور جیسے ہی
پر اس نے نظریں اٹھائیں ایک مرتبہ تو اُس کا سارا جسم ہی جھنجھنا اُٹھا
ال میں شاید ہی کسی خاتون نے اپنا مکمل جسم لباس سے ڈھانپ رکھا تھا،
اُس کے سر پر براجمان تھی۔ اُس نے تو جیسے کپڑے کوئی مکروہ شے سمجھ
تے اسکرٹ اور معمولی سی تنگ چولی کے ساتھ ہاتھ میں پرس جھلاتی وہ اُس
لائی تھی۔

اُسے آتے ہوئے شاید نہیں دیکھا تھا۔
میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں"—— اُس نے خان کی آنکھوں میں بڑی بیباکی
اُس کے جواب کا انتظار کیے بغیر اُس کے سامنے بیٹھ گئی —"آپ نے
—— بیٹھتے ہی اُس نے دوسرا فقرہ داغا۔
—— آپ کے بیٹھنے کا بھلا کون کافر بُرا منا سکتا ہے"۔ وہ سنبھل گیا۔
کا وہ جملہ ابھی تک اُس کے لاشعور میں گونج رہا تھا —— کبھی خود کو
ظاہر نہ کرنا۔ اگر کہیں زیادہ نیک نظر آنے کے چکر میں پڑ گئے تو ہمارے
پاکیزگی کا تصور بھی نہیں پایا جاتا جو ہمارے نوجوانوں کے لیے ضروری

"بہت مصیبت ہو جاتی ہے کبھی کبھی۔ ڈھنگ کا یہی ایک ہوٹل ہے اس شہر میں اور یہاں سکون سے بیٹھنے کو جگہ میسر نہیں" ___ اس کی زبان پھر چل پڑی۔

"جی ہاں۔ میں بھی یہی سوچ رہا تھا" ___ وہ اور کیا کہتا۔

"آپ شاید پہلی مرتبہ آئے ہیں یہاں" ___ خان اُس کے سوال پر چونکا پھر سنبھل

"کیا شبھ نام ہے آپ کا؟" ___ وہ اب مکمل فارم میں آ چکا تھا اور لڑکی کو سنبھلنے کا موقعہ دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

"اوہ شما کیجیے ___ یہ تو مجھے پوچھنا چاہیے تھا۔ سُلکھشنا پاٹل" لڑکی مسکرائی۔

"مجھے ارون کمار کہتے ہیں" ___ خان نے اُس کی مکمل حوصلہ افزائی کی ___ "ا... کے سلسلے میں آیا ہوں ___ اور اجنبی ہوں"۔

"بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر" ___ لڑکی نے اپنا ہاتھ بے اختیار آگے بڑھا... اُس کا ہاتھ تھامتے ہوئے خان نے بھی بڑی گرمجوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

سُلکھشنا پاٹل بمبئی سے یہاں آئی تھی لیکن وہ یہاں اکثر آتی رہتی تھی۔ اُس کی... کا قریباً سارا خاندان یہیں آباد تھا۔ باپ کی تمام رشتہ داریاں بھی اِسی شہر میں تھیں... بزنس کے سلسلے میں وہ مہاراشٹر میں پچھلے دس سال سے سیٹ ہو چکا تھا اور اپنے... کو بھی وہیں لے گیا تھا۔

سُلکھشنا نے ہائی سکول تک بٹھنڈہ ہی میں تعلیم حاصل کی تھی اور عمر کا زیادہ... نانی کے پاس گزارا تھا۔ اب بھی جب کبھی اُسے موقعہ ملتا وہ داؤ لگا کر اُس سے... جاتی تھی۔ امیر لوگ تھے، دولت کی ریل پیل تھی ہوائی جہاز سے آنا جانا اُس کے... نہیں تھا۔

بیرے کی آمد تک سُلکھشنا نے اپنے تمام جسمانی نشیب و فراز سے خان کو... پہنچا دی تھی اور دونوں آپس میں خاصے فری بھی ہو چکے تھے۔ یوں بھی اس معا...

...گئے اور پھر حسنِ اتفاق سے سوسائٹی کی ایک ہی کلاس سے تعلق رکھنے والوں کا آپس میں گھل مل جانا کوئی اچھنبے کی بات نہیں تھی۔

خان نے اُسے بتایا کہ وہ ایک کاروباری آدمی ہے اور ابھی تک "زیرِ تربیت" بھی ہے۔ اس نے سُلکھشنا کے لیے کارن سُوپ بھی منگوا لیا تھا اور سُوپ کی چسکیاں لیتے ہوئے دونوں ایک دوسرے کو چاٹ جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے مصروفِ گفتگو تھے۔

"مجھے کاروباری لوگوں سے سخت نفرت ہے لیکن آپ سے نجانے کیوں میں نفرت نہیں کر پا رہی۔ شاید آپ باہر ہی سے کاروباری ہوں۔ اندر سے انسان....." اُس نے ... آنکھوں میں مسکراتے ہوئے جھانکا۔

"ہاں سُلکھشنا جی ___ سچ کہا آپ نے، واقعی ہیں باہر سے کاروباری ہوں" ___ ... آواز یک لخت بدل گئی۔ یوں جیسے وہ دکھی ہو گیا ہو۔ پھر اُس نے سُلکھشنا کو ایک دردناک کہانی سُنا دی کہ وہ تو اصل میں آرٹسٹ بننا چاہتا تھا لیکن "ظالم ...نے اُس سے اپنی مرضی سے زندہ رہنے کا حق اُس کے پتاجی کے مرنے کے ... چھین لیا تھا۔

اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ سُلکھشنا بھی اپنے باپ کے طرزِ عمل سے نالاں ہے ... کہ وہ لاکھ ماڈرن ہونے کے باوجود اب بھی موقع ملتے ہی بھاگ... چلی آتی ہے۔ اُس کی اِسی کمزوری پر اُس نے ضرب لگائی تھی۔

... ہی نظر میں سُلکھشنا اُسے عام سی ہندو لڑکی دکھائی پڑی تھی اور یہ تھی ... محض آدھ گھنٹہ ہی میں سُلکھشنا اُس سے گھل مل گئی۔

دونوں ڈائننگ ہال سے اُٹھ کر کمرے میں چلے آئے تھے۔ خان نے بیرے ... میں کافی لانے کی ہدایت کی تھی۔ اور دونوں اب کافی کی پیالیاں سامنے ... کے دُکھ درد پر جان دے رہے تھے۔

سُلکھشنا نے بڑی بے باکی سے اس بات کا اقرار کر لیا تھا کہ وہ بھی عام ہندو لڑکیوں کی طرح عورت کی عصمت کو بے معنی چیز سمجھتی ہے اور روحانی سے زیادہ، جسمانی تعلق پر یقین رکھتی ہے۔ لیکن اُس نے یہ بھی سچ کہا تھا کہ وہ یہ سب کچھ محض اس لیے کر رہی تھی کہ یہ عمل بہت پہلے سے جاری ہے اور اُسے بھی بہرحال اس میں سے گزرنا ہے۔ اُس کے ماں باپ اس کے سامنے شراب پیتے تھے۔ انہوں نے کالج لائف کے آغاز ہی سے اپنی بیٹی کو بھی شراب کے ذائقے سے آشنا کر دیا تھا اور اب وہ وقت کی بہت سی لہروں میں سے ایک لہر بن کر حالات کے دھارے پر بہہ رہی تھی۔

باتیں کرتے ہوئے اُس نے اپنے جسمانی خطوط کی مکمل نمائش کا مشن جاری رکھا تھا یہ الگ بات کہ خان کا ذہن کچھ اور ہی سوچ رہا تھا۔ فی الوقت اُسے تمام کارڈز میں رکھنے تھے۔ اس لیے بادلِ نخواستہ وہ اُس میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی ظاہر کرنے پر مجبور تھا لیکن جب بات حد سے بڑھ لگی تو اُس نے سُلکھشنا کو نیچے چلنے کی دعوت سُلکھشنا کے "نز نز" کرنے کے باوجود وہ بڑی بے تکلفی سے اُس کا ہاتھ تھامے اُسے نیچے ڈائننگ ہال میں لے آیا۔ ہال میں داخل ہوتے ہی بے اختیار اُس کے منہ سے آواز بلند ہوئی؛ "آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا"۔ وہاں کیبرے ناچ ہو رہا تھا اور کی بدبو کے بھبھوکے اُٹھ رہے تھے۔ بمشکل خان نے اپنی متلی کو کنٹرول کیا۔

بالآخر یہ اذیت ناک ناچ ختم ہوا اور اُس نے خدا کا شکر گزارا۔



جب سُلکھشنا اور خان ڈائننگ ہال میں داخل ہوئے عین اُن لمحات میں منوہر ایک خوبصورت لڑکی کا ہاتھ تھامے ڈائننگ ہال میں داخل ہو رہا تھا۔ آج خلافِ معمول اُس نے نہایت قیمتی سوٹ زیب تن کیا ہوا تھا۔

پہلا گلاب

ہال کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر کامریڈ منوہر لال نے طائرانہ نظروں سے اندر موجود جوڑوں کا جائزہ لیا؛ اُس کی نظریں مختلف چہروں سے پھسلتیں خان پر جم کر رہ گئیں جس سوٹ پر گلاب کا پھول تو لگا رکھا تھا لیکن یہ خان ہی جانتا تھا کہ اُس نے کتنی مشکلوں پیلے رنگ کا گلاب حاصل کیا تھا۔

بری طرح سُلکھشنا اُس سے چمٹ کر رہ گئی تھی۔ اِس کے بعد سوائے اُس سے باتیں وہ کوئی اور کام کرنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا لیکن اپنی "پہچان" کے لیے یہ پیلا بہرحال اُس نے ہوٹل کی بالکنی میں لٹکتے ایک گملے سے اُتار ہی لیا تھا۔

سُلکھشنا اُسے حیرت سے پھول چوری کرتے دیکھتی رہی۔

"پیلا گلاب میری زبردست کمزوری ہے ـــ جہاں کہیں بھی نظر آجائے۔ یہی حال ہوتا اُس نے اِس بات کا اطمینان کر لیا تھا کہ کسی نے سوائے سُلکھشنا کے اُسے یہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔

"ہے لوگ تو سُرخ گلاب پر مرتے ہیں مگر آپ......؟"

"میں ایسا ہی ہوں۔ بسا اوقات میں کئی ضروری اور اچھی باتیں اپنی انفرادیت کے چکر میں چھوڑ دیتا ہوں" ـــ اُس نے سُلکھشنا کی بات بڑے فلسفیانہ

انداز میں کاٹ دی۔

پھول کوٹ کے کالر میں سجا کر وہ نیچے ہال میں آیا ـــــ تو ڈائننگ ہال میں بیٹھے دو تین عورتوں اور مردوں نے اُس کے کالر میں لگے اِس پیلے رنگ کے پھول کو عجیب سی نظروں سے دیکھا بھی لیکن وہ بظاہر ہال میں موجود لوگوں کی موجودگی سے بے نیاز شکستگی ہی میں مگن تھا۔



کامریڈ منوہر لال کے ساتھ چپٹی ہوئی لڑکی گو کہ شکل سے فاحشہ نہ لگتی تھی لیکن اس کے اطوار بالکل فاحشہ عورتوں کے سے تھے ـــــ اُس نے اچانک ہی کامریڈ کا ہاتھ کھینچ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا تھا اور وہ اُس کے ساتھ ہی کھنچتا ہوا خان کے بالکل سامنے والی میز پر آکر جم گیا تھا۔

مودب بیرے نے مینو لا کر اُس کے سامنے رکھ دیا۔ منوہر لال نے اُسے جو آرڈر لکھایا وہ کوئی نواب ہی لکھا سکتا تھا۔ لڑکی اُس سے پہلے ہی متاثر تھی، اب تو بالکل ہی دب کر رہ گئی تھی۔

"میں تو صرف سبزیوں کا سوپ پیئوں گا لیکن تمہیں ڈاکٹر نے میرے خیال سے ابھی کسی شغل سے منع نہیں کیا" اُس نے اپنی ساتھی کو متوجہ کیا۔

اس کی ساتھی لڑکی کو اُس کا ساتھ دیتے ہوئے اب خاصی اُلجھن ہونے لگی تھی وہ بھٹنڈہ کے اونچے حلقوں خصوصاً شرفا اور اعلیٰ افسران میں اُٹھنے بیٹھنے والی شریف تھی خود اُس کا خاوند ایک بڑا سرکاری افسر تھا یہ الگ بات کہ اکثر اس کی ڈیوٹی شہر سے باہر ہی رہا کرتی تھی اور وہ بیچاری اپنی "تنہائی" کا دکھ ختم کرنے اعلیٰ سوسائٹی میں اُٹھنے بیٹھنے لگی تھی۔

منوہر لال بھی ایک دن یوں ہی اُسے ٹکرا گیا تھا۔ دونوں کا تعارف آج سے

آٹھ ماہ پہلے لدھیانہ میں ہوا تھا۔ اُس نے پہلی ملاقات میں منوہر لال کو بھی شرفا کے اس حلقوں ملتے ہی کا نمائندہ جانا تھا جس سے اُس کا واسطہ رہتا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ اُس پر اُن چار سو روپے خرچ کرنے کے بعد اب منوہر لال اُن کا عوضانہ بھی وصول کرے گا لیکن اُسے بڑی خوشگوار حیرت کا سامنا کرنا پڑا۔ جب اُس نے دیکھا کہ منوہر لال نے نہ تو شراب کو چھوا نہ ہی "میٹ" کے نزدیک پھٹکا۔ وہ رات کافی دیر تک ہوٹل کے لان کے ایک لمبے تاریک گوشے میں بیٹھے رہے، کئی مرتبہ دورانِ گفتگو اُس کا جی چاہا کہ اب منوہر لال اُسے فوراً اپنے کمرے میں جانے کی دعوت دے کیونکہ ٹھنڈی ہوا نے شراب کا نشہ دو آتشہ کر دیا تھا لیکن منوہر نے رات زیادہ گزر جانے کا احساس دِلا کر اُس سے اجازت طلب کر لی۔

اس کے بعد بھی وہ لوگ آٹھ دس مرتبہ آپس میں ملے تھے لیکن کیا مجال جو کبھی اُس نے منوہر لال کی آنکھوں میں خار دیکھے ہوں ـــــ اوّل تو اُسے اِس گہری آنکھوں میں جھانکنے کا موقع ہی نصیب نہ ہوتا اور اگر کبھی منوہر لال اُس کی آنکھوں میں جھانکتا تو وہ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوبتی چلی جاتی جہاں ایک پُر اسرار تقدس کے سوا اُسے اور کچھ دکھائی نہ پڑتا۔

آج بھی وہ اچانک ہی آ گیا تھا اور وہ دونوں ڈنر کھانے کے لیے اس ہوٹل میں آئے ہوئے تھے۔ بیرے نے بڑے اہتمام سے اُن کے سامنے ڈنر سجا دیا تھا۔

منوہر لال بظاہر اپنی ساتھی کی گفتگو میں مکمل دلچسپی لے رہا تھا لیکن اصل میں وہ خان کی طرف متوجہ تھا۔ اُسے بخوبی احساس ہو چکا تھا کہ خان نے لڑکی کو بادلِ نخواستہ ہی اپنے ساتھ اُسی کی طرح چمٹایا ہوا ہے۔

خان اور اُس کی ساتھی لڑکی دونوں اب کھانے سے فراغت حاصل کر چکے تھے! بل خان نے ہی ادا کیا تھا اور دونوں اُٹھ کر اب ہوٹل کے اُس راستے کی طرف جا رہے

تھے جو انہیں رہائشی کمروں کی طرف لے جاتا۔

اُنہیں سیڑھیوں کی طرف بڑھتا دیکھ کر اچانک ہی منوہر لال پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اُس کی ساتھی لڑکی حیرانگی اور تشویش کے ملے جلے جذبات سے منوہر لال کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"شما کرنا (معاف کرنا)" اُس نے اپنی ساتھی لڑکی سے معذرت کی اور باتھ روم کی طرف آگیا۔

باتھ روم میں داخل ہوتے ہی اُس کی کھانسی ختم ہو گئی ایک لمحے کا توقف کیے بغیر وہ دوسرے راستے سے ہوٹل کے رہائشی کمروں کی طرف مڑ گیا۔ اُس نے دانستہ وہ راستہ اختیار کیا تھا جس پر اُس کا ٹکراؤ خان سے ہو سکے۔ خان نے بھی اُس کی طرح لفٹ استعمال کرنے کی بجائے سیڑھیوں کا راستہ اپنایا تھا۔ وہ بھاگم بھاگ ہوٹل کی بالکونی میں پہنچا تو خان بالکونی سے آگے اُس واحد راستے کی طرف جاتا دکھائی دیا جس کے بعد رہائشی کمروں کی قطار شروع ہو جاتی تھی۔

اپنی دانست میں منوہر لال نے بہت احتیاط اختیار کی تھی، لیکن خان کے حساس کان اور بیدار چھٹی حس نے بالکونی سے گھومتے ہی تعاقب کا احساس کر لیا تھا۔ شکنتلا کو خاصی [illegible] گئی تھی اور وہ اونچی اونچی آواز میں قہقہے لگاتی اُس کے ساتھ ہی اوپر تک آئی تھی۔

منوہر لال دبے پاؤں اُس کے پیچھے آرہا تھا۔ خان کے لیے اب سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ اپنے تعاقب میں آنے والے کو یہ احساس دلائے بغیر کہ اُسے تعاقب کا علم ہے اپنے کمرے میں چلا جائے اور اُس نے وہی کیا۔ شکنتلا کی کمر میں ہاتھ ڈالے بھارتی معاشرے کی مروجہ اخلاقیات کے عین مطابق وہ کمرے میں گھس گیا۔

منوہر لال جو اس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا اُس سے دو قدم آگے جا کر رُک گیا۔ اُس نے کمرے کا نمبر نوٹ کیا۔ دل ہی دل میں اُسے دو تین مرتبہ دہرایا اور بڑی تیزی

سے نیچے آگیا۔ جہاں اُس کی ساتھی خاتون بیقراری سے اُس کی منتظر تھی۔

"خیریت تو تھی ــــ" اُس نے منوہر لال کی طرف اپنی سیٹ چھوڑ کر کھڑے ہوتے ہوئے بیقراری سے بڑھ کر کہا۔

"بس۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا" منوہر لال نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔

"کیا مطلب؟ کیا ہوا؟"

"آج چھ ماہ بعد ایک دوست کے بضد ہونے پر ایک پیگ لے لیا تھا۔ اب چھ ماہ تک بھگتوں گا! اُف ــــ بھگوان نے مجھے بیماری ہی لگانی تھی تو کوئی اور لگا دیتا" اُس نے اپنے لیے میدان ہموار کرنے کا یہ موقع بھی ڈھونڈ لیا تھا۔

"اوہ مائی گارڈ" ــــ عورت پریشان نظر آرہی تھی۔

"میرے خیال سے اب چلنا چاہیے۔ میری طبیعت ابھی تک ٹھیک نہیں ہوئی" منوہر لال نے معذرت کی۔

"اوہ ضرور، ضرور" ــــ عورت نے بیرے کو متوجہ کرنے کے لیے چمچ بجایا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ہوٹل سے باہر آرہے تھے ــــ منوہر لال کے نہ نہ کرنے کے باوجود اُس کی ساتھی خاتون نے بل خود ادا کیا تھا ــــ ہوٹل کے پارکنگ ایریا میں کھڑی ایک کار کی طرف دونوں بڑھ رہے تھے۔

ڈرائیونگ سیٹ عورت نے ہی سنبھالی تھی اور منوہر لال اُس کے ساتھ بہت نڈھال سا ہو کر بیٹھا تھا۔ ازلی بیماروں کی طرح اُس نے اپنی ٹانگیں پھیلا لی تھیں اور پشت پر بے دم سا ہو کر گر پڑا تھا۔

"میری مانو تو آج میرے ہی گھر پر رہ لو ــــ" عورت نے اس کی تشویشناک حالت پر اظہار ہمدردی کیا۔

"نہیں ڈیئر ــــ سوچتا ہوں اِس مختصر زندگی میں کوئی کام اُدھورا نہ چھوڑ جاؤں"

"ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ تم نہیں جانتے منوہر لال میں تم سے کتنی محبت کرنے لگی ہوں۔" اُس کی آواز بھرّا گئی تھی۔

"سیما دیکھو نارمل رہا کرو ـــــ میں تمہارا بہت احترام کرتا ہوں۔ ہم اچھے دوست ہیں میرے لیے یہی بہت ہے۔ ایک ایسا آدمی جس کی زندگی کا پل بھر بھی بھروسہ نہ ہو۔ اُس کے متعلق ایسی سوچ رکھنا درست نہیں۔ میری بیماری ابھی تک ڈاکٹروں کی سمجھ میں نہیں آئی۔ صرف یہ کہتے ہیں کہ شراب اور میٹ چھوڑ دوں۔ میں نے چھوڑ دیا ہے۔ بس کبھی بدقسمتی سے بے احتیاطی ہو جائے تو جان پر بن آتی ہے۔"

"میرے ساتھ چلو نہ دہلی! میرا کزن سپیشلسٹ ہے ـــــ اُسے کیوں نہیں دکھاتے؟"

"اچھا دیوی جی! ابھی تو مجھے یہاں ڈراپ کیجئے نا ـــــ پھر کبھی یہ بھی سوچیں گے۔"

منوہر نے اُسے کار روکنے کو کہا۔

آج شاید پہلی مرتبہ اُس نے منوہر کی بات نہیں مانی تھی اور اس کے منع کرنے کے باوجود وہ اُسے اپنے گھر لے آئی تھی۔ اوّل تو اُس کا خاوند گھر پر تھا ہی نہیں اور اگر ہوتا بھی تو اُس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ ہوتی۔

بیڈروم میں پہنچتے ہی منوہر لال نڈھال سا ہو کر بستر پر گر گیا۔ سیما نے بڑے احترام اور محبت سے اُس کے جوتے اور کوٹ اُتار دیا اور اس پر گرم کمبل ڈال کر باہر نکل آئی۔ اُس کی زندگی میں منوہر لال پہلا ایسا مرد آیا تھا جس نے اُسے مردانگی کے احترام پر مجبور کر دیا تھا ورنہ آج تک تو وہ خود کھلونا بنی رہی تھی یا پھر اُس نے مردوں کو کھلونا بنائے رکھا تھا۔

دروازہ بند ہونے کی آواز سُن کر بھی وہ اُسی پوزیشن میں دم سادھے لیٹا رہا۔ قریباً پانچ منٹ بعد وہ اٹھا دروازہ اُس نے اندر سے لاک کر دیا۔ اس کا ہاتھ ہی سرہانے تپائی پر دھرے ٹیلیفون کی طرف بڑھا لیکن کریڈل پر ہاتھ رکھ کر چند لمحے کچھ

سوچنے کے بعد اُس نے فون وہیں رکھ دیا۔

اُس کی آنکھیں بڑی بے چینی سے کمرے میں سبھی اشیاء کا جائزہ لے رہی تھیں۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ ٹیپ ریکارڈر کی طرف بڑھا۔ ٹیپ ریکارڈر کے ساتھ درجنوں کیسٹ رکھے تھے۔ اُس نے قدرے ایک پرانا کیسٹ ٹیپ ریکارڈر میں لگا دیا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔ اب اُس کا رُخ ڈرائنگ روم کی طرف تھا۔

ڈرائنگ روم میں ہلکی روشنی کا بلب جل رہا تھا۔ سیما غالباً سونے کی تیاری کر رہی تھی اُسے آتے دیکھ کر اُس نے لائٹ جلا دی۔

"خیریت تو ہے ـــــ" وہ بے چین ہو گئی۔

"بالکل ٹھیک ہوں سیما! دیکھو تم یہ زیادتی نہ کرو۔ میں یہاں سو جاتا ہوں، تم اپنے بیڈروم میں سو جاؤ۔" اُس نے اظہار ہمدردی کیا۔

"اوہ منوہر تمہیں اٹھنا نہیں چاہیئے تھا۔ چلو چلو! میں تمہیں چھوڑ آؤں۔" وہ منوہر کے منع کرنے کے باوجود اُسے بیڈروم تک چھوڑ گئی۔ بیڈروم کا دروازہ بھی اُس نے باہر سے بند کر دیا تھا۔

آدھ گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد منوہر ایک مرتبہ پھر کمرے سے باہر نکلا اور یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ سیما سو گئی ہے۔ بیڈروم میں واپس آگیا۔ اُس نے معمولی روشنی کا بلب بھی بجھا دیا تھا اور کھڑکی کے سامنے سے پردہ بھی سرکا دیا تھا تاکہ چاند کی روشنی اندر آسکے۔ اس روشنی میں اُس نے کیسٹ پر ایک پیغام ریکارڈ کیا اور اُسے اپنے سرہانے رکھ کر لیٹ گیا۔ ٹیپ کو دوبارہ اُس نے بالکل اُسی پوزیشن میں رکھ دیا جس میں وہ پہلے تھی۔ پردہ اپنی جگہ پر کرنے کے بعد اُس نے ایک مرتبہ پھر صورتِ حال کا جائزہ لیا اور دروازہ اندر سے لاک کر کے سو گیا۔



وہ رات خان کے لیے الف لیلیٰ کی کوئی طلسماتی رات بن کر رہ گئی تھی۔ اُسے شُکھشنا اور خود سے اعصاب شکن جنگ لڑنا پڑی تھی۔ خاصی رات گئے جب شُکھشنا کا نشہ قدرے اُترا تو اُسے احساس ہُوا کہ اُسے واپس بھی جانا ہے اور خان نے اُس کے جاتے ہی سجدہ شُکر ادا کیا۔ رات قریباً دو بجے وہ سویا اور صبح سات بجے تک وہ سوتا رہا۔

اُس کی نیند فون کی گھنٹی کی آواز سے کُھلی تھی! پہلے تو وہ ایک دو لمحے کے لیے بھونچکا ہی رہ گیا کہ اُسے کس نے فون کیا ہے۔ پھر کچھ سوچتے ہوئے اُس نے لیٹے لیٹے فون اٹھا کر "ہیلو" کہہ ہی دیا۔

"روم نمبر ۹۴۲ سر"۔۔۔ "یور کال پلیز" آپریٹر لائن پر تھا۔

"او۔ کے"۔۔۔ اُس نے آپریٹر کو اجازت دے دی۔

تھوڑی دیر بعد ایک غیر مانوس سی آواز اُسے ٹیلیفون پر سنائی دے رہی تھی!

"آپ "سنام" سے تو نہیں آئے جی۔"

لفظ "سنام" پر وہ چونکا۔ اُس کا دل بھی ایک مرتبہ زور سے دھڑکا۔

"آپ کہاں سے آئے ہیں؟"۔۔۔ اُس نے اب "کوڈ ورڈز" کا تبادلہ شروع کر دیا تھا۔

"جی میں تو البوہر سے آیا ہوں۔"

"کیا ہے آپ کے پاس کپڑا، سگریٹ، خوشبویات کس کا بزنس کرتے ہیں؟"

"مَیں تو اشیائے خوردونوش کا بیوپاری ہوں مہاراج۔"

"اوہ تو آپ ہیں درشن لال جی۔" اُس نے آخری پتہ بھی پھینک دیا۔

"ہاں مسٹر ارون"۔۔۔ دوسری طرف سے جواب پر اُسے مکمل اطمینان ہو گیا۔

"میرے لائق کیا سیوا ہے؟"

"آپ کو تھوڑی دیر بعد ملتا ہوں۔"

"او۔ کے"۔ سلسلہ منقطع ہو گیا۔

⊙

خان نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ اپنے آدمیوں میں پہنچ تو گیا۔ یہ بات اِس کے لیے [illegible] اطمینان تھی۔

اس ہوٹل میں آنے سے پہلے اُس نے ایک خاص نمبر پر صرف اپنے ہوٹل کا نام بتا کر [illegible] بند کر دیا تھا۔ اور رات ڈنر پر ہدایات کے مطابق اپنے کوٹ کے کالر میں پہلے [illegible] کا پھول لگا لیا تھا۔ اب اُسے یہ اطمینان ضرور ہو گیا تھا کہ رات اُس کا تعاقب کسی [illegible] آدمی نے نہیں بلکہ اُس کے اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک نے کیا تھا۔

وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا! اُس نے ناشتہ اپنے کمرے ہی میں منگوایا اور [illegible] بدلتے ہوئے ناشتے کا منتظر تھا کہ دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ خان نے [illegible] کر دروازہ کھولا کہ ناشتہ آگیا ہے لیکن دروازے پر ایک خالی ہاتھ سٹیورڈ اُس [illegible] تھا۔

"سر ایکسکیوز می! آپ کے لیے"۔۔۔ کہہ کر اُس نے ایک بند لفافہ خان کی طرف [illegible] دیا۔

"تھینک یو"۔۔۔ اُس نے سٹیورڈ کو ٹپ کیا اور اندر چلا آیا۔

لفافہ موٹے کاغذ کا تھا اور اسے احتیاطاً سٹیپلر سے بند کیا گیا تھا۔ خان نے [illegible] سے پہلے یہ اطمینان حاصل کر لیا تھا کہ اُسے راستے میں چیک تو نہیں کیا گیا؟ [illegible] اس نے میز پر رکھ دیا اور ناشتے کا منتظر ہو رہا۔ تھوڑی دیر بعد ناشتہ آگیا۔

ویٹر کے جانے پر اس نے دروازہ لاک کیا اور لفافہ چاک کر دیا۔ لفافے سے ایک [illegible] اور چابی برآمد ہوئی۔ خط میں صرف اتنا لکھا تھا کہ وہ ریلوے اسٹیشن کے لاکر نمبر ۴۵

سے ایک کیسٹ نکال لے اور رات ہونے تک اپنا پیغام وہاں رکھ دے۔

خط پڑھنے کے بعد اُس نے جلا کر واش بیسن میں ضائع کر دیا اور ناشتہ مکمل ہونے پر اُس نے کمرے سے ہی سُلکھشنا کا نمبر ملایا ـــــ وہ ابھی تک سو رہی تھی۔ خان نے اُسے تائیدِ ایزدی جانا۔ اِس طرح وہ اِس کی مزید صحبت سے قدرے محفوظ بھی رہ سکتا تھا! اپنا نام اُس نے نوٹ کروایا اور کمرہ لاک کر کے باہر نکل گیا۔ اُس کا رُخ بھٹنڈہ کی اُس آبادی کی طرف تھا جہاں اکثر ملازمین رہائش پذیر تھے اور جس کا ایڈریس اُسے بوڑھے نے دیا تھا۔

○

اُس نے جان بوجھ کر پہلے قریباً ڈھائی تین گھنٹے تک بٹھنڈہ کے مختلف حصوں کا جائزہ لیا اور جب وہ دوپہر کے قریب شادی والے گھر پہنچا تو بٹھنڈہ اُس کے لیے اجنبی نہیں رہا تھا۔ اُس نے باہر بیٹھے نوجوانوں میں سے ایک کے ذریعے اندر پیغام بھیجا۔ بمشکل دو ہی منٹ کے بعد اُس کے سامنے رما کھڑی تھی۔ اُس کے سینے کا زیر و بم خان کو یہ احساس دلانے کے لیے کافی تھا کہ وہ اُس کا نام سُن کر بھاگتی ہوئی آئی ہے۔ اچانک خان کو سامنے دیکھ کر وہ گُنگ ہی تو رہ گئی تھی اور یہی حال خان کا بھی تھا! اُس نے گو کہ رما کو بس کے سفر میں بھی جی بھر کے دیکھا تھا لیکن آج تو اُس کا سراپا واقعی قیامت ڈھا رہا تھا۔ رما اتنی خوبصورت بھی ہو سکتی ہے۔ اُس کو تو کبھی گمان بھی نہیں گزرا تھا۔ وہ شاید زندگی کے کمزور ترین لمحے تھے جب وقت کی گرفت اُس پر سخت ہو گئی تھی۔ خان نے اُس کیفیت سے فرار ضرور چاہا تھا لیکن اُس کی تو ایک اسیرِ بے دام سے زیادہ اور کچھ نہیں تھی۔

اُس لمحے خان کو احساس ہُوا جیسے وہ بہت لمبی مسافت طے کر کے صرف اسی لیے یہاں پہنچا تھا کہ رما اُسے مل جائے۔ اُس نے موت کی لمبی سرحد جو پچھلے تین روز میں پار کی

تھی، صرف اِس لیے کہ زندگی رما بن کے اُس سے گلے آن ملے۔

آج شاید یہاں رسمِ مہندی ہی ادا کی جا رہی تھی۔ اُسی مناسبت سے اُس نے سرمئی رنگ کی ساڑھی زیبِ تن کر رکھی تھی۔ ہاتھوں اور بالوں میں کلیوں کے گجرے سجائے جب وہ اُس کے سامنے آئی تو خان کو یوں محسوس ہوا جیسے زندگی کے تپتے جھلستے ریگزاروں میں سفر کرتے ہوئے اچانک شام اُتر آئی ہو۔ ایک ٹھنڈک ایک بے نام سی طمانیت اُس کے اندر اُترتی چلی گئی۔

اُس کی حالت اُن مسافروں جیسی تھی جو صدیوں کا سفر پاٹنے کے بعد منزل کو اچانک پالیتے ہیں۔

حُسن کی دیوی نے دونوں ہاتھ پاربتی کی طرح اپنے سینے پر باندھ کر اُسے نمسکار کیا۔ خان کے ہاتھ بھی کسی میکانکی عمل کے تابع اوپر اُٹھے اور بندھتے چلے گئے۔ دونوں کی قوتِ گویائی سلب ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

"اندر آئیے نا" ـــــ بالآخر رما نے ہی حوصلہ کیا۔

"جی اچھا" ـــــ کہہ کر وہ مبہوت سا اُس کے پیچھے پیچھے اندر آ گیا۔

دونوں کو بہت سے لوگوں کے درمیان سے گزر کر کمرے تک پہنچنا تھا! لوگوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے اُسے بہت سی نظریں اپنے جسم پر چُبھتی محسوس ہوئی تھیں۔ ایک آدھ فقرہ بھی تفریحاً یا مذاقاً رما کی طرف اُچھالا تھا۔ اُس وقت خان رما کے چہرے پر دوڑتی حیا کی سُرخی نہ دیکھ سکا۔

اس سفر کا اختتام ایک چھوٹے سے کمرے پر ہُوا۔ کمرے کے ایک کونے میں سامان تھا اور زمین پر چٹائی بچھی ہوئی تھی اور ایک کونے میں کُرسی دھری تھی۔ بالکل شادی والے گھروں کا سا ماحول تھا۔ شاید سہائے فیملی کو یہ کمرہ گھر والوں کی طرف سے دیا گیا تھا۔

"کیسے ہیں آپ ۔ بہت دیر کردی آپ نے آنے میں" ۔۔۔ رما کے لہجے میں گھلی اپنائیت
نے اُسے ایک مرتبہ تو ہلا کر ہی رکھ دیا تھا ۔

"دیر کیسی ؟ ابھی کل ہی کی تو بات ہے ۔ آج میں آگیا" خان نے سنبھالا لیا ۔

"بیٹھ جائیے ناں ۔ کب تک کھڑے رہیں گے آپ" اُس نے کمرے میں دھری
کرسی کی طرف اشارہ کیا ۔۔۔ "اِسے اپنا ہی گھر جانیئے ۔ لیکن نہیں ۔۔۔ شاید میں غلط
کہہ گئی ۔ آپ کا گھر تو بہت بڑا ہوگا"

"رما جی بات گھر کی نہیں ۔ گھر کے مکینوں کی ہوتی ہے ۔ جس گھر میں آپ ایسے
لوگ موجود ہوں ۔۔۔۔"

"یہ ہمارا گھر نہیں" ۔۔۔ رما نے ہنستے ہوئے بات کاٹ دی ۔ "ہمارا گھر تو دہلی میں
ہے ۔"

"آپ جس گھر میں بھی آئیں گی ۔ وہی گھر سج جائے گا" ۔۔۔ خان کہے بغیر نہ رہ سکا ۔

"بیٹھئے ناں ۔ میں آپ کے لیے چائے لاتی ہوں ۔ باقی سب لوگ تو ابھی بازار گئے
پتا جی کہہ گئے تھے آپ آئیں تو جانے نہ دوں"

"شکریہ" کہتے ہوئے وہ کرسی پر بیٹھ گیا ۔

O

رما اپنے تبسم کی بجلیاں اُس پر نچھاور کرتی باہر چلی گئی ۔۔۔ کمرے میں وہ
رہ گیا ! اندر تو کوئی نہ آیا لیکن باہر خاصا ہنگامہ برپا رہا ۔ شاید اس مکان کے کسی
والے کمرے میں لڑکیاں مل کر شادی بیاہ کے گیت گا رہی تھیں ، لیکن خان
بولوں سے بے نیاز صرف یہ سوچ رہا تھا : کہ وہ اتنا کمزور کیوں ہوگیا ہے ؟ اُس
نے اس پر کیا سحر پھونک دیا ہے کہ وہ اِس کی آنکھوں کی گہری جھیل میں ڈوب
ہے ۔

اُسے اپنے رویئے کی کوئی خاص توجیہہ دستیاب نہیں تھی اور وہ خاصی اُلجھن محسوس
لگا تھا ، اس اُلجھن سے نجات اُسے تب ملی جب رما ہاتھوں میں ٹرے تھامے
داخل ہوئی ۔

"معاف کیجئے ۔ آپ کو انتظار کرنا پڑا ۔۔۔" اُس نے برتن وہیں چٹائی پر رکھ دیئے اور
اُس پر بیٹھ کر خان کے لیے چائے بنانے لگی ۔۔۔ "بور تو نہیں ہو رہے آپ ۔"
کی پیالی خان کی طرف بڑھاتے ہوئے اُس نے کہا ۔

"نہیں تو ۔ آپ کے ہوتے ہوئے بوریت کیسی ؟" خان کو اپنے لفظوں کی ادائیگی پر بھی
اختیار نہیں رہا تھا ۔ "آپ یہاں نیچے کیوں بیٹھی ہیں ۔" وہ اُٹھ کر کھڑا ہوگیا ۔ کچھ بھی
تھا تو وہ مسلمان زادہ ۔۔۔ عورت کا احترام اس کی گھٹی میں پڑا تھا : وہ رما کے "نہ نہ"
کے باوجود اُس کے قریب ہی چٹائی پر بیٹھ گیا ۔

کی ٹرے دونوں کے درمیان رکھی تھی اور رما سوچ رہی تھی : یہ واقعی انسان ہے
کے روپ میں کسی دیوتا نے جنم لے لیا ہے ؟ ۔۔۔ اُس کے نزدیک وہ ہندو نوجوان کوئی
ہی ہوسکتا تھا جو عورت کا احترام بھی کرتا ہو ، ورنہ تو یہاں عورت کو جسمانی لذت کے
کا ایک ذریعہ سمجھنے کے علاوہ کوئی مرتبہ ہی نہیں دیا جاتا تھا ۔

وہ جس کالج میں پڑھتی تھی وہاں آئے روز اُس کی کوئی نہ کوئی ہم جماعت کسی نہ
کی درندگی کی بھینٹ چڑھ جاتی اور لوگ ایسے کسی بھی تازہ واقعے کے فوراً
بربریت کے خلاف جلوس نکالتے تھے لیکن اُن کے اِس جلوس پر اُن کے
ہی نہیں پولیس والے بھی ہنسا کرتے اور بس ! اس سے آگے پھر لیڈروں
کا ایک لایعنی سلسلہ شروع ہو جاتا ۔

رما کو ہمیشہ اپنے معاشرے کی ان کھوکھلی اقدار سے نفرت رہی تھی ۔ اُس کے اندر
ایک لاوا کھول رہا تھا جسے پھوٹ جانے کی راہ ابھی شاید میسر نہیں آ رہی

تھی۔ آج ــــــ پہلی مرتبہ اُسے احساس ہوا کہ "اِس معاشرے میں عورت کا احترام کرنے والے اُرون کمار جیسے نوجوان بھی موجود ہیں۔"

"کہاں چلی گئی آپ رَما جی!" خان نے اُسے گہری سوچ کی دلدل سے باہر کھینچا۔

"کہیں نہیں۔ سوچ رہی تھی۔ آپ سے مل جانا ہی میرا سوبھاگیہ (خوش قسمتی) تھا۔" یہ الفاظ بے اختیار اِس کے مُنہ سے نکلے اور خان کے دل میں ترازو کر گئے۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں" ــــــ اُسے کہنا ہی پڑا۔ کم از کم اس معاملے میں وہ اُس سے زیادہ دیر تک منافقت نہیں کر سکتا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ نمسکار" ــــــ اچانک ہی آشا اندر داخل ہوئی۔ خان تو گڑبڑا کر ہی رہ گیا۔

"ارے تم" خان نے جواب میں ہاتھ باندھے۔

"کب آئیں تم واپس؟" رَما نے اپنی خجالت مٹانے کو کہہ دیا۔ وہ خان کی دلی کیفیت کا احساس بھی کر چکی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ آشا کتنی شرارتی ہے۔

"دیدی میں تو کب سے آئی ہوں۔ آپ کی باتیں چھُپ کر سُن رہی تھی" اُس نے مسکراتے ہوئے خان کی آنکھوں میں جھانکا جو اُس سے نظریں چُرا رہا تھا۔ اُس کی اِس بات پر دونوں کے دل زور سے دھڑکے تھے ــ لیکن رَما جلدی نارمل ہو گئی وہ اپنی بہن کو اچھی طرح جانتی تھی۔

"اچھا اچھا زیادہ زبان نہ چلایا کرو" رَما نے اُسے پیار سے ڈانٹ دیا۔

"نہیں چلاتی زبان لیکن جاؤں گی نہیں۔ مجھے بھی تو اُرون کمار جی سے ملنا تھا" اُس نے بہن کو چڑایا۔

"کیا ہرج ہے رہنے دیجئے اسے" خان بھی اب سنبھل چُکا تھا۔

"ارے جاتی ہے یا...." رَما نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا اور آشا باہر بھاگ گئی۔

میں دیکھوں باقی گھر والے بھی آئے ہیں یا نہیں" وہ باہر نکل گئی۔

رَما کی واپسی بمشکل چند منٹ بعد ہی ہو گئی تھی۔ اِس کی زبانی خان کو عِلم ہوا کہ ابھی گھر کے باقی لوگ واپس نہیں لوٹے۔ آشا تو اپنی کسی دوست کے ہاں گئی تھی ... واپس آئی ہے۔"

"مجھے تھوڑی دیر کے لیے آگیا (اجازت) دیجئے۔ شام تک واپس آجاؤں گا۔ ابھی ... کام کرنا ہے۔"

"بیٹھے رہیئے ناں ــــــ ابھی سب لوگ آجائیں گے۔" رما کا دل نہیں چاہتا تھا کہ وہ ... جائے۔

"... جی کس کمبخت کا جی چاہے گا آپ کے پاس سے اٹھ کر جانے کو ــــ بس ایک ... کام کرنے ہیں پھر لوٹ آؤں گا۔"

رَما نے اُسے بادلِ نخواستہ ہی جانے کی اجازت دی اور ــــــ دروازے کے باہر ... اُسے چھوڑنے آئی تھی۔ اِس دوران اُس نے نجانے خان کو کتنی مرتبہ یاد دلایا: کہ ... شام تک بہر صورت واپس آنا ہے۔



رَما سے رخصت ہو کر خان سیدھا ریلوے سٹیشن پہنچا تھا ــــــ

اُس نے پہلے سٹیشن کے گرد دو تین چکّر کاٹ کر صورتِ حال کا جائزہ لے لیا: کوئی غیر ... تو نہیں؛ کچھ سادہ کپڑوں والے اُس کی نظر میں کھٹکے ضرور تھے لیکن اس نے ... لیا کہ وہ لوگ معمول کے مطابق ڈیوٹی دے رہے ہیں۔

... سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہو کر اُس نے پھر احتیاطاً اِردگرد نظر دوڑائی اور ... دیکھ کر بالآخر وہ لاکر کی طرف بڑھا ــــــ اندر ایک لفافہ میں بند ایک ... رکھا تھا! اُس نے لفافہ اٹھایا اور بڑے اطمینان سے کوٹ کی جیب میں ڈال لیا۔

تالا لگانے کے بعد وہ پُراعتماد قدموں سے مڑا اور کچھ سوچتا ہوا نزدیکی ٹیلیفون بوتھ کی طرف چل دیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ہوٹل میں فون کر رہا تھا۔

آپریٹر کی زبانی اُسے معلوم ہوا کہ مس سُلکھشنا نامی کسی خاتون کے اب تک تین چار فون آ چکے ہیں۔ پھر "ریسپشن" سے اُسے اطلاع ملی کہ وہ قریباً آدھ گھنٹہ اُس کا انتظار کرنے کے بعد واپس چلی گئی ہے۔

خان نے خدا کا شکر ادا کیا۔ میدان فی الوقت تو صاف ہی تھا۔ وہ سیدھا ہوٹل اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُس نے دروازہ اندر سے لاک کیا اور باتھ روم کا جائزہ لینے کے بعد ٹیپ ریکارڈر میں وہی کیسٹ لگا کر سُننے لگا۔

کیسٹ پر اس کے لیے ایک خاص پیغام اور کورڈ ورڈز میں بھنڈہ کے لیے ایک کام بتایا گیا تھا۔ اُس نے دوبارہ ٹیپ چلا کر وہی پیغام سُنا اُسے ذہن نشین کیا اور پیغام واش کر دیا۔ کیسٹ اُس نے جیب میں رکھ لی تھی۔ اپنے کمرے میں بیٹھ کر اُس نے اپنے لیے چائے منگوائی اور وہیں سے سُلکھشنا کو ٹیلی فون کرنے لگا۔

اِس مرتبہ بھی سُلکھشنا اُسے گھر پر نہیں ملی تھی۔ لیکن کال موصول کرنے والی بزرگ عورت نے اُسے بتا دیا تھا کہ سُلکھشنا خود اُسے بے چینی سے ڈھونڈ رہی ہے اور اس کے ہوٹل بھی گئی تھی۔ اب وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنے کسی دوست کے گھر گئی ہے۔ خان نے پیغام لکھوا دیا کہ وہ اب صبح ہی کو اُسے ملے گا کیونکہ آج اُسے اپنے عزیزوں کے ہاں شادی میں شریک ہونا ہے۔ اُس نے بھی اپنی طرف سے انہی جذبات کا اظہار کیا تھا جو اُسے سُلکھشنا کی طرف سے موصول ہوئے تھے۔

اپنے کمرے سے باہر نکلنے کے لیے وہ ابھی پر تول ہی رہا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ خان نے ریسیور اُٹھایا ــــ دوسری طرف سُلکھشنا تھی۔

"اوہ کہاں کھو گئی ہو تم!" اُس نے بڑی بے تکلفی سے سُلکھشنا کو مخاطب کیا اور اُس کے جواب دینے سے پہلے ہی اُس سے ڈھیروں شکوے اور گلے کر دیے۔ خود سُلکھشنا کو اب اس کے مسلسل غائب رہنے پر غصہ آنے لگا تھا۔ اُلٹا خود کو شرمندہ محسوس کرنے لگی تھی۔

خان نے اُسے بتایا کہ کس بے چینی سے اُس نے سارا دن اُس کے بغیر گزارا۔ بدقسمتی سے اُسے آج شادی کی تقریب میں شرکت کرنی ہے۔ اس لیے اُس کی معذرت!

جب سُلکھشنا نے اُس سے شادی والے گھر کا ایڈریس دریافت کیا تاکہ وہاں ملاقات ہو سکے تو خان نے بڑے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بھگوان کے لیے اس کا تصور بھی نہ کرنا۔ اگر تم نے وہاں پھٹکنے کی کوشش بھی کی تو اس جائیداد سے عاق ہو جاؤں گا۔"

"بزدل کہیں کا" ـــ سُلکھشنا نے ہنس کر کہا۔

سلسلہ منقطع ہونے پر خان نے خدا کا شکر ادا کیا۔



ہوٹل سے وہ سیدھا رُماہی کے پاس چلا آیا تھا ــــ

گھر کے باقی لوگ بھی آ چکے تھے اور اُس کا بڑی بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔ بوڑھا سہائے اور اُس کی بیوی تو اس پر مٹے جا رہے تھے شاید سہائے نے انہیں بتا دیا تھا کہ لڑکا سونے کی کان ہے۔ سب ہی اِس کی خدمت پر کمربستہ تھے۔ اُردن کمار کی اس طرح اچانک آمد اُن کے لیے بہت خوشی کا باعث بنی تھی۔ بوڑھے جگن ناتھ سہائے نے اُس کا تعارف اپنے بیٹے کی حیثیت سے لوگوں میں کروایا تھا اور وہاں موجود لوگوں کی اکثریت اس "بیٹے" کو حسد اور کچھ رشک کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

رات گئے تک اس نے شادی کی تقریبات میں شرکت کی۔ ہر جگہ رُما اُس کو نمایاں نظر آئی۔ اُس کے چہرے پر نظر ٹھہرتی ہی نہیں تھی۔ رُما نے بھی بیسیوں مرتبہ مختلف بہانوں سے اپنا آپ اُسے دکھایا تھا۔ وہ عورت تھی اور قدرت نے اُسے یہ خوبی ودیعت کی تھی کہ مرد کے چہرے کو دیکھ کر اس کے دِلی جذبات کا اندازہ لگا سکے۔ وہ محسوس کر سکتی تھی کہ جس طرح دورانِ سفر وہ ارون کمار کے تیرِ نظر کی گھائل ہو گئی تھی، کچھ اُسی کیفیت میں اب ارون کمار بھی مُبتلا ہو گیا تھا۔

رات گئے وہ اُن لوگوں سے رخصت طلب کر کے ہوٹل جانے لگا تو سہائے کی بیوی بضد تھی کہ وہ اُن کے ساتھ ہی رہے، لیکن اس دوران تقریباً آدھ گھنٹے تک ارون کمار تنہائی میں جگن ناتھ سہائے کو سمجھا چکا تھا کہ اُس نے کس طرح اپنے بکھرے ہوئے پیسے ہوشیاری سے اکٹھے کرنے ہیں تاکہ اُس کے گھر والوں کو اُس کی کسی حرکت پر شک نہ گزرے۔ اسی لیے شاید سہائے نے اشارے سے اپنی بیوی کو منع کر دیا کہ وہ خان کی مرضی میں کوئی دخل نہ دے۔

رُما اُسے سڑک تک چھوڑنے آئی تھی۔ رات کے دس بج چکے تھے لیکن ابھی تک شہر میں رات کے آثار نظر نہیں آرہے تھے۔ زندگی دن کی طرح مکمل بیدار تھی۔ مارکیٹیں کھلی تھیں اور کاروبارِ زندگی اپنے عروج پر تھا۔

"جی تو نہیں چاہتا تھا جانے کو لیکن مجبوری ہے"۔۔۔ اُس نے چلتے چلتے رما سے کہہ ہی دیا۔

"آپ واپس تو آئیں گے ناں۔۔۔ دہلی۔۔۔ مَیں آپ کا بہت انتظار کروں گی"

رما سے بھی نہ رہا گیا۔

"مَیں دہلی ضرور آؤں گا اور کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔" اُس نے ایک الیکٹرک پول کے قریب رُک کر بڑے ڈرامائی انداز میں رُما کی آنکھوں میں جھانکا۔

"سچ"۔ رُما بے قابو ہوئی جا رہی تھی۔

"سچ"۔۔۔ خان نے اپنا ہاتھ اُس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کی طرف بڑھا کر اُسے مضبوطی سے تھام لیا۔ وقت کی نبضیں تو جیسے تھم گئیں۔ جانے کب تک وہ اسی طرح بے خودی کے عالم میں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے کھڑے رہتے کہ قریب سے گزرتی ایک موٹر سائیکل سوار نے بہت زور سے اُن کے نزدیک پہنچ کر ہارن دے کر دونوں کو چونکا دیا۔

"اچھا نمسکار"۔۔۔ خان نے دونوں ہاتھ باندھ کر اُسے پرنام کیا۔

"نمسکار"۔۔۔ رُما کے ہونٹ کپکپائے اُس نے لرزتے ہاتھ اپنے سینے پر ایستادہ کر لیے۔



ہوٹل کی سیڑھیوں کی طرف ابھی اُس کا پہلا قدم ہی اٹھا تھا۔ جب ایک نسوانی ... نے اُس کے قدم تھام لیے۔ کسی نے اُس کا نام لے کر اُسے مخاطب کیا تھا۔ گردن ... اُس کی نظر سُلکھشنا پر پڑی۔

"اوہ ڈیئر۔۔۔ کہاں چلے گئے تھے تم۔۔۔ اتنی دیر"۔۔۔ اُس نے شکایتی لہجے میں اُس کو مخاطب کیا۔

"معاملہ ہی ایسا تھا دیوی جی! ورنہ آپ کی صحبت تو مقدر والوں ہی کو ملتی ہے"۔

"اچھا اچھا بس زیادہ بناؤ نہیں۔ آؤ کمرے میں چلتے ہیں"۔ اُس نے بڑی بے تکلفی سے خان کا بازو پکڑ لیا۔

خان نے بھی کچھ کم بے تکلفی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ وہ فی الحال اپنے کسی بھی عمل سے ... ظاہر کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ سُلکھشنا کی کمر میں ہاتھ ڈالے وہ ... آیا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی سُلکھشنا نے ایسی بے ہودہ حرکت کی جس پر ... گیا، لیکن اس نے خود کو سنبھالے رکھا۔ ابھی تک وہ اس لڑکی کو سمجھنے کی

کوشش کر رہا تھا۔ کبھی وہ اُسے کوئی مظلوم اور ٹھکرائی ہوئی لڑکی دکھائی دیتی اور کبھی
ضرورت سے زیادہ چالاک ــــ وہ کوئی ایسی گری پڑی عورت نہیں تھی کہ اُسے خان
جیسا اور کوئی اِس شہر میں میسّر ہی نہ تھا۔

پھر ایسی کیا بات ہے؟ اُس نے خود سے سوال کیا اور اس کے ذہن نے فوراً اُس
کا دوسرا رُخ اُسے دکھانا شروع کر دیا۔

"ایکسیوزمی ڈیئر" ــــ اُس نے خان کو مخاطب کیا اور اپنا بڑا سا پرس وہیں میز پر
پھینک کر باتھ روم میں جا گھسی۔

ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح اچانک ہی اُس کے ذہن میں لپکا ایک لمحہ
کیے بغیر خان نے پرس اٹھا لیا۔ پرس لاک نہیں تھا۔ پہلی ہی جیب کھلنے پر اُس کی
اعشاریہ ۲۵ بور کے ننھے سے پستول پر پڑی۔ مزید کچھ دیکھے بغیر اُس نے پرس بند کر دیا
اِس عمل میں بمشکل ایک منٹ صرف ہوا تھا۔

جس طرح اُس نے پرس کھول کر دوبارہ بند کیا تھا۔ کوئی ہوشیار آدمی بھی اندازہ
نہیں لگا سکتا تھا کہ پرس کھول کر دیکھا گیا ہے یا اُس کے رکھنے کی جگہ تبدیل ہوئی
وہ پستول دیکھ کر ایک لمحے کے لیے چونکا ضرور تھا لیکن اب بالکل نارمل تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی سُلکھشنا باہر نکل آئی۔

"کیا منگواؤں تمھارے لیے؟" ــــ اُس نے چہکتے ہوئے پوچھا۔

"جو تمہارا دل چاہے۔"

"مَیں تو بُری طرح کھانا کھا کر آیا ہوں" ــــ اُس نے اپنے لیے میدان صاف کرتے
ہوئے کہا۔ "کافی منگوا لیتے ہیں۔"

"جو تمہاری مرضی" ــــ سُلکھشنا اُس کے اور نزدیک آ گئی۔

خان نے کچھ سوچا اور ایک پلان فوراً اُس کے ذہن میں آ گیا۔ بیرے کے کافی لا

وہ اس کی ہر بیہودہ حرکت کا جواب اُس سے زیادہ گرمجوشی کے ساتھ دیتا رہا۔ کافی اُس کے
لیے سُلکھشنا نے ہی تیار کی تھی۔ اُس نے ایک ادائے خاص سے خم کھاتے ہوئے خان کو کافی
دی تھی۔ کافی کی چُسکیاں لیتا ہوا وہ اچانک ہی اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس کی یہ حرکت سُلکھشنا
کو اُلجھا دینے کے لیے کافی تھی۔

"میرا خیال ہے اب تم کُھل ہی جاؤ" ــــ خان کا وار اتنا بھرپور اور اچانک تھا کہ واقعی
سُلکھشنا بوکھلا کر رہ گئی۔

"مم مَیں سمجھی نہیں" ــــ اُس نے اُٹھنا چاہا۔

"مَیں ہندی بول رہا ہوں مس سُلکھشنا یا جو کوئی بھی تم ہو" خان کا لہجہ بڑا سرد تھا۔

سُلکھشنا چند سیکنڈ اُسی انداز میں بیٹھی کچھ سوچتی رہی۔ پھر اُٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اُس
کے چہرے کے تاثرات بالکل بدل چُکے تھے اور تھوڑی دیر پہلے تک جو فاحشہ پن اور مکّاری
اُس کی شکل سے جھلک رہی تھی وہ غائب ہو چُکی تھی۔ اس وقت خان کو وہ کوئی بارہ سال
کی معصوم لڑکی نظر آ رہی تھی۔

"ہاں مسٹر ارون کمار آپ کا اندازہ ٹھیک ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے ہمارا اندازہ آپ
کے متعلق ٹھیک تھا" ــــ فقرے کے آخری حصّے پر خان کا سارا جسم ہی تو لرز اٹھا تھا۔
"ہمارا تعلق خفیہ پولیس سے نہیں پہلے تو یہ بات ذہن نشین کر لیجئے! البتہ اُن لوگوں سے ضرور
ہے جو اِس زمین پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں۔ کمار صاحب! پہلے روز آپ جب بھٹنڈہ
اسٹیشن پر اُترے تھے تو ہمارے گروہ کے ایک آدمی کو آپ پر شک گزرا تھا کہ آپ ہمارے
قوم کے آدمی ہو سکتے ہیں؟"

"کیا کام کرتے ہو تم لوگ" ــــ؟ خان نے بڑے سرد لہجے میں اُس کی بات کاٹی۔

"بہت سے کام۔ کوئی بھی غلط کام ــــ مجھے سب کچھ بتانے کا حکم نہیں۔ کیونکہ میری
حیثیت اُن لوگوں کے نزدیک معمولی سی فاحشہ کے سوا اور کچھ نہیں۔"

"دیکھو مجھے بنانے کی کوشش نہ کرو۔ میرا گروہ تم سے بھی طاقتور ہے، جس کا ایک ثبوت تو یہی ہے کہ میں تمہیں جان چکا ہوں۔" خان نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

سُلکھشنا نے دورانِ گفتگو اپنے پرس کی طرف سرکنا شروع کر دیا تھا۔ گو کہ اُس نے یہ حرکت بہت ہی نامحسوس انداز میں کی تھی لیکن خان کی عقابی نظروں سے وہ محفوظ نہ رہ سکی۔

"زیادہ چالاکی اچھی نہیں ہو گی تمہارے لیے ــــ" اُس نے کافی کی پیالی پکڑے ہوئے دوسرے ہاتھ سے اِس کا پرس بھی اُٹھا لیا۔ کافی کا ایک لمبا گھونٹ بھر کر اُس نے پیالی میز پر رکھ دی اور خود مُڑ کر قریبی صوفے پر بیٹھنا چاہا۔

جیسے ہی وہ صوفے کی طرف گھوما کھڑی ہوئی سُلکھشنا کے جسم میں حرکت پیدا ہوئی۔ اُس نے اپنی دانست میں خان کو بے خبر پا کر اُس پر جست لگائی تھی۔

سُلکھشنا کے پاؤں اور خان کی ٹانگ ایک ساتھ چلے تھے اور ہوا ہی میں وہ واپس پلنگ پر آن گری تھی۔ اُسے اپنا پیٹ کٹتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ خان بغیر کچھ کہے بڑے اطمینان سے اپنی جگہ بیٹھ گیا:

"اگر تمہارے پاس سائیلنسر ہوا اِس پستول پر فٹ کرنے کے لیے تو میں تمہیں اپنے جسم پر چھ گولیاں چلانے کی اجازت بھی دے سکتا ہوں لیکن افسوس شور و ہنگامہ مجھے پسند نہیں"

خان نے اُس کی طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کیا تھا۔ اُس کے اچانک بدلے ہوئے روپ نے سُلکھشنا کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ اُسے یہ شخص کوئی بہت بڑا اذیت پسند نظر آنے لگا تھا جو اپنے شکار کو تڑپا تڑپا کر مارنے کا قائل ہو۔ خان نے اُس کا سارا پرس میز پر اُلٹ دیا تھا اور وہ چھوٹا سا سکیورٹی کارڈ اٹھا کر دیکھنے لگا تھا جس پر سُلکھشنا کی سرکاری شناخت درج تھی۔

"اوہ لیڈی انسپکٹر سی آئی ڈی ــــ" اُس کے ہونٹ دائرے کی شکل اختیار کر گئے۔

"میں نے تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کیا۔ نہ ہی تمہارے متعلق ابھی کوئی مشتبہ رپورٹ

دی ہے۔"

"مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا ــــ؟"

"مسٹر ملکار! یہ میری ڈیوٹی تھی۔ میرا فرض تھا کہ جب تک تمہارے متعلق مطمئن نہ ہو جاؤں تمہیں اپنی اصلیت سے آگاہ نہ کروں۔ تم دیکھ سکتے ہو میں نے اپنا نام تمہیں صحیح بتایا ہے۔"

"مس سُلکھشنا! میں تمہیں اپنے متعلق بہت کچھ بتا دیتا ہوں۔ میرا نام بھی غلط ہے پہچان بھی [illegible] میں بمبئی سے آیا ہوں یہاں صرف ایک بات کا پتہ لگانے کے لیے کہ حال ہی میں سرحد پار سے ہمارے لیے جو افیم آئی تھی اس کی مخبری کرنے والے کو پولیس نے کہاں چھپا رکھا ہے؟ اور ــــ مجھے اب اس بات کا علم ہو چکا ہے! اپنے گدھے افسروں سے کہہ دینا کہ [illegible] ہم اُسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ تم لوگ اُسے بچا نہیں سکتے۔ افسوس یہ اطلاع انہوں کو اُس وقت ملے گی جب میں یہاں سے جا چکا ہوں گا۔"

"دیکھو ملکار! گو تمہارا پیشہ ایسا ہی ہے لیکن مجھ پر اعتبار کرو۔ میں واقعی تم سے بہت متاثر ہوئی ہوں ــــ" اُس نے پالسہ پھینکنا چاہا لیکن خان جان چکا تھا کہ وہ اب بھی ڈبل کراس کر رہی ہے۔

"میں اچھوت گھرانے کا لڑکا ہوں مس سُلکھشنا جانتی ہو آج لاکھوں میں کیوں کھیل رہا ہوں؟"

سُلکھشنا نے اُس کی طرف بڑی ملتجی لیکن استفہامیہ نظروں سے دیکھا ــــ "صرف [illegible] کہ میں کسی پر اعتبار نہیں کرتا۔"

"اگر بیوقوفی کرو گے یہ ہوٹل ہمارے آدمیوں سے بھرا پڑا ہے۔ مسٹر ملکار! ہم اتنے جاہل نہیں کہ اپنے افسران کی جان کو خطرے میں ڈال کر بے نیاز ہو کر بیٹھ جائیں۔ جیسے ہی تم اکیلے ہو گے، مارے جاؤ گے" ــــ سُلکھشنا نے آخری ہتھیار بھی آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"یہ تو اور بھی اچھا ہے! تمہارے جیسی خوبصورت لڑکی کا اپنے ہاتھوں گلہ گھونٹنے کے

بعد کس کافر کا جی چاہے گا زندہ رہنے کو ؟" اُس نے مسکراتے ہوئے کہا اور واقعی شُلکھشنا سہم کر رہ گئی۔ ایسے نوجوان خوبصورت اور اذیت پسند مجرم سے اُس کا پالا آج پہلی مرتبہ پڑا تھا۔

اچانک ہی خان کی چھٹی حس نے اُسے احساس دلایا ؛ کہ یہ لڑکی وقت ضائع کر رہی ہے۔ اگر اس کی بات سچ ہی تھی تو یہ ممکن تھا کہ اس کے نیچے موجود ساتھی اوپر چلے آئیں وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور شُلکھشنا کے بالکل قریب آ گیا۔

"میرا خیال ہے ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیئے : بزنس اپنی جگہ ، لیکن ایسی خوبصورت رات اور تمہارے قرب سے فائدہ نہ اٹھانا بھی تو کفرانِ نعمت ہو گا "

اُس نے اپنا لہجہ بدلنے کی اتنی شاندار اداکاری کی تھی کہ دل ہی دل میں بے اختیار اُس نے خود کو داد دی۔ اُس کی آواز ہوس کے مارے تماش بین کی سی ہو گئی تھی اور یہی شاید شُلکھشنا کی آرزو بھی تھی۔

"اوہ ضرور" ـــــ اُس نے خود سپردگی کے عالم میں سسکاری بھری،

خان کے ہاتھ بڑے وحشیانہ انداز سے اُس کی طرف بڑھے تھے۔ شُلکھشنا نے یہی جانا کہ وہ اسے اپنی آغوش میں لے لے گا لیکن خان کوئی بھی معمولی سی لغزش کا معمولی سا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اُس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ کمرہ ساؤنڈ پروف نہیں اور وہ شُلکھشنا کو چیخنے کا موقع دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ اس کے دونوں آگے کو بڑھے ہوئے ہاتھ اُس کے کندھوں پر جم گئے ، اور دائیں ہاتھ کا انگوٹھا گردن کے نزدیک ایک مخصوص رگ میں گڑ گیا۔

شُلکھشنا کو یہ احساس ضرور ہو رہا تھا کہ اس کی جان آہستہ آہستہ نکل رہی ہے۔ وہ چیخنا چاہتی تھی لیکن آواز نکالنے پر اُسے قدرت نہیں رہی تھی۔ جانے خان نے اُس کے جسم کی کون سی رگ دبا دی تھی کہ سارا جسم سُن ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے کسی عضو کو حرکت

دینے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔

چند سیکنڈ کے اندر ہی اُس کا ذہن تاریکیوں میں ڈوبنے لگا اور ڈوبتا چلا گیا ـــــ اور وہ کٹی ہوئی ٹہنی کی طرح خان کے بازوؤں میں لہرا رہی تھی۔

ـــــ خان نے اُسے بڑے اطمینان سے بیڈ پر لٹا دیا تھا۔ خان کو اندازہ تھا کہ ڈھائی گھنٹے سے پہلے وہ ہوش میں نہیں آ سکے گی اور اُس کے لیے بُھنڈہ سے نکل جانے کے لیے یہ وقفہ کافی تھا۔

O

اس کے فوراً ہی بعد وہ کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا، گو کہ اس نے کافی لانے والے بیرے کو پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ صبح برتن لینے آئے۔ پھر بھی احتیاطاً اس نے اپنے کمرے کے دروازے پر باہر کی سمت ہوٹل کی طرف سے فراہم کردہ "ڈونٹ ڈسٹرب پلیز" کا سٹیکر چسپاں کروا دیا تھا۔ صبح والی چابی ابھی تک محفوظ تھی۔ اب تک اُسے اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ "ڈپلی کیٹ" چابی ہے۔ اصل چابی کہیں اور ہو گی۔ شاید اُس کے پاس کسی نے لاکر بک کروایا تھا۔

ایک کاغذ پر مختصر سا پیغام اور خفیہ الفاظ میں تازہ واردات کے متعلق لکھ کر اُس نے اسے تہہ کر کے جیب میں رکھا اور بڑے اطمینان سے باہر نکل آیا۔ راہداری سنسان پڑی تھی وہ اپنے کمرے کو تالا لگانا نہیں بھولا تھا۔ اس نے اپنے کپڑے تبدیل کر لیے تھے اور سادہ شیشوں کی عینک لگانے کے بعد کوٹ کے کالر کھڑے کر لینے سے اب اُسے پہچاننا ممکن نہیں رہا تھا۔

لفٹ کے بجائے اُس نے سیڑھیوں کا راستہ اختیار کیا اور بغیر آواز پیدا کیے سیڑھیاں اترتا چلا آیا۔ ہال میں رش اتنا زیادہ تھا کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں تھی۔ لوگ مغربی میوزک کی دھنوں پر اپنے ساتھیوں کے ساتھ محو رقص تھے کسی نے اُس کی طرف دیکھنے کی زحمت

ہی گوارہ نہیں کی تھی۔ کاؤنٹر کے نزدیک سے گزرتے ہوئے اُس نے احتیاطاً چلتے چلتے سگریٹ سلگانے کے بہانے اپنا چہرہ دوسری طرف موڑ لیا تھا اور اسی ایکشن میں باہری دروازے تک چلا آیا تھا۔

اسٹیشن یہاں سے بمشکل ایک میل دُور تھا۔ لیکن یہاں تک پہنچنے کے لیے اُس نے تین سواریاں بدلی تھیں۔ آخری مرتبہ جب وہ ایک سائیکل رکشہ میں سوار ایک بازار سے ہو کر جا رہا تھا تو اُس نے اپنا بھاری اوورکوٹ بھی اُتارا ہوا تھا۔ یہ اوورکوٹ وہ جان بوجھ کر ایک جگہ بھول آیا تھا۔

اسٹیشن کے دوسری طرف بنے بازار میں اُس نے سائیکل رکشہ والے کو بھی فارغ کر دیا۔ اب وہ پیدل مختلف گلیوں کے چکر لگاتا اسٹیشن تک آیا تھا۔ لاکر کے دُور دُور تک کوئی ذی ہوش دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اُس نے بڑے اطمینان سے لاکر کھولا اور وہ رقعہ تہہ کر کے اندر رکھ کر دوبارہ تالا لگا دیا۔ جو کمرے سے نکلتے ہوئے اُس نے لکھا تھا۔

اسٹیشن پر کھڑی دو تین گاڑیوں میں سے ایک کی وسل سنائی دی تو وہ بھاگتا ہوا اُسی ٹرین کی سمت بڑھنے لگا۔ ٹرین نے اب آہستہ آہستہ رینگنا شروع کر دیا تھا لیکن ایک ڈبے میں سوار ہونے میں وہ کامیاب ہو گیا۔ یہ فسٹ کلاس کا ڈبہ تھا اور قریباً خالی۔ کھڑکی کے نزدیک والی ایک سیٹ پر وہ ڈھیر ہو گیا۔ سردی میں اُونگھتی ایک دو سواریوں نے اُس کی طرف دیکھا پھر دوبارہ اونگھنا شروع کر دیا۔

ٹرین کا پہلا اسٹاپ قریباً آدھ گھنٹے بعد آیا تھا۔ یہ بڑا ویران سا اسٹیشن تھا۔ اُس نے نام پڑھنے کی کوشش کی لیکن اندھیرے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ٹرین نے یہاں بمشکل دو تین منٹ اسٹاپ کیا تھا پھر وہ آگے کی جانب رینگنے لگی۔ ابھی تک کوئی ٹکٹ چیک کرنے والا نہیں آیا تھا۔ گارڈ یا تو اتنی سردی میں اپنے کمرے سے باہر نکلنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا یا شاید کبھی وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ فسٹ کلاس کے ڈبے میں

ہی اتنی رات گئے کوئی مسافر بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہا ہے۔

رات گاڑی کی رفتار کے ساتھ ساتھ بڑی آہستگی سے رینگ رہی تھی۔ چاند جو اس کی کھڑکی کے سامنے اب تک مسلسل اُس کا ہم سفر بنا ہوا تھا اب شاید کہیں منہ چھپانے کی فکر میں تھا۔ خان سوچ رہا تھا اس مسلسل اور تھکا دینے والی دوڑ کا خاتمہ آخر کہاں ہو گا؟ ابھی تک اسے کہیں بھی پاؤں جمانے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ یہ حسنِ اتفاق تھا یا بھارتی انٹیلی جنس کی باخبری کہ اب تک وہ لوگ اس کے پیچھے تھے لیکن یہ اُس کی خوش قسمتی ضرور رہی تھی کہ ان لوگوں کے شک کرنے سے پہلے ہی وہ اُن کے ہاتھوں سے نکل جاتا تھا۔

شکنتلا کے متعلق تو واقعی وہ حیران رہ گیا تھا کہ وہ بھی سی آئی ڈی انسپکٹر تھی۔ یہ اُس کی تربیت کا صدقہ تھا جو اُس نے اِس پُراسرار لڑکی کے متعلق اس انداز سے سوچنا شروع کر دیا تھا۔

اُس کا ذہن ٹرین کی رفتار کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا۔ جب اچانک ہی کسی نے اس کے کندھے پر بڑے شریفانہ انداز میں ہاتھ رکھ کر اُسے مخاطب کیا۔ خان نے گردن گھمائی تو اُس کے سر پر ٹکٹ کلکٹر کھڑا تھا۔ اس نے بغیر کچھ کہے جیب میں ہاتھ ڈالا اور سو سو کے پانچ نوٹ گن کر اُس کی طرف بڑھا دیے ——— بوڑھا ٹکٹ کلکٹر بڑی حیرانگی سے اسے دیکھنے لگا:

"میں نے ٹکٹ مانگا تھا شریمان جی ———" اُس نے سمجھا شاید خان نے اُسے غلطی سے اتنے نوٹ دے دیے ہیں۔

"وہ ٹکٹ ہے مہاراج جی! میں دو تین اسٹیشن بعد اُتر جاؤں گا۔" اُس نے بڑے کھوئے کھوئے اور دلکھیا لہجے میں کہا۔

"آپ جائیں گے کہاں؟"

"کاش مجھے اپنی منزل کا علم ہوتا ـــــ خان نے لمبی اور ٹھنڈی آہ بھری۔ ٹکٹ کلکٹر خاصا پسیج گیا۔ اُس کا تیر عین نشانے پر لگا تھا۔

"ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی" ـــــ ٹکٹ کلکٹر نے مزید بحث مناسب نہ سمجھی اور آگے بڑھ گیا۔ نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے اُس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اُسے کسی نے آج تک اتنی بڑی "رشوت" شاید پہلے کبھی پیش ہی نہیں کی تھی۔ جاتے جاتے ایک لمحے کے لیے وہ رُکا پھر واپس مڑ کر اس تک پہنچا اور بڑی آہستگی سے قریباً جھکتے ہوئے اُس کے کان میں کہا ـــــ "میری ڈیوٹی صبح چھ بجے ختم ہو جائے گی۔"

"بے فکر رہو میں اس سے پہلے ہی دفع ہو جاؤں گا" ـــــ خان نے آواز دبا کر لیکن بڑے پھاڑ کھانے والے لہجے میں جواب دیا۔

ٹکٹ کلکٹر بیچارا سہم کر پیچھے ہٹ گیا اور دوبارہ پلٹ کر اُس نے خان کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ سردی رات ڈھلنے کے ساتھ ساتھ بڑھ رہی تھی اور خان سوچ رہا تھا کہ اُسے اوورکوٹ بھولنا نہیں چاہیئے تھا۔

ایک دو مرتبہ اُس نے سیٹ سے سر ٹکا کر اونگھنے کی ایکٹنگ بھی کی تھی۔ اُس کے سامنے کئی برتھ خالی پڑے تھے لیکن وہ نیند کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہ تھا۔



صبح کے قریباً چھ بج رہے تھے۔

گاڑی اس دوران راستے میں کتنی مرتبہ کھڑی ہوئی تھی لیکن ڈبے میں صرف ایک موٹا سا ہندو لالہ ہی سوار ہوا تھا۔ یہاں اتنی غربت تھی کہ بہت بڑے بڑے آدمی بھی کم کے فسٹ کلاس میں سفر کرنے کا حوصلہ نہیں کرتے تھے۔ خان کو یاد آگیا۔ ٹکٹ کلکٹر نے بتایا تھا کہ اس کی ڈیوٹی صبح چھ بجے ختم ہو جائے گی۔

گاڑی اس مرتبہ ایک اسٹیشن پر رُکی تو انبالہ کے بڑے بڑے الفاظ اس کی آنکھوں تراوٹ پیدا کرنے لگے۔ اُس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ خود بخود سے پھیلتی چلی گئی۔ اپنے لیے وہ باہر نکل آیا۔ دو سواریاں اور بھی اُس کے ساتھ اُتری تھیں۔ سیکنڈ اور تھرڈ کلاس کے ڈبوں سے لوگوں کا اژدہام باہر کو لپک رہا تھا۔ وہ بھی تھوڑی دیر بعد اس ہجوم کا ایک حصہ بنا اسٹیشن کی سیڑھیاں عبور کرتا باہر آرہا تھا۔

انبالے میں زندگی بیدار ہونے لگی تھی۔ مندروں اور گوردواروں کے لاؤڈ سپیکر اونچی آواز میں دعا پکار رہے تھے۔ اُس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے واحد بریف کیس کا جائزہ لیا۔ پتلون اور جیکٹ کی جیبوں میں موجود نوٹوں کو تھپتھپا کر محسوس کیا اور بجائے سیدھے راستے سے باہر آنے کے ایک ذیلی راستے سے جس طرف اُس نے اکثر سواریوں کو جاتے دیکھا تھا باہر آگیا۔

لہو کی مہک

انبالہ میں داخل ہوتے ہی جیسے اُسے کوئی بھولی ہوئی کہانی اچانک یاد آگئی تھی۔ اُسے یاد آگیا کہ ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پاکستانی پیرا کمانڈوز نے اِس ہوائی اڈّے کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔ اُس نے سُنا تھا کہ عین اُن لمحات میں جب انبالہ کے ہوائی اڈّے پر بھارتی فضائیہ کے پائیلٹ آپریشن روم سے پاکستان پر تباہی نازل کرنے کے احکامات لے کر باہر نکل رہے تھے۔ اور اپنے طیاروں میں بیٹھ کر کسی بھی لمحے اُڑنے کے لیے تیار تھے ـــــ یہ پیرا کمانڈوز اُن پر خدا کا قہر بن کر نازل ہو گئے۔

ہوائی اڈے پر مکمل بلیک آؤٹ تھا اور پاکستانی کمانڈوز ان طیاروں پر گھات لگائے بیٹھے تھے ـــــ جیسے ہی یہ پائیلٹ اپنے جہازوں میں سوار ہوئے اچانک اُن پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

دشمن کے عزائم چند منٹوں میں اُس کے سامان حرب و ضرب کے ساتھ ہی راکھ کا ڈھیر بن چکے تھے لیکن اِس کے ساتھ ہی بھارتی آرمی نے ہوائی اڈّے کو گھیرے میں لے لیا تھا ـــــ

اِن کمانڈوز میں سے بمشکل دو یا تین زندہ اپنے وطن واپس پہنچ سکے اور باقی سب نے وہیں لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کر لیا تھا ـــــ ایک بھی اُن میں سے زندہ دشمن کے ہاتھ نہیں آیا تھا۔

اُسے انبالے کی طرف بڑھتے ہوئے ان شہیدوں کے لہو کی مہک آ رہی تھی ـــ [illegible] سوچ رہا تھا آج جب وہ اُس ہوائی اڈّے کی تباہی کا سامان کرنے جا رہا ہے ان شہیدوں کی روحیں کتنی خوش ہوں گی۔



اُسے بتایا گیا تھا کہ یہاں انبالہ میں کم طاقت اور کمتر دائرہ کار والا موبائیل ٹی پی ایس والی [illegible] ہے جس میں گو کہ جی سی آئی (گراؤنڈ کنٹرول انٹرسیپشن) کی سہولت موجود نہیں لیکن [illegible] کہاں غائب ہو گیا۔

[illegible] سب سے پہلے اسی اڈّے کا کھوج لگانا تھا۔ جہاں ریڈار نصب کر کے دشمن [illegible] کو پاک فضائیہ کے حملے سے محفوظ کرنا چاہتا تھا ـــــ یہ ریڈار اسٹیشن موبائیل [illegible] پوزیشن آئے دن تبدیل کرتے رہنے کی وجہ سے ابھی تک پاکستان انٹیلی جنس کی [illegible] اوجھل تھا۔

[illegible] سے پہلے اِس نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں ناشتہ کیا پھر ایک سرائے [illegible] سے گزرتے ہوئے اُس نے ایک درمیانے درجے کا ریڈی میڈ کپڑوں کا جوڑا خرید [illegible] کے رجسٹر پر کچھ لکھنے سے پہلے اُس نے دس روپے کا ایک نوٹ اُس کی مٹھی [illegible] صرف اپنا نام بتایا تھا۔

[illegible] شاکر ـــــ!"

[illegible] ہے مہاراج!" پروہت نے دس روپے کا نوٹ جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔ [illegible] ـــــ یہ لیں چابی۔"

[illegible] اپنے سامنے رکھے ایک لکڑی کے بکس میں سے ایک چابی جو رسّی سے بندھی [illegible] حوالے کر دی۔

[illegible] پنڈت جی مہاراج" ـــــ اُس نے شکریہ ادا کیا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ کمرے

کو اندر سے کنڈی لگا کر وہ گھوڑے بیچ کر سویا اور سہ پہر کو ہی اُس کی آنکھ کھلی۔

خان نے جب بریف کیس سے کپڑوں کا جوڑا نکال کر نئے قمیص پاجامے پر کوٹ پہنا تو درمیانے درجے کا ہندو نوجوان نظر آ رہا تھا ——— اپنے کمرے کو تالا لگا کر وہ باہر بازار آ گیا۔

ابھی تک اُسے کوئی قابلِ عمل طریقہ نہیں سوجھ رہا تھا۔ یونہی ٹہلتا ہوا وہ ایک بس سٹینڈ تک آ گیا ہارو ڈ ٹرانسپورٹ کی ایک بس اُس طرف آ رہی تھی اور اچانک ہی اس کی نظر انڈین ایئر فورس کے ایک کارپورل پر پڑی جو قریباً بھاگتا ہُوا اسی بس کی طرف آ رہا تھا۔ فوراً ہی خان نے ایک پلان سوچا: اُسی کے سے انداز میں بس کی طرف ایسے جیسے اُس نے بھی اِس بس میں جانا ہو۔

کارپورل اور اُس کا ٹکراؤ بس سے کچھ فاصلے پر بالکل اچانک ہُوا، وہ تو منصوبے کے تحت کارپورل سے ٹکرایا تھا جب کہ مخالف کا ایسا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ وہ گرا اور قلابازی کھا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ اسی انجام سے خان بھی دوچار ہوا تھا لیکن وہ اُٹھا کارپورل کے بعد تھا۔

"شما کرنا مہاراج جی!" اُس نے کارپورل کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اُس کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔

"کوئی بات نہیں۔ جلدی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔" کارپورل کوئی شریف آدمی دکھائی دے رہا تھا۔

اس دوران بس نکل چکی تھی اور دونوں ایک دُوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے بوکھلائے ہوئوں کی طرح مسکرا رہے تھے۔

"بہت افسوس ہوا آپ کی بس بھی نکل گئی" ——— خان نے اظہارِ افسوس کیا۔

"آپ نے بھی تو جانا تھا شاید اُسی بس پر" کارپورل بولا۔

"ابی ہمارا کیا مہاراج! کاروباری آدمی ہیں، دیر سویر بھی ہو جائے تو کچھ بات نہیں۔ آپ سرکاری آدمی ہیں، وقت کے پابند۔"

"ہاں بھئی لیکن اب تو میں چھٹی کر کے گھر جا رہا تھا۔"

"اوہ۔ تب تو آئیے ایک کپ چائے ہو جائے۔ بس تو ذرا دیر سے آئے گی۔" کارپورل پہلے انکار کرتا رہا پھر مان گیا۔

"اجے ٹھاکر نام ہے میرا" ——— اُس نے چلتے چلتے کہا۔

"اجے ساہنی کہتے ہیں مجھے" ——— کارپورل نے اب اس میں دلچسپی لینی شروع کر دی تھی۔

دونوں ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں بنے کیبن میں آن بیٹھے تھے۔ خان نے اس کے لیے خاصی پُرتکلف چائے کا آرڈر دیا تھا۔

"ہم تو مہاراج یاروں کے یار ہیں۔ بس محبت کے بھوکے ہیں اپنا کوئی آگے پیچھے کھانے والا تو ہے نہیں۔ جو کمایا وہی یاروں پر لٹا دیا۔" خان نے گلاب جامن زبردستی اُس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "چار دن میں بھی رہ آیا ہوں فوج میں ——— اپنی تو بھائی جان جاتی ہے پابندی سے ——— پھر اتنی سی تنخواہ میں بات ہی کیا بنتی ہے۔ اب یہ دیکھ لو چھوٹی سی نوکری ہے میری اور بھگوان کی کرپا سے ہزاروں کی آمدن ہو رہی ہے۔" اتنا کہتے ہوئے اس نے جیب سے سو سو کے نوٹوں کی ایک گڈی نکالی اور ایک نوٹ اجے ساہنی کو دکھا کر الگ کر لیا۔ باقی گڈی دوبارہ جیب میں رکھ کر اُس نے بیرے کو اپنے پاس بُلایا۔

"کون سا سگریٹ منگواؤں آپ کے لیے؟"

"کوئی بھی منگوا لیں" ——— کارپورل نے انکساری سے کہا

"لو مہاشے جی اپنا بل بھی کاٹ لینا اور ایک ڈبی گولڈ فلیک کی لیتے آنا" ——— اُس نے ایک مہنگے سے سگریٹ کا نام لیا۔

کارپورل کی تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ایسا "یار" واقعی اُسے ساری دُنیا ڈھونڈ سے نہ ملتا۔

"کہاں رہتے ہیں آپ" ــــ اُس نے ہوٹل کے باہر آتے ہی خان سے پوچھا۔

جواب میں خان نے ایک زوردار لیکن کھوکھلا سا قہقہہ لگایا اور بولا "یہ پوچھیے کہاں نہیں رہتا۔ اجی سارے بھارت میں رہتا ہوں لیکن میرا اپنا کوئی گھر نہیں۔"

بس اسٹاپ پہنچنے تک وہ اجے ساہنی کا دل مٹھی میں لے چکا تھا۔ وہ شاید اتنی زیادہ محنت اس پر نہ کرتا لیکن اس کے بازو پر کندھے کے نزدیک لگے اُس خاص نشان نے جو "ٹریڈ" کی عکاسی کر رہا تھا۔ خان کے لیے اُس میں خاصی کشش پیدا کر دی تھی۔ اُس نے کو یہی بتایا تھا کہ وہ یہاں کاروباری صورتحال کا جائزہ لینے ہی آیا ہے۔

اس دوران اچانک ہی اُس نے بڑے ڈرامائی انداز میں ایک شراب خانے کے رک کر "رم" کی ایک بوتل خریدی اور شراب خانے کے باہر آ کر اجے کو پکڑا دی۔

"تم دُنیا میں واحد آدمی ہو جس نے میرے دُکھ کو محسوس تو کیا۔ یہ اپنے بھائی کی سے تحفہ سمجھنا ــــ اگر میرا کوئی بھائی ہوتا تو اُس کا نام بھی یقیناً اجے ہی ہوتا۔ میرا جو ہے۔"

کارپورل اجے ساہنی بے اختیار اس سے بغلگیر ہو گیا۔ "مجھے اپنا بھائی ہی سمجھو چلو میرے ساتھ گاؤں۔ لعنت بھیجو سرائے پر۔ وہیں چل کر رہتے ہیں۔ صبح میں نے وا آنا ہے میرے ساتھ ہی آ جانا۔"

خان پہلے تو "نہ نہ" کرتا رہا۔ بالآخر اُسے اپنے "مُنہ بولے اور تازہ بھائی" اجے کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی اور تھوڑی دیر بعد وہ واقعی سرائے پر لعنت بھیج کر اُس کے ساتھ بس میں بیٹھا گاؤں جا رہا تھا۔

بس میں سوار ہونے سے پہلے اُس نے تازہ پھلوں کے دو ٹوکرے بھر لیے

تو اس پر مٹتا جا رہا تھا۔ رم کی خوشبو ہی اُسے پاگل کر دینے کے لیے کیا کم تھی۔



شہر سے بیس میل دُور اُس کا گھر تھا ــــ اجے ساہنی نے اپنے ماتا پتا اور پتنی سے فخر سے اپنے نئے بھائی کا پریچے (تعارف) کروایا تھا۔ وہ لوگ اُس کے ہاتھوں میں پکڑے پھلوں کے ٹوکرے دیکھ کر بڑے متاثر ہوئے۔

رات کو وجے ٹھاکر نے تو کھانا کھا لیا لیکن اجے ساہنی نے نہ کھایا۔ وہ تو ٹھاکر کو بھی اشارے کنایے سے منع کرتا رہا لیکن ٹھاکر کو زندگی میں بہت دیر بعد اس طرح گھر میں لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے کا موقع ملا تھا۔ اور وہ اس "سنہری موقعے" کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

شام ڈھلتے ہی دونوں مکان کی دوسری منزل پر بنے کمرے میں چلے گئے۔

"بُرا مت ماننا بھیا جی! میں تو سمجھ گیا تھا لیکن مجبوری ہے۔ میں ابھی کم از کم چھ ماہ شراب پینا تو کیا سونگھ بھی نہیں سکتا۔"

"کیوں" ــــ اجے نے اظہارِ افسوس کیا۔

جواب میں اپنی جس بیماری کا نام وجے ٹھاکر نے لیا تھا۔ اُس کی ذرا سی سمجھ بھی اجے ساہنی کو نہ آئی لیکن اُس پر بیماری کا رعب ضرور پڑ گیا تھا! شراب کا پیگ اس کے لیے وجے ٹھاکر نے ہی تیار کیا اور پھر تیار کرتا چلا گیا۔

"بھائی صاحب فوج میں گزارے تو چار دن ہیں لیکن وہ زندگی یاد بہت آتی ہے۔ کیسی شاندار زندگی تھی ــــ بائی دی وے آپ وہاں کام کیا کرتے ہیں؟" ــــ اُس نے کارپورل کو نشے میں آتے دیکھ کر اپنا کام شروع کر دیا۔

کارپورل اجے ساہنی جس کا پہلا پیگ ختم ہونے سے پہلے دوسرا اُس کے لیے اُس کا "منہ بولا بھائی" تیار کر کے رکھ دیتا تھا ترنگ میں آ کر شروع ہوا اور اُس نے اپنا سارا کچا

چھٹا اُس کے سامنے کھول کر رکھ دیا۔

درمیان میں کئی باتیں "قندِ مکرّر" کے طور پر بھی وجے ٹھاکر اُس سے پوچھتا جاتا تھا اور آدھ گھنٹے بعد ہی وہ اُس سے ریڈار کے متعلق بہت سی باتیں اگلوا چکا تھا لیکن بڑے ناجھوں طریقے سے ——— بالکل یوں جیسے اُس نے اجے ساہنی کی بات سُن کر بھی اُس پر احسان کیا ہو۔ اِس سے پہلے کہ اجے "آوٹ" ہو جائے اُس نے باقی بوتل وہاں سے ہٹالی اور رسوئی سے خود جا کر اُس کے لیے کھانے کی "تھالی" تیار کر کے لے آیا۔

اجے تو کھانا کھاتے ہی بے سدھ ہو کر سو رہا لیکن خان رات کافی دیر گئے تک جاگتا رہا۔ اُس نے اِس درمیان اپنے ذہن میں اجے کی طرف سے حاصل کردہ تمام معلومات نقش کر لی تھیں ——— اُسے اُن مقامات کے چپے چپے کا علم ہو چکا تھا جہاں یہ موبائیل ریڈار موجود رہتا تھا۔

اور ——— اب دوسرا مرحلہ شروع ہونے والا تھا ——— اپنی آنکھوں سے اُس موبائیل سٹیشن کو دیکھ کر اُس کی جزئیات حفظ کرنا اور پھر اُنہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے وہاں تک پہنچانا جہاں اُن کی "ضرورت" بہت شدید تھی۔

O

صبح اُٹھ کر سب نے اکٹھے ناشتہ کیا۔ اجے ساہنی کا سر خاصا بوجھل تھا۔ رات کے نشے نے بڑا اثر دکھایا تھا۔ نہانے کے بعد وہ قدرے نارمل ہوا۔ صبح اُٹھ کر کافی دیر گئے تک وہ ٹھاکر کی محبت کو "سلامِ عقیدت" پیش کرتا رہا۔ وجے نے اُسے بتایا تھا کہ فوجی اُسے بہت اچھے لگتے ہیں۔ اُس نے اس خواہش کا اظہار بھی کیا تھا کہ اجے ساہنی اُسے جنگی ہوائی جہاز دکھائے اور اجے نے رات شراب کے نشے میں کوئی دس مرتبہ قسم کھائی تھی کہ وہ اپنے نئے بھائی کو بہرصورت سب کچھ دکھائے گا۔

آج اس نے شام کو ڈیوٹی جائن کرنی تھی۔ یہ تو خان کو علم ہو ہی گیا تھا کہ اُس کی

ڈیوٹی اسی ریڈار پر ہے جس کی خان کو تلاش تھی۔ ناشتے کے بعد کافی دیر تک وہ آپس میں باتیں کرتے رہے۔

"دوپہر کا کھانا انبالے میں کھائیں گے بھائی جی" ——— اُس نے اجے ساہنی کو پیشکش کی۔

"کیوں نہیں، کیوں نہیں" ——— اجے ساہنی تو جیسے اِس دعوت ہی کا مُنتظر تھا۔

دونوں سورج چڑھنے کے تھوڑی دیر بعد ہی شہر کی طرف چل دیے۔ روانگی سے قبل خان اجے ساہنی کی بیوی اور اپنی "بھابی" کو سو روپے کا نوٹ دینا نہیں بھولا تھا۔ اُس نے اِس بات پر بڑی شرمندگی کا اظہار کیا تھا کہ وہ اُن لوگوں کے لیے شہر سے کچھ نہیں لا سکا۔

انبالہ پہنچتے ہی اجے ساہنی اُسے لے کر ایک گھٹیا سے سینما ہال میں داخل ہو گیا۔ ٹکٹ بھی اجے نے خود ہی خریدے تھے۔ باہر کسی انگریزی فلم کا بورڈ لٹک رہا تھا۔ خان کے لیے یہ اطلاع نئی تھی کہ یہاں ہر روز سینماؤں میں چار سے پانچ شو روزانہ فلم کے چلا کرتے تھے۔

فلم کا آغاز بندے ماترم سے ہوا! خان یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سینما ہال میں بیٹھے تیسرے درجے کے تماشائی بھی اس کے احترام میں فوراً کھڑے ہو گئے تھے۔ اِس سے پہلے بھی اُس نے دیکھا تھا کہ اِن لوگوں میں "بھارتی" ہونے کا احساس بہرحال موجود ہے۔ ترانہ ختم ہوتے ہی ایک فحش فلم پردہ سکرین پر چلنی شروع ہو گئی اور خان کو جلد ہی سمجھ آ گئی کہ اجے اُسے یہاں کیوں لایا تھا؟ بے چارہ کارپورل جسے اپنی معمولی تنخواہ پر اتنا بڑا کنبہ پالنا پڑتا تھا، زندگی کی تمام سہولتوں سے محروم تھا۔ اپنی فریسٹریشن کو دبانے کے لیے سوائے اِس گھٹیا تفریح کے شاید اور کچھ اُس کے پاس نہیں تھا۔

دوپہر کا کھانا اُس نے اجے ساہنی کو ایک شاندار ہوٹل میں کھلایا۔ یہاں اُس نے

بطورِ خاص اِس بات کا خیال رکھا تھا کہ اجے شراب بالکل نہ مانگے۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ ڈیوٹی پر بھی وہ نشے کی حالت میں جائے! اگرچہ اجے نے دبی دبی زبان سے ایک دو مرتبہ اپنی خواہش کا اظہار کیا تھا لیکن خان نے اِس کی بات ہنسی میں اڑا دی۔

اجے شاید فلمیں دیکھنے کا زیادہ ہی شوقین تھا یا پھر پچھلے لمبے عرصے کی کسر آج ہی نکالنے پر تُلا ہوا تھا۔ کیونکہ اُس نے کھانے کے خاتمے پر دوسری فلم دیکھنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ خان بھی یہی چاہتا تھا کہ: اس کی ڈیوٹی جو شام سات بجے کے بعد شروع ہونے والی تھی، تک اُسے کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھے۔

اس دفعہ پھر اُس نے فلم کا انتخاب خود ہی کیا تھا۔ یہ فلم نئی تھی اور خان کے لیے چونکا دینے والی بھی!

فلم ۱۹۶۵ء کی جنگ کے حوالے سے بنائی گئی تھی اور پاکستان کے خلاف خوب خوب زہر اُگلا گیا تھا۔ خان نے دیکھا فلم کے دوران کئی مرتبہ سینما ہال میں بیٹھے تماشائیوں نے "جے ہند" اور "کرش پاکستان" کے نعرے لگائے۔

یہ سرد جنگ کا دور تھا:

بھارت نے مشرقی پاکستان میں علیحدگی کے فتنے کی بُنیاد تو تقسیمِ مُلک کے فوراً بعد ہی رکھ دی تھی لیکن اب صورتحال ایسی ہو چکی تھی کہ ہندو سرکار کھل کر اس فتنے کی پشت پناہی کر رہی تھی! بین الاقوامی فورم میں بھارت ننگا ہو کر بھی خود کو زہریلے پروپیگنڈے کے بل بوتے پر بے گناہ اور معصوم ثابت کرنے پر تُلا ہوا تھا۔ سارا بھارت ایک جنگی جنون میں مبتلا تھا۔ ہر طرف پاکستان کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی۔

فلم دیکھ کر جب وہ باہر نکلا تو اُس کا دل خاصا بوجھل ہو رہا تھا۔ اُس نے دو تین روز ہی میں اس قوم میں ہزار برائیوں کے باوجود جو ایک چیز دیکھی تھی اور جسے وہ ان کی "مشترکہ عادت" کہہ سکتا تھا وہ تھی: "پاکستان دشمنی"۔

وہ ہندو جو اَن پڑھ تھا۔ وہ جو پڑھا لکھا تھا اور وہ جو ابھی پڑھ رہا تھا یہ سب اِس بات پر تُلے ہوئے تھے کہ پاکستان کو تباہ کر دیں! اُن کے سینما ہال، ریستورانوں، گھروں اور دفتروں کے باہر بڑے بڑے حروف میں "کرش پاکستان"، "کرش پاکستان"! لکھا ہوا تھا۔

اِس کے برعکس اُس کے اپنے مُلک میں اقتدار کی سیاست کا کیا "گھناؤنا کھیل" کھیلا جا رہا ہے! وہ اِس سے آگے کچھ نہ سوچ سکا۔



سینما ہال سے نکل کر وہ دونوں اجے کے دفتر کی طرف روانہ ہو گئے۔

اجے نے اُسے کہا تھا کہ وہاں کسی بھی رشتہ دار کو آنے کی اجازت نہیں مگر پھر بھی وہ اپنے بھائی کو اپنے کسی افسر کی منت سماجت کر کے سب کچھ دکھا دے گا لیکن اس کا "بھیّا" "اپنے پیارے بھائی اجے" کو کسی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا تھا۔

"یار سمجھتے کیوں نہیں۔ اس میں بھی دیش کی کوئی بھلائی ہو گی جو اُدھر کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ بس تم کل مجھے ہوائی اڈہ ہی دکھا دینا۔ مجھے کیا پتہ یہ ریڈار کمبخت کیا بلا ہے!"

"اچھا جیسے تمہاری مرضی"____ اجے ساہنی بولا۔

دونوں ایک بس میں بیٹھ کر انبالے سے کچھ فاصلے پر واقع ایک گاؤں کے نزدیک اُتر گئے۔ بادلوں کی وجہ سے اندھیرا گو کہ پھیل چکا تھا لیکن خان کو گاؤں سے کچھ فاصلے پر بنے ایک اونچے ٹیلے پر ریڈار کا ایک "انٹینا" گولائی میں حرکت کرتا نظر آ ہی گیا تھا۔ اجے تو اُسے ہوائی اڈے تک لے جانے پر مُصر تھا لیکن اُس نے اپنی جان چھڑا لی۔

"تم جاؤ میں واپس جاتا ہوں۔ کل سرائے میں مل لینا۔ اگر مجھے کوئی اچھا آرڈر مل گیا تو اتوار کو چھٹی کے روز تمہارے گھر ہی ملاقات کو آؤں گا۔"

سے پیدل ہی چل دیا تھا۔ جبکہ وجے ٹھاکر نے واپسی کا اپنا علیحدہ راستہ ناپا۔ دونوں ایک دوسرے کو مڑ مڑ کر دیکھتے اور مسکراتے رہے پھر ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

لیکن نہیں ـــ اجے کی نظروں سے وجے ضرور اوجھل ہو گیا تھا۔ وجے نے اجے پر نظر رکھی تھی۔ اُسے دُور جاتے دیکھ کر خان پیشاب کے بہانے سڑک سے کچھ فاصلے پر درختوں کے سلسلے میں گھس گیا۔ پھر اُس نے بڑی تیزی سے سڑک عبور کی اور اب وہ اُسی راستے پر دبے قدموں اجے ساہنی کا تعاقب کرتا جا رہا تھا۔ جس راستے پر اجے گیا تھا اُس کی تمام خوابیدہ طاقتیں جیسے ایک ایک کر کے جاگ اُٹھی تھیں۔ یہاں سے اُسے اجے ساہنی کا صرف ایک ہیولا سا نظر آ رہا تھا جس کا تعاقب وہ چیتے کی طرح دبے پاؤں کر رہا تھا۔ اب اُسے خاردار تار بھی نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔

اجے تو ان راستوں سے آشنا تھا اسی لیے وہ بڑے اطمینان سے چلتا چلا جا رہا تھا جبکہ خان کے لیے فی الوقت یہ راہیں اجنبی تھیں۔ وہ بڑے محتاط انداز میں پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔

کھیتوں کا سلسلہ اب ختم ہو گیا تھا، جھاڑیاں اور سرکنڈے شروع ہو گئے تھے جو اس بات کا واضح اعلان کر رہے تھے کہ یہاں سے ایئر فورس کا علاقہ شروع ہو چکا ہے۔

اب دونوں ایسے چوراہے پر پہنچ چکے تھے جہاں سے مختلف اطراف میں راستے پھوٹ رہے تھے۔ اجے لاپروائی سے ایک راستے پر مڑ گیا! سامنے سے کچھ لوگ اونچی آوازوں میں باتیں کرتے ادھر آ رہے تھے!!! ابھی اندھیرا اتنا زیادہ نہیں پھیلا تھا کہ وہ خود کو محفوظ تصور کر لیتا خان۔ وہیں سرکنڈوں کی آغوش میں دُبک کر بیٹھ گیا۔

سامنے سے آنے والے شاید اجے سے ٹکرا گئے تھے اونچی آوازوں میں ایک دوسرے کی خیریت دریافت کر رہے تھے۔ دو تین منٹ تک وہ باتیں کرتے رہے۔ خان کو اندازہ ہو چلا تھا کہ یہ لوگ چھٹی کر کے جانے والی شفٹ کے ہیں۔ سات بجنے والے تھے اور اجے ساہنی کو چارج لینا تھا اس لیے وہ جلدی سے آگے بڑھ گیا۔

خان اُسی جگہ دُبکا رہا۔ کیونکہ بہت سے لوگ اِس راستے پر اب آنے جانے لگے تھے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد سکون ہوا۔ پھر بھی وہ احتیاطاً وہیں بیٹھا رہا کچھ عرصہ اور مُن گن لینے کے بعد اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دُور دُور تک فضا میں سوائے اندھیرے کے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا! ان لوگوں نے اِس ریڈار سٹیشن کو اتنی خوبصورتی سے کیموفلاج کیا ہوا تھا کہ ابھی تک یہاں ریڈار سٹیشن کے کوئی اثرات دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

وہ بڑی احتیاط سے قدم دھرتا اندازے سے ایک طرف چلا جا رہا تھا۔ جب اچانک ہی اُس کا پاؤں تاروں کے ایک گچھے میں اُلجھ گیا۔ ایک لمحے کے لیے تو خان کا سارا وجود ہی ساکت ہو کر رہ گیا۔ تاروں کے یہ گچھے احتیاطاً راستے میں پھینکے گئے تھے۔ یہ اس کی خوش قسمتی تھی کہ ان تاروں میں برقی رو ابھی نہیں دوڑائی گئی تھی ورنہ شاید اُسے اگلا سانس لینا بھی نصیب نہ ہوتا۔

ابھی تو اُس کی پتلون کا پائنچہ ہی پھٹا تھا، اگر اس نے چمڑے کے بوٹ نہ پہنے ہوتے تو شاید اب تک اُس کا پاؤں بھی کٹ چکا ہوتا ـــ کچھ خراشیں اُس کے پاؤں پر ضرور آئیں۔

اپنا پاؤں خاردار گچھے سے نکال کر کچھ دیر تک تو وہ چپکا بیٹھا رہا پھر اٹھ کر قدم آگے بڑھایا! اس دوران راستے میں دو تین مرتبہ تاروں کے اور گچھے بھی آئے لیکن اب وہ ہشیار ہو چکا تھا! جلد ہی اس بڑی بڑی جنگلی گھاس کے درمیان اُسے لکڑی کے پول بھی نظر آنے شروع ہو گئے تھے جن پہ خاردار تاریں لگی ہوئی تھیں ـــ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ "آپریشنل ایریا" میں پہنچ چکا ہے۔

خاردار تاروں کے ساتھ ساتھ وہ گھومتا جا رہا تھا۔ ایک جگہ اُسے خلا نظر آ ہی گیا، اپنے جسم کو تولتا ہوا خان دوسرے ہی لمحے اندر پہنچ چکا تھا۔ وہ اب گھنی اور اونچی گھاس میں سفر کر رہا تھا۔

گھاس میں اونچے اونچے درخت لگے ہوئے تھے، ان درختوں کے نزدیک پہنچ کر وہ اور زیادہ محتاط ہو گیا! ۔ ایک ایسے ہی درخت کے قریب سے جیسے ہی وہ آگے نکلا۔ اچانک ہی زمین نے اُس کے قدم تھام لیے: درختوں کی اوٹ سے اژدھا کی طرح پھن پھیلائے اجے ساہنی نمودار ہوا تھا۔



اندھیرا گو کہ خاصا پھیل چکا لیکن اتنا بھی نہیں کہ خان کو اس کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ریوالور دکھائی نہ دیتا ——— اُس کے ہاتھ مشینی انداز میں اُوپر اُٹھتے ہی چلے گئے اجے کو "ہینڈز اپ" کہنے کا تکلف بھی نہیں کرنا پڑا تھا۔

"چُپ چاپ جدھر سے آئے ہو اُدھر ہی واپس چلتے رہو۔" اجے پھنکارا۔
ایک مسکراہٹ نہ چاہنے کے باوجود خان کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

——— یہ امر اس کے لیے باعثِ حیرت بھی تھا اور کسی حد تک باعثِ تسکین بھی کہ اُجے نے اپنی آواز بالکل نیچی رکھی تھی ——— شاید وہ اس بات سے خوفزدہ تھا کہ دوسرا کوئی اُن کی موجودگی وہاں محسوس نہ کر لے؛ خان قدرے پُرسکون ہو کر گھوما اور اس طرف چلنے لگا جس سمت سے وہ یہاں پہنچا تھا۔

اجے نے اُس کے اور اپنے درمیان کم از کم پانچ سات قدم کا فاصلہ رکھا تھا۔ خان اگر چاہتا تو اُس فاصلے سے بآسانی فائدہ اٹھا کر اُسے ڈاج کر سکتا تھا لیکن وہ ابھی اس کھیل کو ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مسلسل بھاگ دوڑ نے اُس پر قدرے جھنجھلاہٹ بھی طاری کر دی تھی۔

دونوں بلّی کی طرح دبے قدموں انتہائی احتیاط سے بغیر آواز پیدا کیے ایک دوسرے ...اف میں اب کھیتوں کے وسیع سلسلے تک پہنچ گئے تھے۔ یہ جگہ "مذاکرات" کے لیے محفوظ ... خان نے چلتے چلتے ہاتھ گرا دیے۔

"ہاتھ اٹھائے رکھو" ——— اجے ساہنی نے دھمکی دی۔

"دیکھو بھیا! اول تو مسلسل اُٹھائے رکھنے سے میرے بازو ہی تھک گئے ہیں اور دوسری بات یہ کہ تمہارا ریوالور یا تو خالی ہے یا اگر لوڈ بھی ہے تو تم گولی نہیں چلاؤ گے"
...ان کا لہجہ خاصا پُرعزم تھا اور اب وہ باقاعدہ اس کی طرف منہ کیے کھڑا تھا۔

"کسی غلط فہمی میں نہ رہنا!" کارپورل اجے ساہنی نے خود کو سنبھالنا چاہا لیکن وہ ابھی تک ... لہجے پر قابو نہ پا سکا تھا۔

"میں کبھی کسی غلط فہمی یا خوش فہمی کا شکار نہیں رہا کارپورل اجے ساہنی! میری حیثیت ... دلدل میں رینگنے والے کیڑے جیسی تھی اور آج لاکھوں میں کھیل رہا ہوں تو اس ... صرف میرے اندازے کی درستگی ہی ہے۔ پھر تم یہ کیوں بھول گئے کہ اگر یہ کوئی جرم ... تو میرے ساتھ تم بھی اس میں برابر کے شریک ہو۔"

"یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو" ——— کارپورل واقعی بوکھلا گیا تھا۔

"بے وقوف یہ بات مت بھولو کہ میں نے تمہارے ساتھ مسلسل چوبیس گھنٹے گزارے ہیں اور تمہارا کوئی افسر اس بات پر یقین نہیں کرے گا کہ تم اس دوران غلط فہمی میں مبتلا رہے ہو۔ ... کوئی شریف ناگرگ (شہری) سمجھتے رہے ——— تم میرے ساتھ اس جرم میں برابر کے ... گردانے جاؤ گے" ——— اجے کے چہرے پر باقاعدہ ہوائیاں اُڑنے لگی تھیں۔ "اور شاید ... ہی مارے جاؤ۔"

"دیکھو مجھے بلیک میل مت کرو۔ میں تمہیں....."

"ہاں! ہاں تم مجھے گرفتار کروا کے انعام حاصل کر لو گے۔ مسٹر اجے ساہنی یس تے کچّی

گولیاں نہیں کھیلیں۔ بیوقوف مت بنو۔ مطلب کی بات کرو۔ اپنا حصہ لو اور اس کھیل سے نکل جاؤ۔" خان اُسے سوچنے کا موقع دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

"دیکھو اجے بھیا! میں بھی تمہیں اسی لیے یہاں لایا ہوں۔ مجھے تم پر پہلے ہی روز شک ہو گیا تھا۔ میں نے پورے دو سال "آرمورڈ ڈیوٹی" (انٹیلی جنس) کی ہے۔ آج میری چھٹی تھی اور میں جان بوجھ کر تمہیں یہاں لایا ہوں۔"

"بس زیادہ چالاک نہ بنو" — خان کے لہجے میں نہ جانے ایسا کیا قہر چھپا تھا کہ ہاتھ میں ریوالور ہونے کے باوجود اجے کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سنسناہٹ سی دوڑ گئی: "مجھے صرف اپنے کام سے غرض ہے! تم نے تو یہ چاہا تھا کہ مجھے بیوقوف بنا کر مجھ سے جان کی... کا وعدہ کر کے رقم بٹور لوگے — رقم تمہیں ضرور ملے گی مسٹر اجے۔ تمہاری توقع سے بھی زیادہ — لیکن یوں نہیں" — خان نے دوبارہ اُسے ڈانٹ دیا۔ وہ اجے کے ذہن پر حاوی ہوتا جا رہا تھا اور اُسے کچھ سوچنے کا موقع دینے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔

"کیسے ملے گی؟" — اجے نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

"کام کرنا ہوگا — تمہارے لیے یہ معمولی کام ہے اور کام بھی آج اور ابھی کرنا ہوگا کیونکہ میرے پاس آج کے بعد شاید اس کام کے لیے وقت نہ ہو۔"

"وہ کیا کام ہے؟" — اجے نے بمشکل ہی دریافت کیا۔

"مجھے آج رات ہی اس ریڈار کا بلیو سکیچ چاہیے۔ تم جانتے ہو اس وقت ایڈمن کے دفاتر بند ہیں — جاؤ اور کوئی ایک سکیچ لے آؤ۔ اسی میں تمہارا بھلا ہے۔" خان اب کا باقاعدہ حاکم بن بیٹھا تھا۔

"لیکن ابھی یہ کیسے ممکن ہے۔ آج میری چھٹی ہے۔ میں کل......"

"مسٹر اجے۔ کل نام کال کا۔ تم بچے نہیں ہو۔ کوئی بھی بہانہ کر سکتے ہو۔"

"دیکھو پرماتما کے لیے کل تک کا وقت دے دو۔ میرے لیے ابھی یہ ناممکن ہے!!"

ل ہارو ہالنا ہو چلا تھا۔

"ایک شرط پر کل تک کا وقت دے سکتا ہوں" خان نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"مجھے تمہاری ہر شرط منظور ہے۔"

"کل تک تمہاری "سروس بک" میرے پاس رہے گی۔"

خان کے اس فقرے نے کارپورل اجے ساہنی کو لرزا کر ہی تو رکھ دیا تھا۔ وہ چند لمحے کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔

"بلیو سکیچ" کا حصول اُس کے لیے بالکل آسان تھا اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوتی۔ پھر وہ پیسوں کے لیے بھی باؤلا ہوا جا رہا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ خان بُری طرح اُس کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا "سروس بک" کو ایک منٹ کے لیے بھی خود سے الگ کرنا کتنا سنگین جرم ہے لیکن روزانہ کون چیک کرتا ہے، اُس نے سوچا۔ "آٹھ گھنٹے ہی کی تو بات ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اُس نے ہامی بھر لی۔

خان نے اپنا ہاتھ دوستی اور "ڈیل" کے لیے اُس کی طرف بڑھا دیا۔ اجے کے ہاتھ کی کپکپاہٹ وہ اچھی طرح محسوس کر سکتا تھا۔ اُس نے ریوالور اب اپنی جیب میں واپس رکھ لیا تھا اور بیک پاکٹ سے سروس بک نکال رہا تھا۔ کپکپاتے ہاتھوں سے اُس نے سروس بک خان کی طرف بڑھا دی۔ خان نے ایک سرسری سی نظر اُس پر ڈالی۔

"ہم یہاں سے الگ ہو جائیں گے۔ تمہاری ڈیوٹی پانچ بجے آف ہوتی ہے۔ میں چھ بجے سے ساڑھے چھ بجے کے درمیان تمہیں اُسی بس سٹاپ پر ملوں گا جہاں ہم پہلی مرتبہ ملے تھے۔"

اجے ساہنی نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ خان "شب بخیر" کہہ کر آگے بڑھ گیا۔ اجے اُسے بے بسی سے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اُس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زخمی چڑیا کی طرح وہ خود ہی اپنے پھیلائے ہوئے جال میں پھنس جائے گا۔

ایک لمحے کا توقف کیے بغیر وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھ گیا اور اجے ساہنی اُسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اندھیرے میں چند قدم دور تک تو اس کا ہیولا نظر آتا رہا پھر وہ تاریکی کا حصہ بن کر کارپورل کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

یہ اُس کی خود اعتمادی کا کمال تھا جس نے کارپورل اجے ساہنی کے سارے کھیل کا پانسہ پلٹ کر رکھ دیا تھا اور وہ اُس کے جال میں پھنس گیا تھا اگر خان کا واسطہ کسی مضبوط اعصاب کے آدمی سے پڑا ہوتا تو معاملہ اُلٹ بھی ہو سکتا تھا۔

"سروس گن" اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد اگرچہ خان مطمئن ہو چکا تھا لیکن احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا تو جیسے اُس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اُسے اپنی تربیت کا ایک ایک سبق اَزبر تھا۔ اُسے بتایا گیا تھا کہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی بھی کبھی کبھی بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے!" اجے ساہنی کی نبضیں اُس کے ہاتھ میں تھیں لیکن اُس نے اپنی گرفت حالات پر ڈھیلی نہ ہونے دی۔

کھیتوں کے بیچوں بیچ چلتا وہ اب سڑک کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اُس نے چوکس بلّی کی طرح سڑک کا جائزہ لینے کے بعد اسے عبور کر لیا اور پھر کھیتوں کے سلسلے میں چلنے لگا ــــ

راستے میں تین چار دیہات بھی آئے لیکن خان انہیں نظر انداز کر کے آگے نکل گیا۔ اُس نے دورانِ تربیت اتنی مشق کی تھی کہ اس طرح مسلسل پندرہ بیس گھنٹے بھی اگر وہ چلتا رہتا تو اُسے کوئی فرق نہ پڑتا۔

بالآخر آدھی رات کے بعد وہ تھوڑی دیر سستانے کے لیے ایک ٹھکانہ ڈھونڈنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ یہ کسی کھیت کے درمیان بنی وہ جھونپڑی تھی جو کسان عموماً دن میں دھوپ سے بچنے یا کچھ دیر آرام کرنے کے لیے بنا لیا کرتے ہیں۔ جھونپڑی کا اُس نے بڑے محتاط انداز سے جائزہ کیا اور اِس یقین کے بعد کہ آس پاس کوئی نہیں ہے وہ اندر گھس

کھاٹ پر کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گیا۔ اُس کے بازو سے بندھی گھڑی کی سوئیاں رات کے دو بجنے کا اعلان کر رہی تھیں۔

"صبح چار بجے تک" ــــ اُس نے اپنے آپ سے کہا اور لیٹ گیا۔

یہ مشق اُس نے اکثر کی تھی جس کی مدد سے وہ ایک خاص وقت پر بیدار ہونے میں کامیاب ہو جاتا تھا ــــ بمشکل دس پندرہ منٹ بعد ہی وہ نیند کی دیوی کے بازوؤں میں جھولا جھول رہا تھا اور ٹھیک چار بجے اُٹھا۔

جھونپڑی کے ایک کونے میں رکھے ہوئے مٹی کے گھڑے سے اُس نے پانی پیا پھر وضو کر کے وہیں نماز ادا کی۔ اِس دیارِ کفر میں گو کہ خدا کی یاد اُسے پہلے سے زیادہ آنے لگی تھی لیکن اُس روز نوافل پڑھتے ہوئے جو روحانی سکون اُس نے محسوس کیا وہ اُسے زندگی میں اس سے پہلے کبھی میسّر نہ آیا تھا۔

خدا کے حضور بندگی گزارتے ہوئے اُس کا ذہن ماضی کی طرف پلٹا اور اُسے یاد آ گیا کہ یہ زمین جس پر وہ آج چھپ کر نماز ادا کر رہا ہے کبھی اُس کے اجداد کی آماجگاہ رہی تھی ــــ یہ فضائیں اللہ کی وحدانیت کا درس صدیوں سے پڑھتی چلی آ رہی تھیں اور آج بھی یہاں کی مٹی سے شہیدوں کے لہو کی مہک اُٹھ رہی تھی۔

خان اُن سرفروشوں کو یاد کر رہا تھا جو یہاں ہزاروں میل کا سفر طے کر کے پہنچے تھے۔ اس لیے کہ کفر کدے میں ایمان کی شمع روشن ہو جائے ــــ اُن کے لہو سے روشن ہونے والے چراغوں کی لَو میں ہی آج عابد خان کو اپنی منزل تلاش کرنی تھی۔

اور جب وہ ذکرِ الٰہی سے فارغ ہو کر عازمِ سفر ہوا اِک ولولہ تازہ بھی اُس کے ساتھ تھا اور بھارتی کاؤنٹر انٹیلی جنس کو تسخیر کرنے کا عزم لے کر چلا تھا۔

○

صبحِ زندگی بیدار ہونے سے پہلے وہ سڑک کے کنارے پہنچ چکا تھا! جان بوجھ کر

...ہی کرنا پڑا۔ کہ اجے نے سویلین کپڑے پہن رکھے تھے۔ پہلے اُس کا دھیان تصویر کے ...لو ہی کی طرف گیا تھا، لیکن اُسے جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ یہ اقدام اجے ساہنی نے ...اقدام کے طور پہ ہی کیا ہوگا۔

خان خود ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے وہ اجے کو نظر نہیں آسکتا تھا۔ اجے بس سے اُتر ...پیدل چلتا ہوا اُس بس سٹاپ کی طرف آرہا تھا جہاں سے اُسے گاؤں جانے کے لیے ...مل سکتی تھی اور جہاں اُس نے "وجے" سے ملاقات کرنی تھی۔ بس سٹاپ کی طرف ...وہ چور نظروں سے چاروں اطراف کا جائزہ بھی لے رہا تھا۔ اُس کی معمولی حرکت ...خان کی کڑی نظریں لگی تھیں۔ اِس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسی کو ...اور خان کی نظر میں نہ آسکے۔ بس سٹاپ پہ پہنچ کر وہ ایک قدرے ویران گوشے ...کھڑا ہو گیا۔

اجے ساہنی نے اب بے چینی سے گھڑی کو بھی بار بار دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ قریباً دس ...اسی طرح گزر گئے اب کارپورل کی پریشانی بڑھنے لگی تھی۔ اس نے بس سٹاپ کے ...احاطے میں ٹہلنا بھی شروع کر دیا تھا۔

دس منٹ کے بعد خان نے اپنے نزدیک سے گزرنے والے ایک سائیکل رکشہ کو رُکنے ...کیا اور اُسے ایک منزل بتا کر سوار ہو گیا۔ اُس نے سائیکل رکشہ والے سے کارپورل اجے ...کے نزدیک پہنچنے پر اتنے اچانک بریک لگوائے تھے کہ اجے ساہنی کے علاوہ خود رکشہ ...بھی بوکھلا کر رہ گیا۔

"...بھیا! آؤ ناں۔ اِدھر آؤ۔ ارے کہاں گھوم رہے ہو؟" اُس نے رکشہ میں بیٹھے ...آواز لگائی۔

...دم بخود رہ گیا۔ پھر اُس کے نزدیک پہنچا۔ اُس کے حواس ابھی تک مختل تھے۔ خان ...ہاتھ پکڑ کر قریباً کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ بٹھا لیا۔ پہلی نظر میں تو اجے اُسے

اُس نے دو تین بسیں گزر جانے دیں ان کے بعد آنے والی ایک بس میں سوار ہو کر وہ... پہنچ گیا۔

شہر کے آغاز ہی میں وہ اُتر گیا تھا! ایک "ویلنگٹو ڈھابے" پہ اُس نے ڈٹ کر... کیا اور گیارہ بجے تک کا وقت ایک سیر گاہ میں گزارنے کے بعد سینما ہال میں گھس گیا۔

دوپہر کا مختصر سا کھانا اُس نے چار بجے کھایا اور پیدل ہی اب اپنی "آر۔وی" (جہاں... جاسوس ملا کرتے ہیں) کی طرف جا رہا تھا۔ احتیاطاً اُس نے پچھلے چار پانچ روز سے... ہوئی ڈاڑھی سے نجات حاصل کر لی تھی۔ اور کلین شیو ہونے کے بعد اب درمیانے د... کوئی کلرک نظر آرہا تھا۔ آنکھوں پہ لگا چشمہ اُس نے تھوڑی دیر پہلے ہی خریدا تھا... کے سفید شیشے بادی النظر میں یہی ثابت کرتے تھے کہ اُس کی نظر بہت کمزور ہے۔

چہرے پہ چھوٹی چھوٹی مونچھوں کی موجودگی اور نئی عینک نے اُس کا حلیہ خاصا... دیا تھا۔ کارپورل کی آمد سے قریباً ایک گھنٹہ پہلے ہی وہ بس سٹاپ کے نزدیک آ... تھا۔ وہ یہاں بے مقصد ہی نہیں چلا آیا تھا اُسے اپنی تربیت کے مطابق اس بات کا... لینا تھا کہ اُس کے لیے یہاں پہلے ہی سے کوئی جال تو نہیں بُنا گیا؟ اگر کارپورل اجے... کو اُس نے بلیک میل کر کے پھنسا لیا تھا تو یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود مشکوک ہو گیا ہو... ایئر فورس والے اجے ساہنی ہی کی نگرانی نہ کر رہے ہوں ـــــ!!

اجے ساہنی کے رنگے ہاتھوں پکڑے جانے کو بھی اُس نے نظر انداز نہیں کیا تھا... ممکن تھا کہ اُس نے انٹیلی جنس کو اصلیت سے آگاہ کر دیا ہو اور اب وہ لوگ اُس کی... کے منتظر ہوں۔ ایک گھنٹے کی مسلسل جستجو کے بعد بھی اُسے یہاں فی الحال کوئی مشکوک... شخصیت نظر نہیں آئی تھی۔

اب اُس کی نظریں شہر کی طرف سے آنے والی بسوں پر لگی تھیں۔ چند منٹ بعد... نے اجے کو ایک بس سے برآمد ہوتے دیکھا ـــــ! اُسے یہ دیکھ کر بڑی خوشگوار...

پہچان ہی نہیں پایا تھا جیسے ہی وہ خان کے ساتھ بیٹھا، خان نے سائیکل رکشہ والے کو
جلدی چلنے کا حکم دیا اور اُس کی ٹانگیں حرکت میں آ گئیں۔

○

"کیا حال ہیں بھیّا! ٹھیک تو ہو نا ــــ" اُس نے حیران اجے کو اپنی طرف
"ہاں۔ ہاں ٹھیک ہوں۔ ٹھیک ہوں۔ سب ٹھیک ہو گیا ــــ" وہ ابھی تک بوکھلایا ہوا تھا۔

"ہوش میں آؤ ــــ کیوں بچوں ایسی حرکتیں کر رہے ہو؟" خان نے اُس کی طرف ہوئے اجے کے کان میں سرگوشی کی۔

جواب میں اجے ساہنی نے خوامخواہ دانت نکال دیے۔ خود کو نارمل ظاہر کرنے کی میں اُس کی شکل پہلے سے بھی زیادہ مضحکہ خیز نظر آنے لگی تھی۔ لیکن جلد ہی اُس نے قابو پا لیا۔

"کام ہو گیا؟" ــــ خان نے آہستہ سے پوچھا۔

"ہاں" ــــ اجے نے بھی مختصر سا جواب دیا۔

سائیکل رکشہ نے جیسے ہی گاندھی باغ کا موڑ کاٹا خان نے اُسے رُکنے کو کہا۔

"بس یار ایک کام یاد آ گیا" ــــ اُس نے رکشہ والے کو پورے پیسے تھما دیے
بے چارا واپسی پر مُڑ مُڑ کر بھی اُس کا شکریہ ادا کرتا رہا۔

دونوں تُلے تُلے قدموں سے چلتے باغ میں داخل ہو گئے۔ داخلے کے لیے خان جان بوجھ کر لمبا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس دوران اُس نے اچھی طرح اطمینان کر لیا کا تعاقب نہیں کیا جا رہا۔ اجے ساہنی سحر زدہ معمول کی طرح اُس کے ساتھ ساتھ ایک ویران گوشے میں دونوں درخت کے نیچے رکھی پتھر کی ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔

اجے نے بھی احتیاطاً چاروں اطراف کا جائزہ لیا اور کچھ کہے سُنے بغیر اپنے

جیب سے ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر خان کی طرف بڑھا دیا۔ خان نے بڑے اطمینان سے اُسے کھولا اور کن انکھیوں سے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد اُسے دیکھنے میں مگن ہو گیا۔
ریڈار سٹیشن کی تمام تفصیلات اُس کے سامنے پھیلی لکیروں میں بکھری پڑی تھیں اور وہ اس عطیہ خداوندی پر احساسِ تشکر سے مٹا جا رہا تھا۔

"ونڈر فل" "تم تو یار بڑے کام کے آدمی ہو" خان نے کاغذ تہہ کر کے اپنی جیب میں محفوظ کر لیا۔

"میری پاس بُک" ــــ اجے ساہنی بولا۔

"یہ لو ــــ اور ہاں تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس کی مکمل نقل میرے پاس محفوظ ہے۔"

"کیوں"؟ ــــ اجے کے منہ سے گھبراہٹ کے مارے اچانک ہی نکل گیا۔

"تاکہ تم آئندہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔"

"دیکھو مجھے دھمکاؤ نہیں ــــ میں نے یہ کام تمہاری بلیک میلنگ سے ڈر کر نہیں صرف پیسوں کے لیے کیا ہے۔ مجھے بھی تمہاری طرح دولت اکٹھی کرنے کا شوق ہے۔"

"یہ ہوئی نہ بات ــــ اس کا مطلب ہے ہم مستقبل میں اچھے دوست ثابت ہوں گے۔"

"ہاں" ــــ اجے کا لہجہ قدرے مضبوط تھا ــــ "اگر پہلا سودا اچھا ہوا۔"

"کیوں نہیں ــــ کیوں نہیں" ــــ خان نے اپنی دوسری جیب سے نوٹوں کی ایک گڈی نکال کر اُس کی طرف بڑھا دی۔

یہ چھوٹے نوٹ تھے۔ دس دس روپے والے اور ایک ہزار روپیہ ــــ لیکن اجے کے لیے لاکھوں سے کم نہیں تھے۔ اُس نے زندگی میں اتنی بڑی رقم کبھی شاید دیکھی ہی نہیں تھی۔ خان نے محسوس کیا جیسے واقعی اس کی باچھیں کِھل گئی ہوں۔ اُس کے لیے یہ امر باعثِ تسکین تھا کہ ابتدا ہی میں اُسے ایسا شاندار "مقامی دوست" میسّر آ گیا تھا۔

"ویسے بھائی صاحب تم ہو کون"۔۔۔۔ ؟ ابجے نے نوٹ جیبوں میں ٹھونستے ہوئے پوچھا۔

"آخری مرتبہ سن لو بھارتی ناگرگ (شہری) ہوں اور آئندہ کبھی یہ فضول سوال نہ پوچھنا۔"

"لیکن کم از کم مجھے یہ جاننے کا حق تو ہے کہ میں کس ایجنسی کے لیے کام کر رہا ہوں۔"

جواب میں خان نے اُس کے سامنے ایک بہت بڑی عالمی طاقت کی ایجنسی کا نام لے کر اُسے پھر بوکھلا دیا تھا۔ ابجے ابھی تک یہی سمجھ رہا تھا کہ خان پاکستانی انٹیلی جنس کا کوئی مقامی ٹاؤٹ ہے لیکن جب اُسے علم ہوا کہ اس کا واسطہ دنیا کی سب سے بڑی جاسوسی ایجنسی سے پڑا ہے تو وہ خود حیران رہ گیا۔۔۔۔ اُس نے اپنے "پہلے اہم شکار" کو یہ بتا دیا کہ اس بزنس میں کسی کو اپنا اصل نام اور پتہ نہیں بتایا جاتا اور آئندہ وہ خود ہی ابجے سے رابطہ قائم کرے گا۔

اس دوران اُس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اُسے یہ دھمکی بھی دے دی تھی کہ کوئی بھی راز منکشف ہونے کی صورت میں اُسے بہر حال جان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔



ابجے ساہنی سے الگ ہو کر وہ سیدھا انبالہ ریلوے سٹیشن پر آیا۔ جب وہ گاڑی میں سوار ہوا تو گزشتہ چوبیس گھنٹے کے واقعات ایک ایک کر کے اُس کے سامنے آنے لگے۔ "کرش پاکستان" کے نعرے اُس کے کانوں میں گونجتے تو ۶۵ء کے شہدا کے لہو کی مہک بھی اُس کا حوصلہ بڑھانے لگتی۔

اگر وہ لوگ اس موبائیل ریڈار سٹیشن کو کبھی یہاں سے ہٹا بھی لیتے تو بھی اس کی اندرونی ساخت کی مکمل ڈرائنگ اُس کے مُلک کے پاس محفوظ تھی۔

کچھ باتیں، کچھ گھاتیں

ٹرین رات کافی دیر گئے اور اپنے مقررہ وقت کے قریباً تین گھنٹے بعد چلی۔ یہ تین گھنٹے اس نے باقی مسافروں کی طرح بڑی اذیت سے کاٹے تھے۔ لیکن یہ تو یہاں کا معمول تھا۔ راستے اس لائن میں کوئی رکاوٹ آنے کی وجہ سے ڈاک گاڑیاں لیٹ آ رہی تھیں اور تمام گاڑیاں پاس کرنے کے بعد ہی اِس پسنجر ٹرین کی باری آتی تھی۔

اس مرتبہ خان نے تیسرے درجے میں سفر کرنے کو ترجیح دی تھی۔ اس کے چہرے سے غائب ہو چکی تھی اور کرتے پاجامے میں ملبوس سر پر بازار سے خریدی ہوئی کھدر کی لگائے اور گرم چادر اوڑھے وہ کوئی سماجی کارکن یا پھر ٹھیٹ کانگریسی دکھائی پڑتا تھا۔ سفر کے آغاز ہی میں خوش قسمتی سے اُسے خالی جگہ اونگھنے کو مل گئی تھی۔

پرانی دلّی کے اسٹیشن پر جب یہ پسنجر ٹرین پہنچی تو رات کی سسکیاں دم توڑنے لگی تھیں۔ سورج نے ادھ کھلی دہلی کے کارخانوں کی مہر بلب چمنیوں کی اوٹ سے سر نکالنا شروع کر دیا تھا لیکن سڑکیں ابھی تک ویران تھیں۔

تمام راستے وہ ٹھاٹ سے سوتا ہوا آیا تھا۔ محض دو تین گھنٹے کی اِس کچی پکی نیند نے بھی اس کی ساری کسلمندی دُور کر دی تھی اور اب وہ خود کو خاصا ہشاش بشاش اور تازہ دم محسوس کرنے لگا تھا۔

ریلوے لائن کے دونوں اطراف موجود گڑھوں میں اُس نے ہاتھوں میں گڑویاں اُٹھائے

ایک ہجوم بے کراں کو اُترتے دیکھا تھا ـــــ یہ وہ لوگ تھے جن کے متعلق اُس نے بچپن میں کہانیاں سُنیں، ٹریننگ کے دوران میں تصویریں دیکھیں اور آج اپنی آنکھوں سے اُنہیں دیکھ رہا تھا۔

مُنہ سے "رام رام" جپتے اِن انسانی بھیڑیوں نے اپنی بغلوں میں چھُرے دبا رکھے تھے اور وہ اصل میں یہاں اسی لیے تو آیا تھا، کہ اِن انسان نما بھیڑیوں کی بغلوں میں چھُپی چھُریوں سے اپنی حکومت کو باخبر کر سکے ـــ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ اپنی فطرت کے عین مطابق پیٹھ میں خنجر گھونپ دیں۔

پُرانی دہلی ہی میں اُس کے لیے آج پہلے اور دوسرے وقت کی دو "آر۔ وی" رکھی گئی تھیں! اگر وہ صبح دیر سے پہنچتا تو شام کے بعد دوسری جگہ "مقامی دوست" اُس کا منتظر ہوتا۔ حُسنِ اتفاق سے اُسے دونوں "آر۔ وی" کی سہولتیں حاصل تھیں۔

امانت کا جو بارِ گراں وہ انبالے سے لے کر یہاں تک آیا تھا اُسے جلد از جلد اُنہیں ہاتھوں تک پہنچانے کے لیے اُس نے شام کا انتظار کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اُسے بتایا گیا تھا "صبح گیارہ بجے سے ساڑھے گیارہ بجے تک اُسے مقبرۂ ہمایوں پر اپنے مقامی دوست سے پہلی ملاقات کرنی تھی۔"

باقی مسافروں کی طرح اُس نے بھی بڑے بوجھل قدموں سے ریلوے اسٹیشن کا آہنی پل عبور کیا۔ اِس پُل پر شاید ایک انچ جگہ بھی ایسی خالی نظر نہیں آ رہی تھی جہاں کسی نے کچھ لکھا نہ ہو۔ ایک نعرہ جو زیادہ تواتر کے ساتھ ہر جگہ تحریر تھا وہ "بھارتیوں کے ایک قوم" ہونے سے متعلق تھا۔ یہاں تسلسل سے "ایکتا" کا نعرہ دیکھ کر اس شہر میں آنے والے کسی بھی اجنبی مسافر پر پہلا تاثر یہی قائم ہوتا تھا کہ جیسے حکومت اس مُلک میں بسنے والے درجنوں مذاہب کے پیروکاروں کو زبردستی "ایک قوم" بنانے پر تُلی ہوئی ہے۔

پُل کے دوسری طرف والی سیڑھیوں پر ایک بوڑھا سکھ کلکٹر مسافروں کے ٹکٹ

کر رہا تھا۔ اُسے دیکھ کر کچھ ہندو نوجوانوں نے جان بوجھ کر سگریٹ سُلگا لیے تھے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر بوڑھے سکھ کی طرف دھواں اُچھالنے لگے تھے۔ یہ دیکھ کر احساس ہوا کہ "ایکتا کا درس" آخر بھارت سرکار اتنی شدت سے کیوں دیتی چلی آئی ہے! دھویں سے گھبرا کر بوڑھا سکھ ٹکٹ کلکٹر ہجوم کے ساتھ سیڑھیاں اُتر کر غائب ہو اس کے تعاقب میں ابھی تک ہندو سگریٹ نوش نوجوانوں کے قہقہے گونج رہے تھے۔

لاری اڈے کے ایک ویشنو ہوٹل میں اُس نے ہلکا سا ناشتہ کیا اور اِس بس میں سوار مہرولی کی طرف جاتی تھی۔ دہلی کی خوابیدہ سڑکوں پر زندگی اب بھرپور انگڑائی بیدار ہو چکی تھی۔ انسانوں کا ایک ٹڈی دَل سیلاب کے ریلے کی طرح ایک سے دوسری بہہ رہا تھا۔

مہرولی کے نزدیک سکاؤٹ کیمپ کے قریب سے گزرتے ہوئے جب اُس کی نظریں سکاؤٹ کے پاس جھاڑیوں کے نیچے دبی ہوئی چھوٹی اینٹوں سے بنی ہوئی پرانی قبروں پر پڑیں۔ کر یہاں سے ہر گزرنے والے کو اپنے دیدۂ عبرت نگاہ" ہونے کی دُھائی دے رہی چاہتے ہوئے بھی وہ چند لمحوں کے لیے وہاں رک گیا۔

اُسے یاد آ گیا۔ تاریخ کے اُستاد نے انہی قبروں کے متعلق بتایا تھا: "کبھی یہ میدان جس سکاؤٹ کیمپ لگا ہوا ہے مقبرۂ ہمایوں ہی کا ایک حصہ ہوا کرتا تھا۔" وہ سوچنے قبریں بھی شاید اُنہی بد قسمت مغل شہزادوں کی ہی ہوں گی جو جنگِ آزادی کے یہاں پناہ لینے چلے آئے تھے ـــــ اور جنہیں فرنگی غنڈوں نے شہید کر ڈالا۔"

اس ماحول میں وہ ہاتھ اُٹھا کر اُن کے لیے دعائے خیر تو نہ کر سکا لیکن اِس کا دِل آنسو رونے لگا تھا اور اس کے دل کی گہرائیوں سے راہِ آزادی کے اُن جانبازوں کے لیے دعائیں نکل رہی تھیں جنھوں نے اپنا آج آنے والی مسلمان

نسلوں کے کل کی نذر کر دیا تھا۔



ایک سائیکل رکشہ کے ذریعے تھوڑی دیر بعد ہی وہ شاہجہان آباد سے کوئی ڈھائی میل جنوب کی طرف ہمایوں کے مقبرہ میں پہنچ گیا۔

مقبرے کی عمارت دیکھ کر پہلے تو وہ واقعی دنگ رہ گیا: روئے زمین پر ایسی عمارت کی نظیر تلاش کرنا ممکن نہیں تھا — سنگِ مرمر اور سنگِ سُرخ کی یہ حسین عمارت اپنے دامن میں کئی قبریں سمیٹے نہ جانے کب سے اسی طرح ایستادہ کھڑی تھی۔ اِس مقبرے کو "فردوس بریں" کہا گیا تھا اور خان اندازہ لگا سکتا تھا کہ ایسا کہنا کچھ غلط نہ ہوگا۔

لیکن اب تو عالم ہی اور تھا۔ وسیع وعریض اندرونی احاطے میں چاروں اطراف زوال عمارت کے آثار بکھرے دکھائی دیتے تھے۔ نہ کوئی نہر نہ آبشار نہ فوارہ نہ حوض، نہ پھول، نہ پھل، نہ گلزار نہ اُس کے رکھوالے۔ خستہ حال مرکزی عمارت کے اوپر ایک گنبد بنا ہوا تھا، جس کے نچلے دروں کے گھُپ اندھیروں میں دن کے وقت بھی چمگادڑیں دیواروں سے سر پٹخ رہی تھیں — ہر سو ایک وحشت، ایک نامرادی اور نحوست طاری تھی۔

اس مقبرے نے ایک بے نام سی یاسیت خان پہ طاری کر دی تھی۔

مقبرے میں مقامی لوگ بہت کم اور غیر مقامی بہت زیادہ نظر آرہے تھے — وہ اپنی یادداشت کے سہارے باغ کے کونے میں رکھی ایک لوہے کی بنچ پہ بیٹھ گیا! ایک دال والا لڑکا کب سے اُس کا منتظر وہاں دوسرے کونے میں دُبکا کھڑا تھا۔ خان کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے اُس کی طرف دہلی کی مخصوص کرخنداری زبان میں دال کی صفات بیان کرتا ہوا آیا اور نہ چاہنے کے باوجود خان نے اُس سے دال کا پیکٹ خرید لیا۔

لڑکا اُس کا شکریہ ادا کرتا ہوا واپس چلا گیا — خان کا دل بالکل کچھ کھانے پینے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ یہاں اس مزار کے احاطے میں بیٹھ کر اُسے اپنا سب کچھ چھنا ہوا،

کھویا ہوا سا محسوس ہوا جس کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا — اُسے اس احاطے میں موجود بے شمار قبروں کے کھنڈرات سے اپنی قوم کا شاندار ماضی بیدار ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے مغلیہ حکمرانوں کا جاہ وجلال یہاں کی ایک ایک سال خوردہ اینٹ سے جھلکتا تھا، لیکن خان ماضی کی تاریخ کے کھنڈرات میں پناہ لینے کے بجائے حال کی چیرہ دستیوں کا سامنا کرنا چاہتا تھا۔

ٹھیک گیارہ بجے اُس نے اپنی جیب سے ایک نیلے رنگ کا رومال نکالا اور دہلی کے نوجوان لڑکوں کے سے انداز میں اُسے باندھ لیا۔ لوہے کی اس ٹھنڈی بنچ پر اپنے ساتھ ہی اُس نے اپنی دوسری جیب سے چارمینار سگریٹ کی ایک ڈبی اور ماچس نکال کر رکھ دی اور اب دال سے بظاہر لُطف اندوز ہو رہا تھا۔

ساڑھے گیارہ بجے تک اُس کے دل کی دھڑکنوں نے اپنی رفتار بڑھالی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اُٹھ کر کھڑا ہو جائے کوئی اچانک ہی اُس کے پیچھے سے نمودار ہوا! نووارد نے سلیقے سے سر پر پگڑی باندھ رکھی تھی اور اس سُرخ پگڑی کے نیچے ایک نیلے رنگ کی ململ اُسی کپڑے کی بنی ہوئی پٹی بھی دکھائی دے رہی تھی جیسا کہ اُس کا رومال تھا۔

"ست سری اکال جی!" آنے والے نے بڑی بے تکلفی سے اُس کے نزدیک بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ایک سکھ کا اتنا احترام تو کیجیے مہاراج کہ "چارمینار" جیب میں رکھ لیں!" اُس نے گویا اپنی پہچان کرانے کے لیے پہلا کوڈ ورڈ استعمال کیا۔

"اوہ معاف کرنا سردار جی! لیکن مینار تو ایک بھی جیب میں نہیں رکھا جاتا۔ آپ چار کی بات کرتے ہیں۔ خیر چھوڑیے "ایک چار" کے چکر میں کیا پڑنا۔ کیا شُبھ نام ہے آپ کا؟"

"گیان سنگھ" — جواب نے اُس کے تمام شکوک ختم کر دیے۔

"کچھ مہاراج کہتے ہیں!" خان نے اپنا کوڈ نام دہرایا۔

ان چار بے ہنگم فقروں کے بعد دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی شناخت مکمل کروادی تھی۔

نواز سکھ نے اُسے وہاں سے اُٹھنے کا اشارہ کیا اور دونوں پیدل چلتے آپس میں بے تکلفی سے باتیں کرتے باہر تک آ گئے! ایک نزدیکی ہوٹل شاید گیان سنگھ نے پہلے ہی سے اِس مقصد کے لیے تاڑ رکھا تھا۔ خان کو وہ اُس ہوٹل کے ایک میلے کچیلے کیبن میں لے آیا۔

چائے کا آرڈر دیکر دونوں نے ایک ایک لفافے کا تبادلہ کیا: خان والے لفافے میں ریڈار سٹیشن کا بلیو سکیچ، سیف ہاؤس کمار اور اجے ساہنی کے متعلق معلومات درج تھیں۔ اور گیان سنگھ والے لفافے میں اُس کے لیے تازہ ہدایات اور احکامات تحریر تھے۔

دونوں نے ایک بات بھی فالتو نہیں کی تھی اور جیسے ہی خان نے چائے کی پیالی ختم کی اُس کے ہمراہی نے کھڑے ہو کر "ست سری اکال" کہتے ہوئے اُس کے سامنے ہاتھ باندھ دیے۔

—— یہ اشارہ تھا اُس کے لیے یہاں سے چلے جانے اور گیان سنگھ کو تنہا چھوڑ دینے کا۔ دمِ رخصت اُس نے گیان سنگھ کی آنکھوں میں نمی تیرتی ہوئی محسوس کر لی تھی۔



گیان سنگھ سے الگ ہو کر وہ بھی قدرے پریشان سا ہو گیا تھا: "جانے یہ کون تھا؟ اس کا نام کیا تھا؟" اُس کی آنکھوں میں تیرتی نمی نے اِس بات کا احساس تو خان کو دلا دیا تھا" کہ گیان سنگھ نے بھی اسکی طرح اپنی شخصیت پر جانے کتنے خول چڑھا رکھے ہیں اور وہ کوئی غیر نہیں اُس کا ہی ہم وطن اور ہم مذہب ہے! جانے اس جیسے کتنے پاکستانی اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے یہاں سرگرم عمل ہیں! یہ لوگ —— دشمن کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنے وطن کی آنکھیں بنے یہاں بھیس بدلے وطن کے مفادات کی نگرانی کر رہے ہیں —— جانے اس راہِ پُرخار میں کتنی صعوبتوں کا سامنا انہیں کرنا ہوتا ہوگا۔ اکثر اپنی جان سے بھی گزر گئے ہوں گے —— لیکن کون یاد رکھتا ہوگا انہیں۔ کیسے احساس ہو گا اس بات کا کہ کچھ گمنام جیالے دیارِ غیر میں اپنی زمین کی سلامتی کی نذر ہو چکے ہیں —— تاریخ میں بھی کبھی ان

کا نام نہیں آئے گا کیونکہ وہ مرتے وقت بھی پرایا بھیس بدلے ہوئے تھے۔

گیان سنگھ کو امانت سونپ کر وہ اپنے آپ کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا تھا۔ یہ معمولی بات نہیں تھی۔ ابتدا ہی میں اُس کے پاس "کمار" جیسا سیف ہاؤس اور کارپورل اجے ساہنی جیسا مقامی دوست" موجود تھے اب اُسے اپنا زیادہ تر کھیل انہی دو مہروں کے گرد کھیلنا تھا۔

وہ چاہتا تو ابھی مسٹر سہائے کے ہاں پہنچ جاتا جہاں اُسے مکمل امان ہر طرح میسر تھی، لیکن اُس نے سوچا پہلے اُسے اپنا حلیہ بدلنا تھا۔ بھٹنڈہ میں اُس نے دہلی میں اپنے نئے اور مستقبل کے گھر کے متعلق، تفصیلی رپورٹ" بھجوائی تھی اور اُسے اُمید تھی کہ اس لفافے میں دہلی کے متعلق ہی ہدایات موجود ہوں گی۔ اس وقت وہ لفافہ کھول کر دیکھنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا اور اُس مقصد کے لیے کوئی ویرانہ درکار تھا۔

"کیوں نہ کناٹ پیلس چلوں" اُس نے خیال کیا۔

اور ایک رکشہ میں اُس طرف روانہ ہو گیا۔

کناٹ پیلس جمنا کنارے بنی وہ بستی تھی جو کبھی دِلّی کے شُرفا کا مسکن رہی ہو گی لیکن اب شرافت نام کی کوئی شے اُسے دکھائی نہیں دے رہی تھی، بلکہ بے حیائی کا مسکن بنا ہوا تھا۔ باغ کے ایک ایک ویران کنج میں جو مقامی کالجوں کی لڑکیوں اور لڑکوں کے نیم برہنہ ماحول سے ابھی تک محفوظ تھا وہ ایک درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ چاروں طرف دھوپ رقص کر رہی تھی۔ نرم اور پُرسکون دھوپ نے اپنی گود ساری پھیلا کر رکھی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے ساتھ اس دھوپ نے اُسے بہت سکون بخشا

اُس نے چاروں اطراف ماحول کا سرسری نظروں سے جائزہ لیا اور مطمئن ہو کر لفافہ چاک

کرلیا۔ سب سے اوپر ایک مقامی بنک کا بیس ہزار روپے کا چیک اُس کے لیے موجود تھا جس کے ساتھ ایک خالی کاغذ ـــــ کاغذ پر کہیں کہیں پیلے دھبے اُسے دکھائی دے رہے تھے! اپنی جیب سے ماچس نکال کر اُس نے تیلی سلگائی اور کاغذ کو آنچ دینے لگا۔ جلد ہی لفظ نمایاں ہو کر اُبھر آئے۔

اُس کی اب تک کی بھاگ دوڑ کو خصوصاً ننھا سنگھ جیسے غدّار اور ڈبل کراس کا اس کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ جانا بہت سراہا گیا تھا اور اس کارنامے پر اُسے باقاعدہ مبارکباد دی گئی تھی۔ خان کو اِس بات کی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ دہلی میں "سہائے گھرانے" کا کو... حاصل کرے۔ اِس کے ساتھ ہی مختصر ترین الفاظ میں ایک مقامی کام بتایا گیا تھا اور اگلے احکامات حاصل کرنے اور "مقامی کام" کو "اپنے دوستوں" تک پہنچانے کے لیے اگلے چند ر... کی آر۔ وی لکھی گئی تھی۔

کاغذ اور لفافہ اُس نے جلا کر راکھ کر دیا اور راکھ کو پاؤں سے اچھی طرح مسل ڈالا۔ اب اُس کا رُخ کناٹ پیلس کی مقامی آبادی کے کسی بڑے ریڈی میڈ گارمنٹس سٹور کی طرف تھا۔

گھنٹہ ڈیڑھ کی مغز کھپائی کے بعد بالآخر اُسے مطلوبہ اشیاء مل گئیں اور جب وہ وہاں سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو نہ صرف یہ کہ اُس کے ہاتھ میں موجود اٹیچی کیس میں مزدور یا... زندگی کی ہر شے تھی بلکہ اُس کا اپنا حلیہ بھی بالکل بدل چکا تھا: اَب وہ پہلے والا اَروِن کمار شرما بن چکا تھا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہی اروِن کمار شرما ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بڑے اطمینان سے بیٹھا رگھوناتھ سہائے کے گھر کی طرف جا رہا تھا۔



پہاڑ گنج کی اُس آبادی تک پہنچنے میں اُسے بمشکل آدھ گھنٹہ لگا تھا۔ یہاں ایک چھوٹی سی سرکاری کالونی میں وہ لوگ رہتے تھے۔ یہ کالونی ایک طرح سے نئی اور پرانی...

...مسلم بھی تھا۔ اُس نے ڈرائیور کو مسٹر سہائے کا نمبر بتا دیا تھا اور اب وہ خود ہی مکان ڈھونڈنے ...دو کر رہا تھا۔ ڈرائیور نے ٹیکسی گیٹ کے عین سامنے لا کر کھڑی کر دی۔ دروازے کے باہر اُسے کشور کھڑا نظر آیا جو خان کی نظر پڑتے ہی تیزی سے بھاگتا ہوا اندر چلا گیا۔ شاید گھر خبر کرنے گیا تھا کیونکہ خان کے ٹیکسی والے کو فارغ کرنے تک دوبارہ کشور، آشا اور اپنی ماں کے ساتھ گیٹ پر پہنچ چکا تھا۔

"ارے بھیّا ـــــ آشا نے اُسے دیکھتے ہی نعرہ بلند کیا۔

"پائے لاگوں ماتا جی" ـــــ خان نے جھک کر مسز سہائے کے پاؤں چھوئے جنہوں نے اُسے کھڑے ہوتے ہی اپنے پوپلے منہ سے بے شمار دعاؤں اور بوسوں سے نواز دیا تھا۔

کشور نے اُس کا ننھا سا اٹیچی کیس تھام لیا اور وہ گھر والوں کی معیت میں اندر داخل ہو گیا۔ تین کمروں ایک سٹور، کچن اور ڈرائنگ روم پر مشتمل یہ خوبصورت سا مکان ہی شاید سہائے کی زندگی بھر کی کمائی کا نچوڑ تھا۔ خان کے لیے اُن لوگوں نے پہلے ہی سے الگ بندوبست کر رکھا تھا۔ اُسے دروازے کے بالکل ساتھ والا کمرہ دے دیا گیا۔ خان کی نظریں ابھی تک بڑی بے تابی سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔

"آپ جسے ڈھونڈ رہے ہیں وہ ایک گھنٹہ سے پہلے نہیں آئے گی"! اُسے چند منٹ کے لیے اکیلا پا کر آشا نے جھٹ سے کہہ دیا۔

"اوہ! نہیں نہیں بھئی میں تو آپ کا مکان دیکھ رہا ہوں۔"

"ارے مہاراج ہم سے کیا پردہ" ـــــ آشا نے بڑی بے تکلفی سے اُس کے بازو پر ہاتھ مارا اور قہقہہ لگا کر ہنس دی۔ خان نے بھی اُس کے ساتھ ہنسنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا تھا۔

یہ کمرہ شاید اُن لوگوں نے بھٹنڈہ سے واپس آنے کے فوراً ہی بعد اُس کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ کمرے میں پلنگ نیا نیا لگایا گیا تھا اور دیوار پر ایک خوبصورت پینٹنگ بھی لٹک

رہی تھی۔ جب اُس نے ایک کونے میں رکھی میز پر سجے پھولوں کے ایک گلدستے کو اپنی
سے عادت کے مطابق ہٹا کر دیکھنا چاہا تو نیچے دھرے ایک کارڈ پر رَما نے بڑے خوبصورت
الفاظ میں لکھا تھا :

"اس گھر میں آنے والے نئے مہمان کے لیے ایک خوبصورت سی تمنا ——— کہ وہ
یہیں کا ہو کر رہ جائے۔"

ایک معصوم سی مسکراہٹ اُس کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔ اُسے اِس آرٹسٹ لڑکی پر
آنے لگا تھا جس نے ایک ہی ملاقات میں اپنا مقدر اُس سے وابستہ کر لیا تھا! وہ
کے ایک جھونکے کی طرح یہاں آیا تھا، جانے کب کہیں اور نکل جاتا۔

ماتا جی تو اُسے کمرے میں چھوڑ کر رسوئی میں جا گھسی تھیں اور کشور کو اُنہوں
دوڑا دیا تھا۔ آشا کو بھی وہ بار بار ہاتھ بٹانے کے لیے رسوئی میں بلاتی تھیں جو خان
چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ہی اُس کے سامنے ہندو گھرانوں کی روایتی مہمانداری کے نمونے
پڑے تھے: جو پاپڑ اُس کے سامنے رکھے تھے اُس سے پہلے خان نے شاید کبھی
نہیں تھے اور بھی اِسی طرح کی الم غلم اشیاء پڑی تھیں۔ اُس نے اُن لوگوں کا دل رکھنے کے
لیے بادلِ نخواستہ کچھ زہر مار کر ہی لیا۔

رَما کے کالج میں آج شاید کوئی فنکشن تھا آشا نے تو چاہا کہ وہ جا کر اُسے خان
آمد سے مطلع کر دے لیکن خان نے اُسے بڑی سختی سے منع کر دیا۔

"میں اُسے "سرپرائز" دینا چاہتا ہوں۔" اُس نے آشا کی تسلی کرواتے ہوئے کہا۔

بوڑھا سہائے بھی گھر والوں کی لعن طعن سے بچنے کے لیے صبح کو گھر سے نکل
شام ڈھلے واپس لوٹا کرتا تھا۔

دوپہر کو کھانا کھانے کی اب اس میں ہمت ہی باقی نہیں رہی تھی۔ ماتا جی

لے کر وہ آشا اور کشور کو اپنے ساتھ لے کر کہیں سیر کے بہانے باہر نکل آیا۔

اُس نے اِس دوران دونوں بہن بھائیوں کی خواہشات اور کمزوریوں کا اندازہ لگا
لیا تھا۔ کشور کو اپنے ہاتھ میں رکھنا یوں بھی اس کے لیے ناگزیر تھا۔ یہ لڑکا کسی بھی وقت
بگڑ کر اُس کے لیے دشواریاں پیدا کر سکتا تھا۔

دونوں کو ساتھ لے کر سب سے پہلے وہ بنک پہنچا۔ اتنی بڑی رقم کا چیک کیش کرواتے
ہوئے اُنہوں نے شاید پہلی مرتبہ کسی کو دیکھا تھا۔ یوں تو اِس گھر کے سب ہی ممبران اس
کی امارت کے قائل تھے لیکن اُس نے کشور کو بطورِ خاص آج مرعوب کیا، یہاں سے دونوں
بہن بھائیوں کے ساتھ وہ دہلی کے ایک بڑے ہوٹل میں جا پہنچا۔

خان نے واضح طور پر محسوس کیا جیسے اُس نے دونوں کی کئی جنموں کی چھپی ہوئی خواہش
کو پورا کر دیا ہو لیکن وہ بیچارے احساسِ کمتری کے ہاتھوں خاصے دبے دبے نظر آرہے
تھے۔ جس خیالی دُنیا کو انہوں نے اپنا مسکن بنا رکھا تھا وہاں ایسے ہوٹلوں میں جانے کی
خواہشیں تو ضرور جنم لیا کرتی ہیں۔ لیکن عملی زندگی میں شاید وہ اس کے نزدیک پھٹکنے کا تصور
بھی نہیں کر سکتے تھے اور آج بھگوان کی دیا سے انہیں ایسا بھائی مل گیا تھا جس نے اُن کے
اس خواب کو حقیقت کا روپ دے دیا۔ دونوں اس پہ مٹے جا رہے تھے۔

ہوٹل سے فارغ ہوتے ہی وہ لوگ اب ایک بڑی مارکیٹ کا رُخ کر رہے تھے ———
ہر طرف سے وہ اِس خاندان پر بڑا بھرپور حملہ کرنے جا رہا تھا۔

اُس نے اِس گھر میں بسنے والے ایک ایک فرد کی نفسیات کو سمجھ لیا تھا۔ وہ جان گیا
تھا یہ سب لوگ محرومی کی ایک اَن دیکھی آگ میں سُلگ رہے تھے۔ گھر میں موجود اسباب
کا اندازہ بھی اُس نے بخوبی لگا لیا تھا اور اُسے یقین ہو چلا تھا کہ بوڑھے سہائے نے زندگی
صرف تنخواہ پہ ہی گزاری ہے۔

شام گئے جب وہ شاپنگ سے فارغ ہو کر گھر پہنچے تو سہائے گھر میں موجود تھا دونوں

میاں بیوی کی آنکھیں خوشگوار حیرت سے جیسے پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ جب انہوں نے کشور، آشا اور خان کے علاوہ ٹیکسی ڈرائیور کو بھی بڑے بڑے ڈبّے اور پیکٹ اٹھائے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ خان نے اُن پر بڑا گہرا وار کیا تھا۔ ایک ڈبّے میں ٹی۔وی تھا اور دوسرے میں کشور اور آشا کے لیے "ڈیک"۔

"بہ بہ بیٹا — " سہائے کی تو جیسے زبان نے ہلنے سے انکار کر دیا تھا۔

"بس باپو جی! ایک لفظ بھی نہ کہیئے اِس سے آگے! میرا من گواہی دیتا ہے کہ ضرور کسی پچھلے جنم میں آپ مجھ سے بچھڑ گئے تھے۔ ہاں آپ سب لوگ۔ اَب میں سارے جنموں کا حساب چکا دوں گا۔" اُس نے شاندار اداکاری کا مظاہرہ کیا اور آنکھوں میں آنسو بھر کر باپو جی سے لپٹ گیا۔

ماحول خاصا جذباتی ہو گیا تھا۔ سہائے اور مسز سہائے کے علاوہ دونوں بچے بھی آنسو بہا رہے تھے اور چاروں خان سے باری باری لپٹ کر اُسے نذرِ عقیدت پیش کر رہے تھے۔ جانے بے چارے کب سے ترس رہے تھے اِن دونوں چیزوں کے لیے؛ وہ بے شمار پیکٹ ان دونوں چیزوں کے علاوہ تھے جن میں آشا اور کشور کی جینز۔ باپو جی اور ماتا جی کے لیے اور اَن سِلے کپڑے اور رُما کے لیے دو ساڑھیاں رکھی تھیں۔ خان نے اِس موقعے پر مسز سوشیل اور اُس کے بچّوں کو بھی فراموش نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا آج کی مضبوط سرمایہ کاری پر ہی پر اُس نے اپنے مُستقبل کی بُنیادیں اُستوار کرنی ہیں۔

کشور اور آشا تو خوشی سے دیوانے ہوئے جاتے تھے۔ دونوں بوڑھے بار بار ٹی۔وی اور ڈیک کو چھُو کر شاید اس بات کا یقین کر لینا چاہتے تھے کہ واقعی وہ خواب تو نہیں دیکھ رہے۔



شام ڈھلے جب رُما گھر پہنچی تو گھر کا بدلہ ہوا نقشہ دیکھ کر اُس کی آنکھیں حیرت سے

کی کھُلی رہ گئیں۔ خان یونہی ہوا خوری کے بہانے تھوڑی دیر کے لیے باہر نکل گیا تھا۔

وہ جس علاقے میں قیام پذیر ہونے والا تھا۔ اُس کا جائزہ لینا بھی ضروری تھا۔ یہ تو اس کی خوش قسمتی تھی کہ یہ کالونی محلّہ ٹائپ جگہ نہیں تھی۔ ورنہ اب تک اس کی شہرت کے افسانے زبانِ زدِ خاص و عام ہو چکے ہوتے۔ یہاں زیادہ تر دوسرے درجے کے سرکاری اور غیر سرکاری افسران ہی رہائش پذیر تھے اور یہ لوگ خود کو مہذّب اور تعلیم یافتہ ظاہر کرنے کے لیے ایک دوسرے کے معاملات میں کم ہی دخل دیا کرتے تھے — نہ ہی کسی گھر کو پتہ ہوتا کہ دوسرے گھر میں کیا ہو رہا ہے لیکن ٹی۔وی کا انٹینا دیکھ کر وہ یہ بات ضرور جان گئے تھے "کہ جگن ناتھ سہائے کے گھر ٹیلیویژن آگیا ہے۔" زیادہ نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ محکمے سے اپنے بقیہ جات حاصل کرتے ہی بوڑھے کا دماغ خراب ہو گیا ہے جو اُس نے فضول خرچی شروع کر دی۔

رات گئے جب اُردون کمار گھر واپس لوٹا تو اس کے کمرے کا حُلیہ ہی تبدیل ہو چکا تھا۔ ایک کے بجائے وہاں تین پینٹنگز نصب تھیں۔ کرسیوں کے کشن بدلے جا چکے تھے۔ اس کی جوتیاں سلیقے سے ایک طرف رکھی تھیں اور شیو کا سامان ایک چھوٹے سے سنگھار میز پر دھرا تھا۔ یہ سنگھار میز اُس کے کمرے کے ایک کونے میں رکھا گیا تھا اور تازہ خریدا ہوا لگ رہا تھا۔

اپنی دانست میں وہ چوروں کی طرح دبے پاؤں گھر میں داخل ہوا تھا۔ گھر کے تمام لوگ ڈرائنگ روم میں جمع تھے اور باہر کا کسی کو ہوش نہیں تھا۔

ابھی اُس نے بمشکل کپڑے تبدیل ہی کیے تھے جب دروازے کا پردہ سرکا اور رُما داخل ہوئی۔ شاید وہ کسی کام سے اِدھر آئی تھی! خان نے جان بوجھ کر کمرے کی روشنی نہیں کی تھی — جیسے ہی رُما نے بٹن دبایا اور روشنی میں، اُس کی نظر خان پر پڑی تو ایک لمحے کے لیے جیسے اُس کی قوّتِ گویائی ہی سلب ہو کر رہ گئی۔ پھر اُس کے

ہونٹ کپکپائے۔

"نمسکار" اُس نے دونوں ہاتھ اپنے سینے پر باندھ لیے۔ ابھی تک رَما نے اپنے کپڑے بھی تبدیل نہیں کیے تھے اور وہ اس کے کمرے کو بنانے سنوارنے میں جُتی ہوئی تھی۔

"جے ہند ــــ" خان نے مسکراتے ہوئے بڑے مضحکہ خیز انداز میں ہاتھ جوڑ دیے۔ رَما مُسکرائے بغیر نہ رہ سکی۔

"آپ ہر بات میں سنسنی ضرور پیدا کرتے ہیں۔" رَما نے بے اختیار کہہ دیا۔

"ہاں رَما جی! جب زندگی بالکل کھوکھلی ہو جائے تو آدمی اپنے اِردگرد یونہی ہنگامے کھڑے کر کے اِس خلا کو پورا کرتے لگتا ہے۔"

"آپ! آپ کیا ہیں اردن کمار جی! آپ نے ہم سب کو لوٹ لیا ــــ ہم سب کو" رَما خاصی جذباتی ہو گئی تھی۔

"نہیں رَما۔ ایسی بات نہیں حقیقت تو یہ ہے رَما کہ تم نے مجھے دوبارہ زندہ رہنے کی تحریک دی ہے۔ میری زندگی کا اب کوئی مقصد نہیں رہ گیا تھا۔ بس مشین کی طرح دن رات پیسے کماتے رہو۔ مجھے اس روز بس میں سفر کرتے ہوئے تمہاری آنکھوں میں زندگی دکھائی پڑی تھی۔ رَما میں جانے کس جنم سے کچھ کھوج رہا تھا۔ تمہیں مل کر ــــ تم سب لوگوں کو مل کر یوں لگتا ہے جیسے میری تلاش مکمل ہو گئی ہو۔

"یہ ہمارا سوبھاگیہ (خوش قسمتی) ہے اُردن کمار جی!" وہ شرم سے دوہری ہوتی جا رہی تھی۔ خان نے کوئی لگی لپٹی رکھے بغیر اُسے بہت بڑی بات کہہ دی تھی۔ وہ خود اپنی بات پر چونک پڑا۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ رَما کے سامنے بھی وہ آخر ایکٹر کیوں نہیں بن سکتا ــــ اُس کی ساری اداکاری رَما کو دیکھ کر دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ یہ کوئی نیک شگون نہیں تھا اُس کے لیے۔ وہ یہاں عشق کرنے نہیں آیا تھا۔ دورانِ تربیت اُس کے اساتذہ نے اُسے فولادی اعصاب کے مالک کے خطاب سے نوازا تھا لیکن آج اُسے یوں لگ

رہا اس روئے زمین پر بسنے والے کروڑوں انسانوں کی طرح ایک بہت ہی کمزور انسان ہے۔ اس نے رَما سے جو کچھ کہا یقیناً اُس کے دِل کی آواز تھی۔ آج تک اُسے دماغ کے استعمال کی تربیت ہی دی گئی تھی۔ یہ دِل کا معاملہ کیا تھا؟ کتنا جان لیوا تھا؟ اس کا احساس تو اُسے کبھی نہ ہو سکا۔

"کیسا لگا آپ کو ہمارا گھر" ــــ رَما نے اُسے کہیں دُور کھوئے دیکھ کر قریب لانے کی کوشش کی۔

"ہمارا گھر؟ کیا مطلب۔ بھئی میرا گھر کہو۔ اپنا گھر کیسا ہی ہو سورگ لگتا ہے سب کو۔ یہ پینٹنگز بہت ہی خوبصورت ہیں۔" خان نے گفتگو کا رُخ بدلنا چاہا۔

"واقعی" ــــ؟ رَما نے اپنی آنکھیں پوری طرح کھول کر بجلی گرائی۔

"ہاں تمہیں یقین نہیں آتا کیا؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"اس لیے اُردن کمار جی! کہ یہ تو ایک نالائق مصورہ کی بنائی ہوئی ہیں"۔

"یعنی مس رَما سہائے کی ــــ" آشا اچانک ہی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی تھی۔ خان کو یقین تھا کہ وہ چھپ کر ابھی تک دونوں کی گفتگو سُنتی رہی ہے۔ اُس کی اس طرح آمد رَما کو واقعی ناگوار گزری تھی۔ لیکن آشا چُپ نہ رہ سکی۔

"میں بھی کہوں آخر رما جی کہاں غائب ہو گئیں۔" اُس نے بڑے شرارتی لہجے میں کہا۔

"رَما اگر یہ تمہاری بنی ہوئی پینٹنگز ہیں تو واقعی لاجواب آرٹسٹ ہو۔ تمہارے ذہن کی ساری خوبصورتی تمہاری انگلیوں کے راستے اِس کینوس پر بکھر گئی ہے۔" خان واقعی پینٹنگز سے خاصا متاثر نظر آ رہا تھا ــــ

تینوں ایک دوسرے کے تعاقب میں ڈرائنگ روم میں چلے آئے۔ دونوں میاں بیوی اور کشور اُسے آتے دیکھ کر اس طرح احتراماً اٹھ کر کھڑے ہو گئے جیسے اُن کا مرشد اندر داخل ہوا ہو۔ کشور نے بھیّا جی! بھیّا جی!" کا ورد کرتے اُسے زبردستی اپنی کُرسی پر بٹھا دیا اور خود اُس کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ اس نے ابھی سے جین پہن لی تھی۔

رات گئے تک وہ لوگ ٹی وی کے گرد جمع رہے۔ کھانا سب نے وہیں کھایا۔ اپنی اپنی تھالیاں سامنے رکھے وہ ٹی وی سکرین پر نظریں جمائے بیٹھے رہے۔ اُن کی بھوک تو جیسے بالکل ہی غائب ہو کر رہ گئی تھی۔ خان اور سہائے خان کے کمرے میں چلے آئے۔

خان نے اُسے بتا دیا تھا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اب اُس کی چوکھٹ سے آن لگا ہے۔ اُس نے سہائے کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ "مُلک بھر میں اُس کا ہزاروں روپیہ اُدھار میں پھنسا ہوا ہے جو کُل مِل ملا کر ڈیڑھ لاکھ روپے سے زیادہ کی رقم بنتی تھی اور اُس کے بھائیوں نے بڑی چالاکی سے یہ سارا اُدھار اِس کے کھاتے میں ڈال دیا ہے۔"

اُس نے اپنے پاس موجود پندرہ ہزار روپے سہائے کے سامنے رکھے تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ سہائے کے پاس اس وقت تک اپنی سروسز کے بقایاجات میں سے بمشکل آٹھ دس ہزار روپے ہی بچے تھے۔

خان نے اُسے اس بات کے لیے رضامند کر لیا تھا: کہ "سہائے اور وہ مل کر ایک کمپنی بنائیں اور خود کو فوج، پولیس وغیرہ میں رجسٹر کروا کر وہاں سے چھوٹے چھوٹے سپلائی آرڈر وصول کر لیا کریں۔" رجسٹریشن کا ذمہ بھی اُس نے خود ہی لے لیا تھا۔ سہائے نے اس کی ہدایات پر آمنّا صدقنا کہا۔

خان نے اُس کے سامنے مستقبل کی ایک ایسی شاندار تصویر کھینچی تھی کہ بوڑھا سہائے ابھی سے خود کو لکھ پتی ٹھیکیدار محسوس کرنے لگا تھا۔

خان کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ ضرور بطور سی یا بی کلاس سپلائر خود کو رجسٹر کروا لے

ذرا رشوت سے یہاں کیا کچھ نہیں ہو سکتا تھا؟ اس کا اندازہ اُس نے بخوبی لگا لیا تھا! ایک مرتبہ افسری کی بیرکوں تک رسائی حاصل کر لینے کے بعد وہ اپنے مُلک کے لیے کیا کچھ کر سکتا تھا؟ اس کا بھی اُسے بخوبی اندازہ تھا۔ سہائے کے منع کرنے کے باوجود خان نے وہ ساری رقم زبردستی اُس کے ہاتھ میں تھما دی تھی۔

جاتے جاتے اُس نے آنکھوں میں آنسو بھر کر اور بڑے رقت آمیز لہجے میں جگن ناتھ سہائے سے التجا کی تھی ـــــ "باپو جی! بھگوان کے لیے کبھی بھول کر بھی میرے ماضی سے متعلق کوئی بات مجھ سے نہ پوچھیے۔ میں سب کچھ بھول جانا چاہتا ہوں۔ میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ میں نے آج ہی آپ کے گھر جنم لیا ہے اور پچھلا جنم میں بھول چکا ہوں۔"

سہائے نے بیقرار ہو کر اُسے سینے سے لگایا اور اس بات کا "وشواش" دلایا: "کہ اِس خاندان اور برادری کا کوئی فرد کبھی یہ تصور بھی نہیں کرے گا کہ وہ کوئی اور ہے ـــــ وہ سب اس کے جذبات کا ہر طرح احترام کریں گے۔"

خان کے سمجھانے پر سہائے نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ ہر ملنے والے کو یہی بتائے گا" کہ "موہن کمار اُس کے مرحوم دوست کا اکلوتا بیٹا ہے جس کے ماں باپ حادثے میں مر چکے ہیں اور اب وہ اُسی کے پاس رہے گا۔"

"بہت دھنواد آپ کا باپو جی! جانے آپ کے احسانات کا بدلہ کبھی چکا بھی پاؤں گا یا نہیں" ـــــ اُس نے آنکھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے سہائے کو کہا۔

اور اتنی دیر میں رَما بھی اپنی ماتا، بہن اور بھائی کے ساتھ کمرے میں داخل ہو گئی۔

اُس وقت وہ دونوں ـــــ اُس کا باپو اور خان گہری سوچوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اس کا باپ ـــــ تو ایک جوان بیٹے کے مل جانے پر بھگوان کا جی ہی جی میں شکریہ ادا کر رہا تھا اور ـــــ خان ان خیالوں میں گم تھا کہ: "مستقبل کی اس منصوبہ بندی میں کوئی خلا تو باقی نہیں رہ گیا؟"

"آپ لوگ کہاں کھو گئے ہیں؟" اُس کی ماتا نے سہائے کو جھنجوڑا تو وہ بولا۔

"یہیں تو ہم ہیں ___ اسی کمرے میں"۔

"تو پھر بچوں کو سونے دیں ناں"۔ ماتا بولی: "رات کافی بیت گئی ہے"۔

یہ سنتے ہی سب نے اپنے اپنے کمروں کی راہ لی۔



رات کافی دیر تک وہ مکان کی چھت پر رما سے باتیں کرتا رہا: اُس کے کالج کی باتیں، اُس کی دوستوں کی باتیں۔ اُس کے مشاغل کی باتیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے اور اُس کے مستقبل کی باتیں۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔

وہ رات اُس نے کروٹیں بدلتے ہی گزار دی۔ رات دیر گئے اُسے نیند آئی تھی۔ گھر والوں نے بھی اُسے جگانا مناسب نہ جانا اور جب وہ بیدار ہوا تو سورج خاصا چڑھ آیا تھا۔ رما، آشا اور کشور پڑھنے جا چکے تھے۔ سہائے دوپہر کا سودا سلف لانے چلا گیا تھا۔ اُسے بیدار ہوتے دیکھ کر ماتا جی اُس کے لیے چائے لے آئیں۔

نہا کر اِس کی طبیعت خاصی نکھر آئی تھی۔ ناشتے سے فارغ ہوتے تک سہائے بھی آ گیا اور تھوڑی دیر بعد دونوں باپ بیٹا اپنے نئے بزنس کا آغاز کرنے کے لیے گھر سے روانہ ہو رہے تھے ___ اُنہیں آج ہی رجسٹریشن کے لیے درخواست داخل کرنی تھی۔ رجسٹریشن کا مسئلہ اُس نے چٹکی بجاتے ہی حل کر لیا۔ سہائے نے تو اُسے صرف فارم بھر کر دیا تھا اور اُس کے ساتھ اُس فوجی دفتر تک گیا تھا۔ جہاں اُنہیں درخواست جمع کروانی تھی۔

___ یہاں اُس کے دھرم پُتر ارون کمار نے جانے کیسے اُس چپراسی کو تاڑ لیا تھا جو بڑے صاحب کے دفتر کے باہر پہرے پر کھڑا تھا ___ ایک کونے میں لے جا کر ارون نے اُس سے کچھ باتیں کیں اور پھر دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔

سہائے گھر آنا چاہتا تھا۔ دوپہر خاصی ہو چلی تھی اور اُسے بازار کا کھانا کھانے کی عادت نہیں تھی۔ وہ تو نوکری کے دنوں میں بھی دوپہر کا کھانا گھر سے لے کر جایا کرتے تھے۔

"گھر چلیں اب" ___ اُنہوں نے خان کی طرف دیکھا۔

"نہیں باپو جی! شما کیجیے۔ ابھی آپ کو تھوڑا انتظار کرنا ہو گا۔ دس منٹ بعد ہمارا ایک دوست آئے گا۔ اُس کے ساتھ ہم اکٹھے ہی کسی ہوٹل میں کھانا کھائیں گے۔ ارون کمار نے بڑے معذرتی لہجے میں کہا۔

"جیسی تمہاری اچھیا!" ___ باپو جی اپنے ہونہار پُتر کی کسی بات کی مخالفت نہیں کر سکتے تھے۔

دونوں دفتر کی انتظار گاہ کے ایک کونے میں بیٹھ رہے۔ واقعی پورے دس منٹ بعد اُنہوں نے چپراسی کو اُس طرف آتے دیکھا ___ وہ انہیں اشارہ کرتا ہوا آگے نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد تینوں ایک ہوٹل کے کیبن میں بیٹھے کھانا کھا رہے تھے! سہائے اور خان نے تو ویشنو کھانا کھایا تھا جبکہ چپراسی مُرلیا رام نے اپنے لیے میٹ کی ڈبل پلیٹ طلب کی تھی۔ وہ اُن دونوں کے سامنے اتنی ڈھٹائی سے کھانے پر ٹوٹا ہوا تھا جیسے اُن کا کوئی دیرینہ اور بے تکلف قسم کا آشنا ہو۔

خان نے اُسے اپنی مجبوری بتائی تھی: کہ شریف لوگ ہونے کے ناطے وہ دفتروں کے چکر نہیں لگا سکتے اور یہیں اگر معاملہ ختم ہو جائے تو بہتر ہے۔

"ہم کسی کا حق نہیں ماریں گے بھائی صاحب! لیکن غریب لوگ ہیں اور نیا نیا دھندا شروع کر رہے ہیں"۔ اس نے قریباً گھگھیاتے ہوئے مُرلیا رام سے کہا۔

"آپ شریف آدمی ہیں مہاراج! ہم آپ کا کام کروا دیں گے"۔

خاصی رد و قدح کے بعد بالآخر معاملہ دو ہزار پر ٹھہرا۔ خان نے اُسی وقت ایک ہزار

روپیہ اُسے دے دیا اور رُلیا رام نے ایک ہفتہ بعد آکر رجسٹریشن لے جانے کا کہہ دیا۔

"کمال ہے بھئی تم نے تو ناممکن کو ممکن بنا دیا"۔۔۔ ہوٹل سے باہر نکلتے ہی سہائے نے بے اختیار اُسے داد دی۔

"ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے باپو جی!"۔۔۔ اُس نے دل ہی دل میں کہا لیکن زبان سے کچھ نہ بولا۔ صرف "آپ کی دعاؤں کا صدقہ" کہہ کر خاموش ہو رہا۔

○

باپو جی کے ساتھ جب وہ گھر واپس پہنچا تو سب ہی لوگ گھر آ چکے تھے۔ کشور اپنا ڈیک دکھانے کے لیے کالج کے دو تین لڑکوں کو ساتھ لایا تھا اور اُن پر خاصا رعب جھاڑ رہا تھا۔ خان نے شام تک کا وقت اُن لوگوں کے ساتھ گزارا پھر ایک کام کا بہانہ کر کے باہر چلا آیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ صفدر جنگ روڈ کی جانب سڑک کے اُس حصے کی طرف جا رہا تھا۔ جہاں سرکاری دفاتر بنے تھے۔۔۔ وہیں اُس نے ٹیکسی روکی اور پیدل ہی اُتر کر ایک طرف چل دیا۔

دفاتر میں چھٹی کا وقت ہو چکا تھا اور یہ شاہراہ خاصی مصروف دکھائی دے رہی تھی۔ اُس نے جان بوجھ کر پندرہ بیس منٹ مزید ضائع کر دیے پھر مختلف بلاکوں کا چکر لگا کر بالآخر ایک تین منزلہ عمارت کے سامنے رُک گیا۔ اس عمارت کے باہر انگریزی حروف میں ایک چھوٹا سا بورڈ لگا تھا جس پر "نیشنل ریسرچ سیل" لکھا تھا۔

اس ریسرچ سیل میں کیا گل کھلایا جا رہا تھا؟ اس کی کچھ خبر تو خان کے مُلک کو تھی لیکن حال ہی میں اس سیل سے متعلق کچھ زیادہ ہی تشویشناک اطلاعات ملی تھیں۔

۔۔۔ اگلے روز بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے سربراہان کی ایک خصوصی خفیہ میٹنگ منعقد ہو رہی تھی اور اُسے اسی میٹنگ میں ہونے والی کارروائی کی رپورٹ حاصل کرنا

تھی۔ یہاں آکر اُس کے لیے یہ اطلاع ایک طرح سے نئی تھی کہ بھارتی انٹیلی جنس ایجنسیوں کے بعض اہم نوعیت کے دفاتر کور ناموں سے کام کر رہے ہیں۔ یہ نیشنل ریسرچ سیل بھی اسی قماش کا ایک ادارہ تھا۔

جب اُسے یقین ہو گیا "کہ اعلیٰ افسران اب اپنے اپنے گھروں کو سدھار چکے ہیں" تو وہ بھی اپنا بریف کیس سنبھالتا اندر داخل ہو گیا۔

یہاں مین گیٹ پر سیکورٹی کے انتظامات اتنے معصومانہ قسم کے تھے کہ خود خان بھی ایک لمحے کے لیے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا "کیا نیشنل ریسرچ سیل کی بجائے واقعی یہ کوئی علمی تحقیقاتی ادارہ ہی تو نہیں۔ کیونکہ ابھی تک کسی نے اُسے چیک نہیں کیا تھا۔

ویسے اُسے اس بات کا اندازہ ہو گیا کہ یہاں زیادہ تر اُنہی لوگوں کی آمدورفت رہتی ہے جو اس دفتر کے معاملات میں عمل دخل رکھتے ہیں اس لیے شاید اُسے بھی انہی لوگوں میں سے کوئی سمجھا جا رہا تھا کیونکہ اُس نے ابھی تک اپنی کسی حرکت سے خود کو ابنارمل ظاہر نہیں کیا تھا اور اسی طرح بے دھڑک اندر گھُس رہا تھا جیسے وہ کوئی بڑا سیکورٹی آفیسر ہو۔

اُس کے دائیں بائیں بھی لوگ آ جا رہے تھے لیکن شاذ ہی کسی نے کسی سے بات کی ہو! خان نے بھی کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ ایک راہداری میں چل رہا تھا جس کے دونوں اطراف کمرے بنے ہوئے تھے۔ ان کمروں کے باہر مختلف عہدوں کے ساتھ مختلف ناموں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں اور جلد ہی اُسے اپنا مدعا پورا ہوتا نظر آیا۔ ایک کمرے کے باہر "ڈائریکٹر ریسرچ سیل "مسٹر کے۔ ڈی ملہوترا" لکھا ہوا تھا۔

کمرہ بظاہر بند نظر آ رہا تھا لیکن اس کے بغلی کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا۔ ایک لمحے کے لیے اُس نے کچھ سوچا پھر اُس کمرے میں جا گھُسا۔

ایک میز کے کونے پر بیٹھی ایک ٹائپسٹ لڑکی ٹائپ رائٹر پر انگلیاں چلا رہی تھی۔

اور اس کے سامنے والی کرسی پر ایک بابو بیٹھا تھا۔ ٹیلیفون دھرے تھے اور ایک کونے میں ٹرانسمیٹر سیٹ دھرا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے کسی نے جلدی میں یہاں رکھ دیا ورنہ شاید ایسی غلطی ایسے "محفوظ ادارے" میں کبھی بھی نہ کی جاتی! اُسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر دونوں چونک اُٹھے۔

"کیپٹن شکلا!" ــــ اُس نے دونوں کو کچھ پوچھنے کا موقعہ دیے بغیر کہا: "مجھے مسٹر ملہوترا سے ملنا ہے۔"

جیسے ہی اُس کے مُنہ سے "کیپٹن" کے الفاظ نکلے وہ دونوں اپنی اپنی جگہ مودّب کھڑے ہو گئے۔

"سر وہ تو آف کر چکے ہیں۔" مرد نے جو غالباً سیکرٹری تھا جواب دیا۔

"اوہ مائی گڈ لک ــــ مَیں تو سری نگر سے آیا تھا۔ کچھ پیپر ہینڈ اوور کرنے ہیں۔ فلائیٹ لیٹ ہو گئی اور آج رات ہی مجھے ٹیک آف کرنا ہے ــــ" اُس کا لہجہ بالکل فوجی قسم کا ہو رہا تھا: "میرا یہ فسٹ وزٹ ہے۔ خیر کل سہی۔"

"او۔کے سر۔" سیکرٹری نے کھڑے کھڑے کہا۔

"تھینک یو۔ اِٹ از کونفیڈنشل" ــــ اُس کا لہجہ خاصا باوقار ہو گیا تھا۔

پھر جیسے ہی وہ واپسی کے لیے گھوما لڑکی اور مرد دونوں کے ہاتھ سیلوٹ کے لیے اُٹھ گئے جس سے خان نے اندازہ لگا لیا کہ ان دونوں گدھوں کا تعلق بھی آرمی ہی سے ہے۔

اُسی طرح باوقار چال چلتا وہ باہر نکل آیا۔ "یہ مرحلہ اتنی آسانی سے طے ہو جائے گا" اُس نے تو سوچا بھی نہ تھا۔ عمارت میں موجود لوگوں سے بالکل لاپرواہ چلتا ہوا وہ باہر نکل آیا۔ باہر سڑک پر لوگوں کی آمد و رفت کچھ ماند پڑ گئی تھی۔

خان چاہتا تو اِس دفتر کے بالکل سامنے سے سواری پکڑ سکتا تھا لیکن اُس نے جان بوجھ کر اِس سے احتراز برتا اور پیدل ہی سڑک کے کنارے بنی فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔

جلد ہی اُس کی محنت راس آگئی اور اُس نے وہ آدمی نوٹ کر لیا جو کافی دیر سے اُس [illegible] چکا ہوا تھا۔ ایک مسکراہٹ خان کے ہونٹوں پر پھیلتی چلی گئی ــــ "ریسرچ سنٹر کے لوگ [illegible] محتاط واقع ہوئے تھے!" اب وہ اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا۔

تعاقب کرنے والا اُس سے بمشکل دس بارہ گز دور تھا اور دونوں کے درمیان کچھ اور [لوگ] بھی پیدل چل رہے تھے! چلتے چلتے اچانک ہی اُس نے ایسی حرکت کی کہ تعاقب میں [آنے] والا بوکھلا کر رہ گیا۔ خان سڑک کے کنارے بنے ایک چھوٹے سے بک سٹال پر یک لخت [کھڑ]ا ہو گیا۔ تعاقب میں آنے والے کے پاس سوائے اس کے اور کوئی راستہ باقی نہ بچا [تھ]ا کہ وہ اپنی دھن میں اُسی طرح آگے نکل جائے۔ کیونکہ خان نے اُسے خاصا قریب آنے [illegible] دے کر یہ حرکت کی تھی۔ اور جیسے ہی تعاقب میں آنے والا اُس سے آگے نکلا وہ [illegible] سے داہنی طرف گلی میں گھوم گیا۔ اس گلی میں آمد و رفت کچھ زیادہ ہی ہو [illegible]ی۔ خان نے اتنی تیزی سے مختلف آنے جانے والوں کے آگے پیچھے ہو کر پوزیشن [illegible]لی تھی کہ جب تعاقب کرنے والے نے مُڑ کر دیکھا تو واقعی وہ چکرا کر رہ گیا۔ اُس نے [illegible] کی بھیڑ میں دُور دُور تک نظریں دوڑائیں لیکن "کیپٹن شکلا" کو تو جیسے زمین کھا گئی [illegible] آسمان نے نگل لیا۔

○

اس گلی میں وہ رُکا نہیں ــــ!

[illegible] تیز رفتاری سے اُس نے مختلف گلیاں بدلی تھیں اور اب ٹیکسی میں سوار [illegible] سمت کی طرف جا رہا تھا۔ ایک گھنٹے میں تین مختلف ٹیکسیاں بدلنے کے بعد [illegible] کالونی سے کچھ فاصلے پر بنی دوسری کالونی پر اُتر گیا اور ٹیکسی کے نظروں سے [illegible] کے بعد پیدل چلتا اپنے گھر کی طرف آگیا۔

[illegible] کے گھر پہنچنے تک کھانا تیار ہو چکا تھا اور اب وہ لوگ اُسی کے انتظار میں

بیٹھے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ سب ٹی۔وی کے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے! اس دوران سہائے نے خان کے آج کے کارنامے اُن لوگوں کے گوش گزار کر دیے تھے اور اب وہ انہیں اُس کے سامنے قند مکرر کے طور پر دھرا رہا تھا۔ باقی سب تو اُس کی تعریف میں رطب اللسان تھے جبکہ خان اِس طرح نظریں جھکائے بیٹھا تھا جیسے اپنی اِس حرکت پہ شرمندہ ہو۔

کھانا ختم ہونے پر وہ رما کے ساتھ اِس کے کمرے میں چلا آیا۔

"دیوی جی اگر آپ کو فرصت ہو تو مَیں آپ کی خوبصورت صحبت حاصل کر سکتا ہوں" اُس نے رما سے کہا۔

جواب میں رما صرف لجا کر رہ گئی۔

"میرے خیال سے آپ کو آج دہلی کی سیر نہ کروائی جائے۔"

"ارے کیوں نہیں بیٹا! ضرور ضرور" ـــــ مسز سہائے نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا۔ اُن کے لیے تو یہ بڑا ہی نیک شگون تھا اگر اُن کا دھرم پُتر اُن کی پُتری کو پسند کرنے لگے۔

"اس سے پہلے کہ اور کسی کو خبر ہو۔ میرے خیال سے ہمیں نکل جانا چاہیئے۔ کیوں؟"

"ہاں ہاں۔ جاؤ بیٹا" مسز سہائے نے شرماتی لجاتی رما سے کہا۔ اور خود کمرے سے نکل گئیں۔

"مَیں ذرا کپڑے تو بدل لوں۔" رما نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔

"ارے ارے یہ غضب نہ ڈھانا۔ مَیں تو پہلے ہی ـــــ" فقرہ نامکمل چھوڑ کر وہ...

اور رما ایک مرتبہ پھر شرم سے دوہری ہو گئی۔

○

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں ایک ٹیکسی میں "کرول باغ" کی طرف جا رہے تھے۔

اس وقت وہی ساڑھی پہن رکھی تھی جو خان اُس کے لیے خاص طور سے خرید کر لایا تھا۔ جب ساڑھی پہن کر وہ باہر نکلی تو خان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا: "کیا زمین کا کوئی باسی اتنا حسین بھی ہو سکتا ہے؟" اُس نے سوچا اور رما کی طرف دیکھتا ہی رہ گیا ـــــ اس بُری طرح یہ لڑکی اُس کے ذہن پر چھا رہی تھی کہ وہ خود کو اُس کا کوئی "معمول" جاننے لگا تھا۔

کرول باغ پہنچنے تک خان پر ایک بے خودی کی کیفیت طاری رہی اور اسی کیفیت کے زیر اثر وہ رما سے دُنیا بھر کی باتیں کرتا رہا۔ اُس نے اپنے سکول اور کالج کے زمانے میں شاعری کو کبھی چھُوا تک نہیں تھا لیکن آج جیسے اُسے میر اور غالب کے تمام دیوان زبانی یاد ہو گئے تھے۔ اُس نے سوچا غزل واقعی اتنی خوبصورت ہی ہوتی ہوگی۔

"کیا دیکھ رہے ہیں آپ اِس طرح؟" ـــــ اُس کی محویت نے رما کو بھی چونکا دیا۔

"تمہاری آنکھوں میں جیتی جاگتی زندگی دیکھ کر سوچتا ہوں رما: کہ کیا یہ ہی وہ آنکھیں ہیں۔ جنہیں دیکھ کر کبھی شاعر نے ان میں ڈوب کر مر جانے کی آرزو کی تھی ـــــ؟ سچ رما واقعی ان آنکھوں میں ڈوبنے کے بعد زندگی بے معنی سی شے بن کر رہ جاتی ہے۔"

رما کو تو جیسے سکتہ ہو گیا تھا اُس کے کان کی لوئیں سرخ ہو رہی تھیں کیونکہ اُس نے ٹیکسی ڈرائیور کو اپنے سامنے لگے شیشے میں مسکراتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ شاید وہ اِن دونوں کی باتیں بڑے غور سے سُنتا آیا تھا۔

"بس کیجئے!" رما نے اُس کے بازو کو چھُو کر شاید ڈرائیور کی موجودگی کا احساس دلایا تھا۔

اس سے کچھ پہلے ہی انہوں نے ٹیکسی چھوڑ دی۔ رما نے کچھ نہ پُوچھا اور اُس کے ساتھ چل دی۔

"کمال ہے بھئی کم از کم یہ تو پوچھ لو ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

"کیوں؟ کیوں پوچھوں! کمار جی! جب آپ پر وشواس کر ہی لیا تو مَیں اپنے من

میں آپ کے متعلق کوئی شک شبہہ کیوں رکھوں پھر آپ ہی تو ایک ہیں جو میرے جیون میں آئے۔ اِس خالی خالی زندگی میں کتنا خلا تھا آپ کے بغیر! آپ نہیں جانتے میں نے کتنی تپیا کی تھی آپ کے لیے! آپ جیسے کسی کے لیے! اب میری تپیا سپھل ہوئی ہے تو میں کچھ سوچنے کے لائق رہی ہی نہیں۔"

جتنے اعتماد سے رُما یہ بات کر رہی تھی۔ اُس نے خان کو بوکھلا کر ہی رکھ دیا تھا!
"یہ مذاق اتنا سنگین بھی ہو سکتا تھا؟" اُس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ اپنی طرف سے تو وہ چہل قدمی اور تنہائی کا جواز پیدا کرنے کے لیے ہی رُما کو لایا تھا اور اب اُس کے ساتھ باتیں کرتا دونوں اطراف پھیلی کوٹھیوں کی قطار پر نظریں ڈالتا چلا جا رہا تھا۔

دونوں باغ کے ایک تاریک کونے میں گھنٹوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ رات خاصی گہری ہو چلی تھی جب وہ گھر واپس پہنچے۔



اُس رات کافی دیر تک وہ جاگتا رہا۔

اِس مُلک میں تھوڑے دن گزارنے کے بعد ہی اُسے اپنی کمزوریوں کا شدت سے احساس ہونے لگا تھا اُس نے محسوس کیا، کہ اِن لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف اتنی نفرت پائی جاتی ہے کہ پنجابی ہندی کو اور ہندی گجراتی کو برداشت نہیں کرتا لیکن مسلم دشمنی میں سب ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر تھے۔

مسلمانوں کے خلاف بھارت کے ہر صوبے میں نفرت پائی جاتی تھی—— پاکستان تو یہ لوگ روئے زمین پر وجود بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اِن حالات میں اُس کی ذمہ داریاں کچھ اور بڑھ گئی تھیں۔

اُسے بتایا گیا تھا، کہ مسٹر ملہوترا کی یہ عادت تھی وہ دن کو ہونے والی کسی میٹنگ کے کاغذات کا مطالعہ ہمیشہ رات کو اپنے گھر پہ جا کر کیا کرتا تھا۔ اُس کا گھر بھی ایک

انٹیلی جنس کا خفیہ دفتر تھا۔ اِس معاملے میں بھارتی یورپ کی تقلید کر رہے تھے اور مصروفیت کی آڑ میں ہی زیادہ تر کام کیا جا رہا تھا۔

خان نے ملہوترہ کا بریف کیس بہر صورت اُڑانا تھا کیونکہ اِس میں اُس اہم نوعیت کی میٹنگ کی تمام کارروائی درج تھی جو بھارت میں پاکستان کے خلاف پکنے والی کھچڑی پر مشتمل تھی—— بھارت کو پاکستان توڑنے کا دیرینہ خواب پُورا ہوتا نظر آ رہا تھا۔

تاریخ تیزی سے اپنی سمت بدل رہی تھی۔ ایک اَن دیکھی تباہی پاکستان پر مسلط ہو رہی تھی اور اربابِ بست وکشاد آنکھیں بند کیے چین کی بنسری بجا رہے تھے۔

اگلے روز——!

علی الصباح جب اُس کی آنکھ کھلی تو گھر کے نزدیکی مندر کے سپیکر گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے۔ ساتھ والے کمرے سے اُسے ہلکی ہلکی بڑبڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ مسز سہائے کوئی اشلوک پڑھ رہی تھیں۔ پھر اُسے اپنے کمرے کی طرف آتے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اُس نے دوبارہ آنکھیں موند لیں۔

اگلے ہی لمحے دروازہ کھلا اور مسز سہائے اندر چلی آئی۔ اُس نے خان کے سرہانے کھڑے ہو کر اُنہی اشلوک کا جاپ کرنا شروع کر دیا پھر اُس پہ پھونک مار کر واپس لوٹ گئی۔ وہ دل ہی دل میں مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ خدا جانے مسز سہائے نے کیا پڑھ کر اُس پر پھونکا تھا لیکن یہ اندازہ اُس نے پہلے ہی روز لگا لیا تھا کہ ماں کا رشتہ خواہ اِس کی بنیاد کتنی ہی کمزور کیوں نہ رہی ہو بہت نازک بھی ہوتا ہے اور بہت پائیدار بھی۔

ناشتہ سب نے اکٹھا کیا۔ یہ بظاہر مذہبی قسم کا گھرانہ تھا اور خان کو بھی بادلِ نخواستہ ان کے ساتھ پاٹھ میں شرکت کرنا پڑی۔ رُما کے ساتھ ہی وہ باہر آیا تھا۔ اُس نے رُما کو خدا حافظ کر کے پھر اپنے کام سے آگے جانا تھا۔

دونوں کالونی سے ابھی چند قدم دُور ہی گئے تھے کہ اچانک ہی رُما ٹھٹھک کر رُک

گئی۔ اُس کی نظریں سامنے ایک رکشہ سے اُترتی لڑکی پر جمی تھیں۔ شاید اُس نے ابھی تک رَما کو نہیں دیکھا تھا۔ رکشہ والے کو کرایہ دے کر جوں ہی وہ دوسری طرف گھومی اُس کی نظر رَما پر پڑی اور وہ دیوانہ وار دوڑتی ہوئی اُس کی طرف آئی۔ رَما نے بھی اُسے دیکھتے ہی اپنی باہیں پھیلا دی تھیں۔

"ہائے موٹی" اُس نے نعرہ بلند کیا اور "موٹی" رَما کے بازوؤں میں سمٹ گئی۔ دونوں خاصی بے تکلفی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔

"اِن سے ملئے مس رجنی۔ میری بچپن کی سہیلی۔ اِسے بڑا شوق ہے جاسوس بننے کا ——" رَما کے اندازِ تعارف میں جو بے ساختگی آ گئی تھی اُس نے خان کو محظوظ کیا لیکن وہ آخری فقرے پر چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

"مجھے اروِن کمار کہتے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ بائی دی وے آپ کرتی کیا ہیں؟" اُس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر اپنا تعارف کروایا۔

"ارے میں بتاتی ہوں۔ یہ کہاں بتائے گی۔" رَما بیچ میں ٹپک پڑی۔

"ارے بابا یہ شریمتی جی سیکورٹی آفیسر بننے والی ہیں۔ ٹریننگ ہو رہی ہے اِن کی۔ ساری چربی اُتار دی کمبختوں نے تین ماہ میں۔"

"رَما پلیز۔ کچھ مجھے بھی بولنے دو ناں!" رجنی نے رَما کو ٹوکا اور پھر آنکھوں میں لا کر خان سے مخاطب ہوئی۔ "میرا علم تو آپ کو ہو ہی گیا۔ اب آپ بھی اپنا تعارف کرا دیجئے ناں مہاراج! آپ کو پہلے کبھی دیکھا نہیں۔"

"بس یہی کمی ہے تم لوگوں میں۔ ذرا کسی کو دیکھ لیا اور رگِ جاسوسی پھڑک گئی۔ ارے یہ ہمارے فیملی فرینڈ ہیں" رَما بولی۔ "پپّا کے ایک دوست کے بیٹے ہیں۔ اب ہمارے پاس ہی رہا کریں گے۔"

"اچھا تو یوں کہو ناں کہ ......" رجنی نے فقرہ اُدھورا چھوڑ کر بڑے معنی خیز انداز

میں اُس کی طرف آنکھ دبا کر دیکھا۔

"شام کو ملیں گے اَب میں کالج جا رہی ہوں" —— رَما بُری طرح گڑبڑا گئی تھی۔ اور اس سے پہلے کہ رجنی کچھ بولے وہ اروِن کمار کا ہاتھ پکڑ کر "بائی بائی" کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

"بڑی شرارتی ہے کمبخت۔ کیا مجال جو اِسے ذرا بھی شرم آتی ہو کسی بات پر۔" رَما نے شاید اپنی خجالت مٹانے کو کہا۔

"ویسے کیا شوق چرایا ہے اِسے۔ اچھی خاصی لڑکی ہے یہ کدھر نکل گئی۔" خان نے اُسے کُریدا۔

"اِسے بچپن ہی سے سیکورٹی میں جانے کا شوق تھا۔ جاسوسی ناول پڑھ پڑھ کر دماغ خراب ہو گیا ہے۔ تین چار ماہ پہلے ایک اشتہار عورتوں کے لیے چھپا تھا۔ درخواست دی اور معلوم ہوا ہے کہ ہماری بھارتی انٹیلی جنس "را" میں بھرتی ہو چکی ہیں۔ آج کل ٹریننگ کر رہی ہے۔ جلد ہی اس کی پوسٹنگ ہو جائے گی۔"

"ہرے ہرے! مجھے تو ایسی غیر رومانٹک سی لڑکیاں ایک دم زہر لگتی ہیں۔ لڑکی اور پولیس کی نوکری۔ واہ!" خان نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ لیکن اِس کے دماغ میں کئی اندیشات نے یک دم سر اُٹھانا شروع کر دیا تھا۔

"یہ لڑکی اگر رَما کی اتنی گہری دوست ہے تو ضرور اُس کا آنا جانا بھی اُن کے ہاں رہتا ہو گا۔ کہیں کمبخت اِس کی ٹوہ میں ہی نہ لگ جائے۔"

وہ جانتا تھا کہ کسی بھی خفیہ سروس سے متعلق مرد یا عورت میں تجسّس کی عادت ضرور ہو جاتی ہے۔ یوں بھی دوسروں کے متعلق جاننا انسانی فطرت ہے۔ لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی تھا۔ اگر وہ اِس بات کا یقین رجنی کو دلا دیتا کہ وہ کوئی غیر معمولی شخص نہیں تو اِس دوستی کی آڑ میں وہ اِس قیمتی ہیرے سے بہت زیادہ فائدہ بھی اٹھا سکتا تھا۔

"کہاں کھو گئے آپ؟" رُما نے اُسے خاموش دیکھ کر چھیڑا۔

"کہیں نہیں۔ سوچتا ہوں کہ میرا نصیبا ایسا شاندار کب رہا ہوگا جو تم جیسی......"

"بس بس جانے دیجئے" رُما نے ایک قریب سے گزرتے رکشہ کو اشارہ کیا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہی دونوں ایک رکشہ میں رُما کے کالج کی طرف جا رہے تھے۔

اِس دوران خان نے گو کہ خود پر خاصی رومانیت طاری کر لی تھی لیکن اُس کا ذہن ابھی تک مدجنی میں اٹکا ہوا تھا اُس نے رکشہ ہی میں رُما کو بتایا تھا شاید اُسے کسی کام سے میرٹھ جانا پڑے اگر وہ رات تک گھر نہ پہنچا تو تشویش نہیں کرنی۔



رُما کو اُس کے کالج کے سامنے اُتار کر وہ خود بھی تھوڑی دُور جا کر رکشہ سے اُتر گیا اب اُسے نئی دہلی کی طرف جانے والی بس کا انتظار تھا جو جلد ہی اُسے مل گئی۔

"ریسرچ سنٹر" کے نزدیک ہی ایک سٹاپ پر وہ اُتر گیا۔ آج اُس کا حلیہ بالکل سرکاری ملازموں والا تھا۔ ریسرچ سنٹر کے نزدیک اُس نے تین ایسے مقامات تاک لیے تھے جہاں سے وہ اس عمارت پر اچھی طرح نظر رکھ سکتا تھا۔

سامنے سڑک پار عمارت کے دروازے سے ذرا ہٹ کر ایک چھوٹا سا چائے کا ہوٹل بنا ہوا تھا جہاں عموماً اِن دفاتر کے ملازمین ہی آتے جاتے تھے۔ یہ ہوٹل عموماً گاہکوں سے بھرا ہی رہتا تھا۔ اگر دفاتر کے ملازمین نہ ہوتے تو اُن کے "گاہک" یہاں موجود رہتے تھے اس علاقے میں زیادہ تر دفاتر جان بوجھ کر ایسے رکھے گئے تھے جن سے صرف سرکاری ملازمین ہی کو واسطہ پڑتا تھا۔ اِس طرح یہاں عام سویلین کو آنے کا کم ہی موقع ملتا تھا۔ زیادہ تر لوگ وہی یہاں آتے تھے جو ایک طرح سے سرکاری ملازمین تھے یا پھر یہاں کے ملازمین کے رشتہ دار وغیرہ۔

یہاں پہنچنے سے پہلے خان نے ایک شاندار کورسٹوری اپنے ذہن میں تیار کر رکھی تھی

وہ ایک سرکاری ملازم تھا اور اپنا تبادلہ رُکوانے کے چکر میں اِس طرف آیا تھا"

ہوٹل کی ایک میز پر بیٹھ کر اُس نے چائے کے لیے آرڈر دیا۔ اُس کی آنکھوں کے بالکل سامنے ریسرچ سنٹر کا دروازہ نظر آرہا تھا۔ جس میں کاروں کی آمدورفت آج معمول سے کچھ زیادہ ہی تھی۔

اُس کا دل یہاں سے اُٹھ کر کہیں جانے کو نہیں چاہ رہا تھا لیکن بہت زیادہ دیر تک یہاں ایک ہی جگہ بیٹھ کر وہ کسی کو شک میں مبتلا کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اُس نے کسی مطلوبہ ساتھی" کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں تو جلد ہی گوہر مقصود ہاتھ آگیا جب ایک ڈھلتی عمر کا اور گنجا ہندو اُس کے سامنے والی کرسی پر آکر براجمان ہوگیا۔

"شما کیجئے"۔۔۔ اُس نے بظاہر اپنے پڑھے لکھے ہونے کا ثبوت دیا۔

"کوئی بات نہیں مہاراج جی!" خان نے بڑے اداس سے لہجے میں کہا۔

"آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں" لالہ نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا اور خان واقعی پریشان نظر آنے لگا۔

"مہاراج جی بات ہی کچھ ایسی ہے"

"فرمائیے شاید میں آپ کے کسی کام آسکوں" گنجے لالہ نے بڑی مکاری سے دانت نکال دیئے۔

تھوڑی دیر بعد ہی دونوں باہم شیر و شکر ہو چکے تھے۔ خان نے اُسے بتایا تھا کہ اُس کا سالا راجستھان میں کہیں سیکورٹی کا حوالدار ہے اور اُس کا تبادلہ دہلی میں ہو رہا ہے وہ تبادلہ رکوانے کے چکر میں اِدھر آیا تھا۔ گنجے ہندو نے اُسے یقین دلا دیا تھا کہ دُنیا میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کا حل اُس کے پاس موجود نہ ہو۔ اِس دوران وہ مزے لے لے کر خان کو اپنے کارنامے سُناتا رہا اور خان ریسرچ سنٹر کے گیٹ پر نظریں جمائے

سُنتا رہا۔

لالہ نے اُسے کل اِسی جگہ ملنے کو کہا تھا اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ پانچ سو روپے میں ہی کام ہو جائے گا۔ دوپہر کا کھانا بھی اُس نے خان کی گرہ ہی سے کھایا ــــ اور اَب وہ کل ملنے کا وعدہ کر کے واپس جا رہا تھا۔

لالہ کی معیت میں اُس کا وقت خوب کٹ رہا تھا۔ اُس کی روانگی کے بعد وہ خود بھی وہاں سے اُٹھنے کے لیے پَر تول ہی رہا تھا جب اچانک ہی وہ ٹھٹھک کر رک گیا۔ اُس نے سیاہ رنگ کی مرسڈیز کو گیٹ سے برآمد ہوتے دیکھا تھا جس میں ملہوترہ کی موجودگی ضروری تھی۔ شاید وہ اِس اہم میٹنگ سے فارغ ہو کر اب گھر جا رہا تھا یا پھر سرکاری کام سے۔

خان نے فوراً بل ادا کیا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اُس کے قدم بڑی تیزی سے نزدیکی ٹیکسی سٹینڈ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ مرسڈیز بڑی آہستہ رفتار سے چل رہی تھی۔ شاید ٹریفک کی وجہ سے یا پھر یہاں لبنی سڑکوں پر کار کم رفتار سے چلانے کا قانون تھا! اُس کی نظریں سڑک پر رنگین سیاہ مرسڈیز پر لگی تھیں اور قدم تیز رفتاری سے سٹینڈ کی طرف لپک رہے تھے۔

جیسے ہی کار نے پہلی گلی کا موڑ مُڑنا چاہا اچانک ایک زوردار دھماکہ ہُوا: گلی میں سے برآمد ہوتی ایک تیز رفتار جیپ ملہوترا کی گاڑی سے ٹکرا گئی تھی۔ ڈرائیور اِس اچانک اُفتاد سے بوکھلا گیا اور گاڑی اس کے کنٹرول سے نکل کر سامنے والی دیوار سے جا ٹکرائی۔ ابھی چھٹی نہیں ہوئی تھی اِس لیے یہاں کچھ زیادہ رش نہیں تھا۔ سامنے والی جیپ گاڑی کے بالکل اُوپر چڑھ آئی تھی۔ ڈرائیور کے زندہ بچ رہنے کا امکان بظاہر کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔

اُسی لمحے خان کا خضر صورت انسٹرکٹر اُس کے سامنے کھڑا تھا اور ٹریننگ سکول کی کلاس روم میں وہ دونوں مصروف گفتگو تھے ــــ "بسا اوقات قدرت انسان کی مدد کرتی

ہے بچّہ! اور بہترین جاسوس وہ ہے جو کسی بھی کمزور لمحے سے فائدہ اُٹھائے۔ فوراً ـ ورنہ یاد رکھو خوش قسمتی تمہارے نزدیک سے دبے پاؤں گزر جائے گی اور تم مُنہ دیکھتے رہ جاؤ گے۔"

بجلی کے کوندے کی طرح ایک خیال اُس کے ذہن میں لپکا وہ محض چند سیکنڈ میں جائے حادثہ پر پہنچ چکا تھا۔

"بچاؤ! بچاؤ" ــــ وہ چلّایا۔

اُس کی نظریں پچھلی سیٹ پر بیہوش ہوئے کرنل ملہوترا پر جمی تھیں۔ جس کے پہلو سے ایک بریف کیس لگا ہوا تھا۔

دروازہ کھولنے کے لیے اُسے بڑی زور آزمائی کرنی پڑی تھی کیونکہ اچانک لگنے والے جھٹکے نے شاید دروازے کو لاک کر دیا تھا۔ اُس کے بریف کیس باہر نکالنے تک وہاں تین چار اور آدمی بھی پہنچ چکے تھے خان نے بریف کیس اِس انداز سے پکڑ رکھا تھا جیسے وہی اِس کا مالک ہو۔

لوگوں کا ایک ہجوم وہاں اکٹھا ہونے لگا تھا۔ پھر لوگ تو ملہوترا کے بیہوش جسم کو کھینچ کر باہر نکالنے لگے۔ خان اُنہیں مصروفِ کار چھوڑ کر آگے نکل گیا۔



تین چار گلیاں گھومنے کے بعد بالآخر وہ ایک ٹیکسی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گیا۔ اِس ٹیکسی کے بعد اُس نے اپنے پہلے سے مقرّر کردہ ٹھکانے تک پہنچنے کے لیے تین اور گاڑیاں بدلی تھیں۔ یہ کرشمہ قدرت تھا۔ یا پھر تائیدِ غیبی کہ اس طرح اچانک ہی اُس کا مقصود پکے ہوئے پھل کی طرح اس کی جھولی میں آن گرا تھا۔ اِس طرح اچانک ہونے والی کامیابی پر احساسِ تشکر سے اُس کا دل بھر آیا تھا۔ اُسے آج یقین ہو چلا تھا کہ اللہ کے راستے پر چلنے والے کبھی تنہا نہیں ہوتے۔

"آرزو" نام کے اِس دوسرے درجے کے ہوٹل کو اُس نے اگلے ہی روز اِس مقصد کے لیے تاڑا تھا۔ کاؤنٹر پر دو روز کا کرایہ جمع کروا کر اُس نے ایک کمرے کا رُخ کیا اور تھوڑی ہی دیر بعد وہ اپنی جیب میں موجود ایک چابیوں کے گُچھے کی مدد سے بریف کیس کھولنے میں کامیاب ہو چکا تھا۔

اِس بریف کیس میں ٹائپ شدہ کاغذات کا ایک پلندہ رکھا تھا۔ یہ اِس میٹنگ کی شاید مکمل کارروائی تھی جو آج ہی وہاں انجام پائی تھی اور اُسے پڑھ کر اپنی خصوصی رپورٹ تیار کرنے کے لیے ملہوترا اُسے گھر لے جا رہا تھا۔

خان نے ایک سرسری نظر کاغذات پر ڈالی۔ ہر ٹائپ شدہ کاغذ کے کونے پر "ٹاپ سیکرٹ" کی سُرخ مُہر لگی تھی۔ اُس کی نظریں ایک پیرہ گراف پر اٹک کر رہ گئیں:

بھارت میں بننے والی تازہ انٹیلی جنس ایجنسی "را" کی طرف سے مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے الگ کرنے کی سازش کی تفصیلات لکھی گئی تھیں۔ یہ ایک منصوبہ تھا جس پر بھارت سرکار ایک لمبی مدت سے عمل پیرا تھی۔ اب اِس منصوبے کے اثرات ظاہر ہونے لگے تھے اور اِس میٹنگ میں یہ طے پایا تھا کہ مشرقی پاکستان کو "بنگلہ دیش" بنانے کی گھناؤنی سازش کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہاں "مُکتی باہنی" کے نام سے مقامی غدّاروں کی مدد سے ایک باقاعدہ فوج تشکیل دی جائے اور پاکستانی فوج کے خلاف عَلمِ بغاوت بلند کر دیا جائے۔

جوں جوں وہ پڑھتا جا رہا تھا اُس کی آنکھیں پھیلتی چلی جا رہی تھیں۔ دشمن اتنی کمینگی پر بھی اُتر سکتا ہے؟ اُس نے سوچا اور حیران رہ گیا کہ بھارت کس ڈھٹائی سے اپنے پُرامن ہونے کا پروپیگنڈہ کر رہا تھا حالانکہ اصلیت کچھ اور تھی۔ تصویر کا دوسرا رُخ اُس کے تصوّر سے بھی زیادہ بھیانک تھا؟ اُس کا جی چاہتا تھا اُڑ کر ان کاغذات سمیت وطن پہنچ جائے اور اپنے لوگوں کو چیخ چیخ کر بتا دے: "کہ دشمن قیامت کی چال چلنے والا ہے" لیکن ہر کھیل کے اپنے کچھ اصول ہوتے ہیں۔

جاسوسی جذبات کا کھیل نہیں تھا! اِسے عقل سے زیادہ اور دِل سے کم کام لینا تھا۔ بریف کیس سے کاغذ نکال کر اُس نے تہہ کر کے یہ اِس طرح اپنے کپڑوں میں محفوظ کر لیے تھے کہ اب وہ اُس کے جسم ہی کا کوئی حصّہ بن کر رہ گئے —— بریف کیس ہاتھ میں اُٹھائے وہ باہر نِکل آیا۔ کمرے کو تالا لگا کر اُس نے چابی کاؤنٹر پر جمع کروا دی تھی۔ اُس کا رُخ اب اس ہوٹل کی پُشت پر کچھ فاصلے پر موجود اُس برساتی نالے کی طرف تھا جہاں برسات کے دِنوں کے علاوہ بھی ہر وقت پانی جمع رہتا تھا۔ نالے پر جا بجا لکڑی کے پُل بنائے گئے تھے۔

ایک قدرے ویران پُل سے گزرتے ہوئے اُس نے اِس بریف کیس کو جس میں اب کاغذات کے بجائے پتھر بھرے ہوئے تھے۔ نالے میں پھینک دیا اور خود پیدل چلتا نالہ عبور کر کے دوسری طرف پہنچ گیا۔

بازاروں میں زیادہ گھومنا اُس نے مناسب نہ سمجھا اُس کا رُخ ایک سرکاری ٹیلی فون آفس کی طرف تھا۔ جہاں ایک کلرک کے ہاتھ میں پانچ روپے کا نوٹ رکھتے ہوئے اُس نے زار و قطار رو کر کلرک سے التجا کی کہ وہ اِس سے ڈبل فیس لے کر کھٹمنڈو کا ایک ٹیلی فون نمبر ملا دے اُس نے اپنے "جیجا جی" کو "دیدی" کی "مرتیو" کی خبر دینی ہے۔

کچھ تو اُس کے آنسوؤں ہی سے بے چارے کلرک بابو کا دل پسیج گیا اور رہی سہی پانچ کے نوٹ نے پوری کر دی۔ کلرک نے اگلے کلرک سے بات کی اور سرکاری فیس سے ...وں روپے زیادہ ادا کرنے کے عوض بمشکل پندرہ بیس منٹ بعد ہی وہ نیپال کے دارالحکومت کھٹمنڈو میں اپنے "جیجا جی" سے گفتگو کر رہا تھا۔ اُس نے روتے ہوئے جیجا جی کو "دیدی" کی "مرتیو" کی اطلاع دی اور اپنے ہوٹل کا ایڈریس بھی بتا دیا۔

دوسری طرف سے اُس کے "جیجا جی" نے اظہارِ افسوس کرتے ہوئے اُسے آج رات کے آخری شو پر ریالٹو سینما میں ملاقات کا وقت دے دیا۔ مختصر سی گفتگو کے بعد سلسلہ

منقطع ہو گیا۔

خان ہوٹل واپس آ گیا ——!

آخری شو تک کا وقت اُس نے ہوٹل کے کمرے ہی میں گزارا۔ بازار سے ایک پولی تھین کا تھیلا خرید کر اُس نے کاغذات کو بڑے سلیقے سے اُس میں پیک کیا اور آخری شو شروع ہونے سے کچھ ہی دیر پہلے ریالٹو سینما میں پہنچ گیا۔

مقررہ وقت پر اچانک ہی ایک کونے سے گیان سنگھ نمودار ہوا۔ کیونکہ چند روز پہلے ہی دونوں کی ملاقات ہوئی تھی۔ پھر یہ ملاقات بھی تو اُس کے ذہن پر نقش ہو چکی تھی اُسے ایک مخصوص اشارہ کرتے ہوئے گیان سنگھ آگے نکل گیا۔ اُس کا رُخ ٹکٹ کرنے والی کھڑکی کی طرف تھا۔ فلم کوئی خاص رش نہیں لے رہی تھی۔ شاید کوئی پرانی فلم تھی۔ خان نے تو اُس کا نام پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی۔ جیسے ہی گیان سنگھ ٹکٹ لے کر سیڑھیوں کی طرف بڑھا خان اُس کے تعاقب میں لپکا۔

تھوڑی دیر بعد دونوں ایک باکس میں جو صرف دو سیٹوں پر مشتمل تھا بیٹھے دونوں نے ابھی تک رسماً ایک دوسرے کی خیریت دریافت کرنے کے علاوہ اور کوئی بات نہیں کی تھی۔

"میرا خیال ہے تم اپنی امانت اب لے ہی جاؤ"۔ خان نے فلم شروع ہونے کے بمشکل دس منٹ بعد ہی کہا۔

"ہاں ہاں"—— گیان سنگھ شاید کسی اور دُنیا میں پہنچ چکا تھا۔

خان نے پولی تھین لفافے میں لپٹے کاغذات اُسے تھما دیئے! اس میں اس کا پیغام بھی شامل تھا۔ اُسے علم تھا: "اگلے روز تک بہر صورت یہ کاغذات اُس کے ملک پہنچ جائیں گے۔

گیان سنگھ نے کاغذات وصول کرنے کے بعد جلد ہی اُنہیں اپنے جسم کا حصہ بنا لیا

چند منٹ مزید اُس کے ساتھ گزارنے کے بعد اُس نے خان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ یہ اُس کی روانگی کا اشارہ تھا۔ خان نے اپنا دایاں ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

"فی امان اللہ"—— گیان سنگھ نے اُس کے کان میں سرگوشی کی اور دبے قدموں باہر نکل آیا۔

"فی امان اللہ"—— خان نے بھی خدا سے اُس کی سلامتی کی دُعا کی۔ اُس نے پلٹ کر بھی اُدھر نہیں دیکھا تھا۔

...کے لیے تیار نہیں ہو گا۔

یوں بھی خان نے احتیاطاً سہائے اور اُس کے گھر والوں کو اپنے متعلق استفسار کرنے والوں کو مطمئن کرنے کے لیے جو کہانی بتائی تھی اُن لوگوں کے لیے سوائے اِس کے کوئی چارہ ہی نہیں رہ گیا تھا کہ وہ یہی کہانی ہر کسی کو سناتے ورنہ اُن سے متعلق بھی تو بڑی گھٹیا قسم کی افواہیں لوگ پھیلا سکتے تھے۔



"ہیلو!" خان اچانک ہی رجنی کے سامنے آ گیا تھا۔

"ارے آپ! مہاشے جی آپ کہاں سرگشت کر رہے ہیں، میں تو آپ ہی کے درشن کو آئی تھی۔"

"ہائے ری قسمت! تو نے بھی مجھے آج ہی گھر سے غائب کرنا تھا۔" خان کی بات پر ... بے ساختہ قہقہہ لگایا۔

"نہیں مہاشے جی! ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ابھی میں آٹھ روز یہیں ہوں۔ آپ کو ... کیا کروں گی ــــ اور یوں بھی میں رما کی ایک ہی بچپن کی دوست ہوں ادھر ہم ... میں اتنی دوستی ہے کہ ہم ہر چیز بانٹ کر کھاتی ہیں۔"

رجنی صرف بیباک سی ہندو لڑکی ہی نہیں تھی پولیس کی تربیت یافتہ بھی تھی اور ... خان کو ایسے ہی کسی جواب کی توقع تھی۔

"تب تو مجھے اُمید کرنی چاہیئے کہ آپ کی روانگی تک ارون کمار نام کا ایک شخص ... میں موجود نہیں ہو گا۔"

"بھگوان نہ کرے۔ اچھا آ گیا دیکھیے! ہمیں کسی نے چھُپ کر دیکھ لیا تو بدنام ہو جائیں ..." ... نے قہقہہ لگایا۔ خان کے آگے بڑھے ہاتھ پر زور سے ہاتھ مار کر اور "ہائے" کہتی ہوئی وہ آگے بڑھ گئی۔

دھنک کے ساتوں رنگ

گیان سنگھ کی روانگی کے بمشکل پندرہ منٹ بعد وہ بھی اسی طرح باہر نکل آیا اور سینما سے قریباً دو اڑھائی میل دُور جا کر اُس نے گھر جانے کے لیے رکشہ پکڑا۔

ہوٹل میں اب اِس کا کوئی کام باقی نہیں رہا تھا۔ احتیاطاً اُس نے ایک ٹیلی فون بوتھ سے ہوٹل فون کر دیا: "کہ آج رات کسی کام سے باہر جا رہا ہے اِس لیے نہیں آ سکے گا ... نے کاؤنٹر کو بھی بتا دیا تھا کہ اگر اُس کے متعلق کوئی فون وغیرہ آئے تو وہ نوٹ کر لیا ... وہ نہیں چاہتا تھا کہ افراتفری میں کوئی بھی مشتبہ قدم اٹھائے۔ ہوٹل کو فون کرنے کے دس پندرہ منٹ بعد اُس نے احتیاطاً آواز بدل کر اپنے لیے کسی مدن لال کی طرف سے ایک تجارتی سا پیغام بھی لکھوا دیا تھا۔

رکشہ اُس نے حسبِ سابق گھر سے دو تین فرلانگ دُور ہی چھوڑ دیا تھا اور اب ... گھر کی طرف جا رہا تھا۔

عین اُن لمحات میں جب وہ گھر داخل ہو رہا تھا اُس نے رجنی کو گیٹ سے باہر ... ہوتے دیکھا ــــ یہ اُس کے لیے کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ رجنی ... نہ بھی آنا ہوتا تو بھی وہ اُس کے متعلق جاننے کے لیے ضرور آتی۔ لیکن اُس کے ساتھ ... اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ جگن ناتھ سہائے کوئی بچہ نہیں، منجھا ہوا ریٹائرڈ سرکاری ملازم ... اور یہ بھی: "کہ وہ خان جیسی سونے کی چڑیا کے متعلق کسی کو غلط لائن پر سوچنے کا موقع ...

گھنٹی بجانے پر کشور دروازہ کھولنے باہر آگیا اور اُس کے تعاقب میں آشا بھی چلی آئی :

"ہائے بھیا" ___ دونوں نے اُسے دیکھتے ہی نعرہ لگایا۔

"مَیں نے تو ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔ میرا من کہتا تھا آپ ضرور آئیں گے۔ اس موٹی نے کھالیا" کشور نے آشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے نمبر بنائے۔

خان مسکراتا ہوا اندر چلا گیا۔ گھر کے باقی لوگ ٹی۔وی کے سامنے بیٹھے تھے۔ اپنے دونوں بچوں سمیت آئی ہوئی تھی کیونکہ اگلے روز اتوار کی چھٹی تھی اور وہ سب یہ وقت ہل جُل کر ارون کُمار جی کے ساتھ بسر کرنا چاہتے تھے۔

"کہاں چلے گئے تھے بیٹا! اتنی دیر" ___ مسز سہائے نے اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا۔

"ماتا جی! بات یہ ہے کہ مجھے دراصل آپ کا یہاں رہنا اچھا نہیں لگتا۔ ار جو لوگ اتنی بڑی بڑی کوٹھیوں میں رہتے ہیں وہ کوئی آسمان کی مخلوق تو نہیں۔ بس آپ دیکھ لینا چند مہینوں کی بات ہے پھر اپنا بنگلہ ہوگا، کار ہوگی اور اور...."

اور کیا ہوگا؟" رما نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے مداخلت کی ___ وہ بڑی شکایت بھری نظروں سے اُس کی طرف دیکھ رہی تھی: "جانتے ہیں رجنی نے کتنا انتظار کیا آپ کا۔ ابھی گئی ہے۔"

"سوری۔ کان پکڑتا ہوں۔ آئندہ ایسی غلطی نہیں ہوگی" خان نے باقاعدہ کان پکڑ کھانا اس نے رما اور کشور کے ساتھ کھایا۔ آج وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا اور پُرسکون محسوس کر رہا تھا۔ اس طرح اچانک قدرت نے کامیابی جو اُس کا مقدر کردی تھی۔ اس گو کہ اپنے ذہن میں ملہوترہ کے گھر میں گھُس کر بریف کیس اُڑانے کے دو تین متبادل بنا رکھے تھے لیکن قدرت کو شاید اُس پر جلد ہی رحم آگیا تھا۔

خان جانتا تھا کہ ملہوترا کا بریف کیس غائب ہونے پر بھارتی سیکورٹی کے ایوانوں آگیا ہوگا اور وہ لوگ شکاری کتوں کی طرح اُس کی بُو سونگھتے پھر رہے ہوں گے۔

اور اس بات کا احساس اُس کے علاوہ اُس کے افسران کو بھی تو تھا جو صبح اُسے امکانات سمجھنے والے تھے لیکن کس طرح؟ اس کا اُسے بھی علم نہیں تھا۔ صرف اُس نے اپنے دہلی کے "سیف ہاؤس" کی اطلاع پہنچادی تھی اور وہ جانتا تھا کہ اُس سرگرم عمل ساتھی پہلے ہی اُس کی حفاظت سے بے خبر نہیں رہے ہوں گے۔

○

جلد ہی اُس نے گھر والوں کی باتوں سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ پھر رما کے ساتھ وہ بہانے باہر نکل آیا۔

ایک سٹور سے دونوں نے بوتلیں پییں۔ یہاں سے خان نے احتیاطاً ایک اور فون کی طرف سے اپنے ہوٹل کو کردیا اور اپنے لیے پیغام بھی لکھوادیا۔

راستے میں دونوں نے زیادہ گفتگو رجنی کے متعلق ہی کی تھی۔ رما نے اُسے بتایا: "کہ بچپن کی واحد دوست ہے۔ اُس کا باپ بھی ریلوے میں آفیسر تھا۔ رجنی کچھ غنڈے اٹھا کر لے گئے تھے جنہوں نے اُس سے زیادتی کی اور پھر اپنا جرم کے لیے اُسے جان سے بھی مار ڈالا ___ رجنی اُن دنوں ہائی سکول میں پڑھتی

اُس کے اندر بڑی عجیب تبدیلی پیدا ہوگئی" رما بولی: "چُپ چاپ رہنے والی جھلاہٹ اور غصّے کا شکار رہنے لگی تھی۔ اس کے اندر لاشعوری طور پر ایک پاتا رہا اور وہ اُن غنڈوں کو مار ڈالنا چاہتی تھی جنہوں نے اُس کی معصوم ڈالا تھا! رجنی کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ صرف ایک بہن اور تھی ___ غنڈے معمولی سی سزا کے بعد جیل سے رہا ہوگئے۔"

اور اُس کی لمبی چوڑی تقریر کا خان پر کیا اثر ہوا ہے ؟ یہ ٹٹولنے کے لیے وہ بولی
"پاگل ہے۔ مَیں نے تو اسے کہا ہے کچھ بھول جاؤ لیکن نہیں بھولتی ـــــ اور
میرا من کہتا ہے کہ اُس نے یہ نوکری بھی اسی آتشِ انتقام کو ٹھنڈا کرنے کے لیے
کی ہے ورنہ تو وہ اندر سے ایک آرٹسٹ ہے۔ مکمل آرٹسٹ ـــــ"

"بہت بہادر لڑکی ہے ۔"

"ابھی سے متاثر ہونے لگے آپ اُس سے"۔ رُما مسکرائی ۔

"تم سے ملنے کے بعد کوئی کسی اور سے متاثر ہو سکتا ہے کیا ؟" خان نے
بیباکی سے اُس کی آنکھوں میں جھانکا جہاں ایک پُراسرار سی مقناطیسیت گھر کئے ہوئے
تھی ـــــ رُما کی آنکھوں میں اُسے دھنک کے سارے ہی رنگ بکھرے دکھائی دے
رہے تھے۔ واقعی اُن آنکھوں کا سحر سر چڑھ کر بولتا تھا۔



رجنی کی بہت بڑی کمزوری اُس کی سمجھ میں آ رہی تھی ـــــ اور وہ یہ بھی جان گیا
"کہ یہ لڑکی "را" کے ٹریننگ سکول میں تربیت حاصل کر رہی ہے"۔ وہ سوچنے لگا
اِس کے لیے بہت کار آمد ہو سکتی ہے ۔ اسی کے ذریعے اُسے "را" پر نقب لگانی

دونوں کافی دیر تک رجنی کے متعلق باتیں کرتے رہے ۔ خان کو بخوبی اندازہ ہو گیا
کہ رُما اس کی گہری دوست ہے اور اُس کے دُکھ کو بھی خوب محسوس کرتی ہے ۔ لیکن
اِس بات کے امکانات تو بہت کم تھے کہ رجنی خان کا ماضی جاننے کے متعلق متجسس
اُس کے ذہن میں کوئی شک سر اٹھاتا ۔ اِس کے باوجود اُس نے خطرے کے امکانات
نظر انداز نہیں کیا تھا اور کسی بھی ممکنہ خطرے سے نمٹنے کے لیے وہ ذہنی طور پر

واپسی پر جب رُما نے اُس سے اپنے مستقبل کی باتیں شروع کیں تو اُس نے
خواہش کا اظہار کیا تھا کہ پہلے وہ کم از کم ماسٹر ڈگری حاصل کر لے ۔ اس کے بعد

...الی گے ۔"

اس نے رُما کو احساس دلایا کہ وہ اُس کے ساتھ اُس کے گھر میں ہی تو رہتا ہے اور
...ادی کے بعد بھی وہ لوگ اُس کے والدین کے ساتھ ہی رہیں گے اس لیے کم از کم اُس
...کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں تھی ۔

رات حسبِ معمول دیر تک وہ آپس میں باتیں کرتے رہے ۔ باقی گھر والے تو اُن کا
...ار کرتے سو چکے تھے ۔

اگلے روز چھٹی تھی اور اُن لوگوں نے جمنا کنارے تفریح کے لیے جانا تھا ۔ یوں بھی
...نے اُس سے کہہ دیا تھا کہ اُس نے دہلی اِس سے پہلے صرف ایک مرتبہ ہی دیکھی ہے
...روگرام پہلے پایا تھا کہ وہ لوگ صبح ناشتے کے بعد روانہ ہوں گے اور شام ڈھلے گھر
...لوٹ آئیں گے ۔

صبح وہ حسبِ سابق جلدی جاگ اٹھا ۔ اُس نے گھر والوں کو پہلے ہی روز اپنی صبح کی
...عادت سے آگاہ کر دیا تھا ۔ آج بھی وہ سیر کرنے کے بہانے ہی باہر نکلا تھا ۔ یہ
...ت کہ اُس نے شب خوابی کا لباس تبدیل کر لیا تھا ۔ کافی دور تک وہ پیدل چلتا
...ا تو ایک رکشہ اُسے نظر آ ہی گیا ۔

...ر میں جب وہ ہوٹل پہنچا تو زندگی ابھی مکمل بیدار نہیں ہوئی تھی ۔ اُس نے تاثر یہی
...ا کہ ابھی ٹرین سے اُتر کر سیدھا یہاں آ رہا ہے ۔ اُسے اُمید تھی کہ اب تک "دوستوں"
...ے اُس کے نام کوئی پیغام پہنچ چکا ہوگا ۔

...ٹل کے کاؤنٹر سے اُس نے اپنے نام پیغامات موصول کیے ۔ اُس کے مہربانوں نے
...کے لیے تین چار ٹیلیفون کر رکھے تھے ۔ کسی اشوک رائے نے البتہ ایک ٹیلی فون
...ا کہ جیسے ہی وہ واپس لوٹے اُس سے اس نمبر پر رابطہ قائم کرے ۔"

...لے سکون کا سانس لیا ورنہ اگلا پیغام موصول ہونے تک ہوٹل نہ چھوڑنے پر

مجبور ہوتا۔

کاؤنٹر پر ہی اُس نے چیک آوٹ کیا اور اپنے کمرے کا ایک چکر لگا کر باہر آ گیا۔ کاؤ
کلرک سے حساب بیباق کر کے اُس نے رسید حاصل کی اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوا باہر نکل آ
جب وہ رکشہ پر بھاگم بھاگ گھر واپس پہنچا تو گھر والے ناشتے کی تیاریاں کر رہے
اُن کے علم میں لائے بغیر چُپ چاپ وہ اپنے کمرے میں پہنچا۔ ابھی تک کسی نے اُ
واپس آتے نہیں دیکھا تھا۔ دوبارہ اُس نے شبِ خوابی کا لباس پہنا اور اُنہیں "بُج
کہتا ہوا غسل خانے میں چلا گیا۔ نہا کر باہر نکلا تو اُس کی طبیعت خاصی کھِل رہی تھی۔

آج حسبِ معمول اُس نے شیو نہیں کی تھی۔ یہ بات اُسے سب سے پہلے
نے یاد دلائی۔

"بس ذرا رومانٹک نظر آنے کے چکر میں ہوں"۔ اُس نے اپنی ایک آنکھ دبا
جانتی تھی کہ زیادہ تر ہندو نوجوان لڑکوں میں چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی رکھنے کا فیشن
رہا ہے اور ارون کمار بھی آخر ایک ہندو نوجوان تھا وہ فیشن سے متاثر ہوئے
کیسے رہ سکتا تھا؟ دوسری طرف خان کے لیے اب حُلیہ بدلنا ضروری ہو گیا تھا۔

ناشتہ سب نے اکٹھے کیے۔ سوشیل اپنی ماں کے ساتھ رسوئی میں مصروف تھی
خان بازار سے پکنک پر ساتھ لے جانے کے لیے ایک دو چیزیں خریدنے کے
باہر نکل گیا۔ قریبی سٹور سے اُس نے سوشیل کے بچّوں کے لیے سویٹس اور بسکٹ
خریدے اور وہیں سے مسٹر اشوک رائے کو ٹیلی فون کیا۔ جلد ہی نمبر مل گیا اور
بھی۔

سب سے پہلے تو اُسے اتنا اہم کارنامہ انجام دینے پر مبارکباد پیش کی گئی
ہفتہ تک مکمل خاموشی اختیار کرنے اور اپنے حُلیے کو بدلنے کی سخت ہدایت کی گ
کیونکہ ایکسیڈنٹ کے بعد غائب ہونے والے بریف کیس نے بھارتی انٹیلی جنس کو

پوکن کر دیا تھا۔

خان واپس لوٹ آیا۔ کام اُس کے حسبِ منشا ہی ہو رہا تھا۔ اُس کی واپسی پر رجنی
بھی گھر پہنچ چکی تھی۔ پھر خان کے بار بار کہنے پر رجنی بھی اُن لوگوں کے ساتھ جانے کے
لیے تیار ہو گئی۔

اُس نے اِس بات کا بخوبی اندازہ لگا لیا تھا کہ رجنی سے اُس کی بے تکلفی پر رما
بالکل بُرا نہیں مانتی۔ یا تو رما کو اپنی ذات پر بے حد اعتماد تھا یا پھر خان سے اپنی محبت
پر۔ ایک بات بہرحال تھی کہ اُسے یہ لڑکی دوسری ہندو لڑکیوں سے بالکل مختلف نظر
آئی تھی۔

جمنا کے کنارے ہی ایک خوبصورت مقام اُن لوگوں نے اپنی تفریح کے لیے منتخب
کیا تھا اور بھی بہت سے لوگ پکنک منانے یہاں آئے ہوئے تھے۔ شام تک پہر اسی سے
اُس نے بظاہر اُن لوگوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں گزارا تھا لیکن اِس دوران جو سکتا ہے۔ اُن کی
لمحہ بھی وہ اپنے دماغ سے اُس ناپاک منصوبے کی تفصیلات کو نکال نہ سکا جو اُس نے اپنی
کو اُسے ملہوترا سے چھینے گئے کاغذات سے حاصل ہوا

وہ سوچ رہا تھا: کیا اُس کے معصوم بنگالی بھائی کو ہا گا۔ صوبیدار صاحب اپنے خاص
بھارت سرکار اُن پر پھینکنے جا رہی تھی؟ ن کو ایک دوسرے دفتر کا ایڈریس
اب تک اُس نے ہندوؤں کے متعلق محض پڑھ
ہوئے ـــــ ان لوگوں کو نزدیک سے دیکھنے کے بعد لبطا میں زبردستی سو روپے
"ہاں" ہی میں بلتا تھا۔ لیکن اُس کا دل اِس "ناں" کو ماننے اُس نے خان کو
وہ تو یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا: کہ اُس کے مُلک کا ایک مکمل ملک میں ہمیشہ کے
لے گا۔ اُس کی ڈھیروں
اخبارات اور دیگر ذرائع سے اُس تک جو خبریں پہنچ رہی تھیں اور

کے علم میں انٹیلی جنس کا جو ناپاک منصوبہ آچکا تھا اُس کے بعد اُسے یہ بات آخر یہ
ہوتی نظر آرہی تھی۔

اُس کا جی چاہتا تھا اُڑ کر اپنے پُوربو پاکستان چلا جائے اور اپنے بنگالی بھائیوں
کو چیخ چیخ کر بتائے کہ دشمن قیامت کی چال چل گیا ہے۔ وہ چاہتا تھا جیسے بھی ممکن ہو
اپنے سیدھے سادھے بھولے بھالے بنگالی بھائیوں کو دشمن کے چنگل میں پھنسنے سے بچا
لے ___ لیکن یہ سب کچھ سوچنا ہی اُس کے اختیار میں تھا۔ ایسا کرنا اس کے لیے ممکن
نہیں تھا : سیاست کی وہ شطرنج جو چانکیہ کے چیلے چانٹوں نے وقت کی بساط پر پھیلا
رکھی تھی اُس میں عابد خان کی حیثیت کسی معمولی سے مہرے جتنی بھی نہیں تھی۔ میدانِ سیاست
کے کھلاڑی کوئی اور تھے! اُس کے ذمّے تو صرف اتنا فرض تھا کہ وہ اپنے اربابِ بست
انتہائی کوشش کے ساتھ آنے والے طوفانوں سے وقت سے پہلے آگاہ
البتہ

جانتی تھی کہ زیادہ



رہا ہے اور ارون کمار
... لیشن لیٹر موصول ہو گیا۔ اب وہ مستند ٹھیکیدار بن چکا
کیسے رہ سکتا تھا؟ دوسری طرف
...ت خرید لایا تھا۔ اُس نے آدمی کی طرف سے متعلق
ناشتہ سب نے اکٹھے
...کے ساتھ مارکیٹ روانہ ہو گیا۔
خان بازار سے پکنک پو...
باہر نکل گیا۔ قریبی سٹور ... کر گھر پہنچے تو اُن کے پاس اِن اشیاء کے کم سے کم
خریدے اور دیا ...س موجود تھے۔ رات گئے تک وہ ٹنڈر بھرنے میں مصروف رہا
...کو ساتھ لے کر دفتر کی طرف روانہ ہو گیا۔
بھی۔
...نی کے لیے مچھر دانیوں کی سپلائی کا آرڈر تھا۔ اِس مرتبہ بھی خان متعلق
سب۔
...لے بجائے سہائے کے ساتھ اُسی چپراسی سے جا ٹکرایا جس کے ذریعے
ہفتہ تک
کیونکہ پہلے کام نکالا تھا۔

"آئیے مہاراج! آئیے مہاراج" ___ اُنہیں دیکھتے ہی چپراسی مسکرانے لگا۔

"میرے خیال سے تھوڑی دیر کے لیے چھٹی لے لو۔ اطمینان سے بات کرتے ہیں۔"
خان نے بڑی بے تکلفی سے اُس کے کندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

چپراسی نے بڑی عجیب سی نظروں سے خان کی طرف دیکھا۔ اُس نے دونوں کو اُسی ہوٹل کے کیبن میں بیٹھ کر انتظار کرنے کو کہا تھا! اِس مرتبہ بھی سہائے خاموش تماشائی بنا رہا اُسے ارون کمار کی صلاحیتوں پر اعتماد تھا اور وہ جان گیا تھا کہ اِس نوجوان میں کچھ ایسی پوشیدہ شکتی ضرور موجود ہے کہ جس کام کا یہ بیڑا اُٹھائے اُسے پورا کر لیتا ہے۔

دوپہر کے کھانے پر وہ پہنچ گیا! خان نے اِس مرتبہ بھی اُس کے لیے لمبا چوڑا آرڈر دیا تھا۔ کھانے کے دوران ہی اُس نے اپنا مدعا بیان کر دیا اور چپراسی سے درخواست کی کہ وہ متعلقہ آدمی تک جس کے ذریعے یہ آرڈر موصول ہو سکتا ہے، اُن کی رہنمائی کر دے۔ چپراسی کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں: ایسا شاندار کھانا تو اُس نے اپنی شادی پر بھی نہیں کھایا تھا۔

"ارے صاحب فکر نہ کیجئے۔ بات بھی کرا دوں گا۔ صوبیدار صاحب اپنے خاص آدمی ہیں کل صبح دس بجے آجائیے۔" اُس نے خان کو ایک دوسرے دفتر کا ایڈریس لکھاتے ہوئے کہا۔

دمِ رخصت خان نے بچّوں کی مٹھائی کے لیے اُس کی جیب میں زبردستی سو روپے ڈال دیے۔ سہائے تو اُس پر حیران ہوا جا رہا تھا۔ گھر پہنچنے تک اُس نے خان کو ان گنت بے شمار دعائیں دے ڈالی تھیں کہ اب وہ اپنا مستقبل اِس ملک میں ہمیشہ کے لیے محفوظ خیال کرنے لگا تھا۔ ماتا جی نے اس کا تازہ کارنامہ سنتے ہی اُس کی ڈھیروں بلائیں لیں۔

سوشیل شام کو واپس جا رہی تھی۔ خان نے اس حقیقت کو فراموش نہیں کیا تھا اور اس کے بچوں کے لیے کپڑے اور کھلونے ساتھ لیتا آیا تھا۔ اس گھر کا تو اب ایک ایک فرد اس کا گرویدہ تھا۔ رُما کی واپسی رجنی کے ساتھ ہوئی تھی۔

خان نے آج ایک نیا کھیل شروع کرنا تھا جس کے لیے وہ پچھلے دو روز سے خود کو ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا: اب اُسے رجنی کو اپنی گرفت میں لینا تھا۔ رجنی جیسے قیمتی ہیرے کو ہاتھ سے گنوانا اُسے ہرگز گوارہ نہیں تھا۔

رُما دونوں کو اپنے کمرے میں اکیلا چھوڑ کر تھوڑی دیر کے لیے باہر گئی تو خان نے ان لمحات کو غنیمت جان کر انہی سے فائدہ اٹھا لیا۔

"رجنی بہن!" ـــــ اُس کا اندازِ تخاطب اتنا ہمدردانہ اور لہجہ ایسا گھمبیر تھا کہ ایک مرتبہ تو رجنی بھی چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

"جی" ـــــ رجنی کے ہونٹ کپکپائے۔

"ایک بات کہوں بُرا مت مانیے گا"

"ایسی کیا بات ہے؟" رجنی ابھی تک اِس کے پہلے جملے ہی سے نہیں سنبھلی تھی۔

"میں نے آپ کو پہلے ہی روز سے دِل سے بہن بنا لیا تھا۔ ایک بنتی (درخواست) ہے میری۔ اگر آپ بُرا مت مانیں تو میں آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ یقین رکھیے مجھے آپ اپنے سگے بھائیوں سے بڑھ کر پائیں گی"

"مجھے کیا اعتراض ہو گا بھیا!" اس مرتبہ رجنی کا لہجہ بھی بڑا گھمبیر ہو گیا تھا۔ شاید بھائی کی کمی احساسِ محرومی بن کر اُس کے لہجے میں سمٹ آئی تھی۔ "لیکن رُما....!" اُس نے بات اُدھوری چھوڑ کر خان کی طرف دیکھا۔

"وہ معاملہ مجھ پر چھوڑ دو ـــــ آج شام پانچ بجے کالونی کے بس سٹاپ پر مجھے ضرور ملنا" خان نے بڑے مضبوط لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے" ـــــ رجنی نے کہا لیکن وہ گہری سوچوں میں گم ہو گئی: "تنہائی میں مجھ سے آخر وہ کیا باتیں کرنا چاہتا ہے؟"

○

اس گفتگو سے اُسے کچھ اُلجھن سی ہونے لگی تھی اور اب وہ خان سے نظریں بھی نہیں ملا پا رہی تھی۔

اُس کی مشکل رُما کی آمد نے بہرحال آسان کر دی جو ہاتھوں میں چائے کی ٹرے اٹھائے اندر داخل ہو رہی تھی۔ چائے پینے کے دوران رُما اور خان تو ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے لیکن رجنی کچھ اُلجھی اُلجھی سی نظر آ رہی تھی۔ اُس کی طبیعت کی اِس اچانک تبدیلی کو رُما نے بھی محسوس کیا۔ اُس نے پُوچھا بھی لیکن رجنی ہنس کر بات ٹال گئی۔

چائے پینے کے تھوڑی دیر بعد ہی رجنی نے ایک ضروری کام کا بہانہ کر کے اُن دونوں سے رخصتی کی اجازت لے لی۔ رُما اُسے دروازے تک چھوڑنے آئی تھی۔ واپسی پر وہ رجنی کے لیے خاص ہمدردی محسوس کر رہی تھی۔ "معلوم نہیں اسے، اچانک کبھی کیا ہو جاتا ہے" اُس نے سرد آہ بھر کر خان سے کہا۔

"محرومیاں بندے کو کبھی چین سے جینے نہیں دیتیں۔ کاش! اس کا کوئی بھائی ہوتا" خان نے بھی ہمدردی جگاتے ہوئے کہا۔ "سچی بات تو یہ ہے کہ رجنی تمہاری دوست ہے تمہیں کوشش کرنی چاہیے کہ اُسے کسی بھی طور خوش رکھ سکیں"

رُما نے اُس کی طرف عجیب سی نظروں سے دیکھا پھر سر جھکا کر سسکنے لگی۔ "میں اس کا دکھ سمجھتی ہوں ارون! وہ صرف یہ چاہتی ہے کہ جن لوگوں نے آج سے پانچ سال پہلے اس کی بہن کو قتل کیا تھا، کبھی نہ کسی طرح وہ انہیں سزا دلا سکے، لیکن وہ بہت بدمعاش ہیں! یہ بیچاری کمزور سی لڑکی اُن کا بھلا کیا بگاڑ سکے گی؟"

"کون لوگ ہیں وہ؟" ـــــ خان نے پوچھا۔

"آپ نہیں جانتے بالی کو۔ بہت بڑا غنڈہ ہے وہ! پولیس بھی اُس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔" رُما بولی۔

"چلو چھوڑو کوئی اور بات کرتے ہیں۔" خان کا مقصد حل ہو چکا تھا۔

پانچ بجے تک وہ مسٹر سہائے کو کاروبار کی اُونچ نیچ سمجھاتا رہا۔ وہ بالکل اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے سات پشتوں سے اُس کے آباؤ اجداد یہی کام کرتے آ رہے ہوں اور بوڑھا سہائے خود کو اُس کے سامنے بالکل بچّہ محسوس ہو رہا تھا۔ پانچ بجے وہ ایک ضروری کام کے بہانے باہر نکل آیا۔ اُس نے رُما کو اپنی روانگی کی ہوا بھی نہیں لگنے دی تھی۔

کالونی کے بس سٹاپ پر جب وہ پہنچا تو پانچ بج کر دس منٹ ہو چکے تھے اور رجنی سٹاپ کے ایک کونے پر کھڑی اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسے آتے دیکھ کر اُس کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی۔ خان نے اُسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور تھوڑی دیر بعد وہ دونوں کالونی سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی بار میں بیٹھے مصروفِ گفتگو تھے:

"رجنی اصل میں تمہاری طرح مَیں بھی ایک دُکھی انسان ہوں۔ ظلم ہم دونوں کے ساتھ ہوا ہے لیکن اس کی نوعیت مختلف تھی۔ مجھے سمجھ نہیں آتی آخر تم اچھی بھلی ایسی ہو کر کس چکّر میں پڑ گئی ہو۔ رجنی تم ......"

"بھیّا! اوّل تو میری زندگی میں تم واحد ایسے نوجوان آئے ہو جس نے مجھے بہن کہا ہے سچے تو تم ہندو لگتے ہی نہیں!" رجنی نے گو کہ یہ بات روانی میں کہہ دی تھی لیکن خان کی ریڑھ کی ہڈی میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ اُسے زبردست ذہنی جھٹکا لگا تھا۔ یہ الگ بات کہ اُس کا چہرہ بالکل سپاٹ رہا ـــ "مجھے علم ہے کہ مَیں ایک کمزور لڑکی ہوں لیکن مَیں اُن غنڈوں کو چھوڑوں گی نہیں خواہ میری جان ہی چلی جائے۔"

"اب تمہیں یہ سوچنے کی ضرورت نہیں رجنی ـــ واقعی میں دوسرے نوجوانوں سے مختلف ہوں لیکن میرے ساتھ بھی یہ محرومی لگی ہوئی ہے کہ میری بھی کوئی بہن نہیں ہے

بھائی تمہارا دکھ جان کر کیوں میرا دل بھر آیا۔ رجنی! وقت نے ایک احسان مجھ پر ضرور کیا ہے کہ مجھے قنوطی کی بجائے عملی انسان بنا دیا ہے۔ تمہیں بہن کہا ہے تو اُس پر عمل کر کے بھی دکھاؤں گا۔ آج سے تمہارے اور میرے دُکھ مشترک ہیں ـــ مَیں صرف دو دن میں اس بات کا ثبوت دے دوں گا۔"

اُس کی آواز شدّتِ جذبات سے کانپنے لگی تھی اور رجنی کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ رجنی تو گھر آ گئی لیکن خان کسی اور طرف نکل گیا۔

○

قریباً ڈیڑھ دو گھنٹے بعد وہ سبزی منڈی کے ایک پُر رونق بازار میں بالی کے اڈّے کے سامنے کھڑا تھا۔

اُس کی آنکھوں کے سامنے ایک دُکان کے تھڑے پر گھٹے ہوئے جسم، ٹھگنے قد اور سیاہ رنگت کا ایک غنڈہ بیٹھا تھا جس کے دونوں اطراف پانچ چھ مشٹنڈے جو شکل ہی سے چھٹے ہوئے بدمعاش دکھائی دے رہے تھے اپنے "دھندے" میں مصروف تھے۔ یہ لوگ کھلے عام منشیات فروخت کر رہے تھے اور سوائے اُن کے خریداروں کے اور کوئی اُن کی طرف آنکھ بھر کر دیکھنے کی جرأت بھی نہیں کرتا تھا۔

خان کچھ دیر تک کھڑا یہ سارا "تماشہ" بڑے انہماک سے دیکھتا رہا۔ اُس نے اِس دوران بالی کے اڈّے اور گھر کا پتہ بھی معلوم کر لیا تھا، پھر وہ بازار میں جائزہ لینے کے لیے ذرا اور آگے چلا گیا۔

گھوم پھر کر واپس اُسی جگہ آیا تو یہاں کچھ اور ہی منظر تھا ـــ اُس نے دیکھا: ایک بوڑھے سے ہندو کو جو شکل سے کوئی معمولی سا سرکاری ملازم نظر آ رہا تھا۔ بالی کے آدمی بڑی بیدردی سے مارپیٹ رہے تھے اور وہ وحشیوں کی طرح قہقہے لگا رہا

تھا۔ بوڑھا اس کے سامنے گھگھیاتے ہوئے ہاتھ باندھ رہا تھا، لیکن اُس کے ساتھی اِس بات سے لاپرواہ اُسے دیوانوں کی طرح پیٹ رہے تھے۔ بازار میں کسی کی ہمت نہیں تھی اُنہیں کچھ کہہ سکے! جلد ہی وہ بدنصیب بیہوش ہو گیا۔

"اُٹھا کر پھینک آؤ اِسے کسی گٹر میں! بالی کے خلاف شکایت کرتا ہے سالا!" بالی نے خونخوار قہقہہ لگایا۔

اگلا منظر دیکھنے کے لیے خان وہاں رکا نہیں تھا ـــــ وہ تیز تیز قدموں سے واپس لوٹ آیا۔

اِس بوڑھے سے اُس کی کوئی رشتہ داری نہیں تھی۔ نہ ہی وہ اِس معاشرے کا رُکن تھا۔ لیکن صریحاً ظلم دیکھ کر وہ کانپ گیا۔ اِسی طرح اُسے رجنی سے بھی ہمدردی ہو گئی تھی۔ اب وہ اُس کا دِل جیتنے کے لیے کوئی بھی ڈرامائی قدم جلد از جلد اٹھانا چاہتا تھا۔ اِس علاقے میں داخلے اور فرار کے راستے اِس نے ذہن نشین کر لیے تھے اور اگلی رات بالی کو سزا دینے کے لیے مُنتخب کر لی تھی۔



صبح وہ بالوجی کے ساتھ چپراسی کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گیا۔ یہ آرمی کی کوئی ورکشاپ تھی۔ صوبیدار بلاقی رام کا نام لینے پر ایک سپاہی چونکا اور دونوں کو بڑے احترام سے اندر لے آیا۔ شاید بلاقی رام نے ان کی آمد سے گیٹ والوں کو پہلے ہی سے مطلع کر رکھا تھا۔

بلاقی رام تھا تو صوبیدار میجر، لیکن اُس کا کمرہ کسی کرنل کے کمرے سے کیا کم شاندار ہو گا۔ چپراسی پہلے سے یہاں موجود تھا۔ دونوں کو آتے دیکھ کر وہ اپنی ہنسی ضبط نہ کر سکا۔ لیکن بلاقی رام کا چہرہ جذبات سے عاری تھا۔

چپراسی نے دونوں کا تعارف کروایا اور بتایا: "کہ بالوجی بے چارے ریٹائرمنٹ کے

اور حال ہی میں ٹھیکیداری سے مُنسلک ہوئے ہیں۔" اُس نے صوبیدار سے درخواست کی کہ وہ اُن کا ہاتھ پکڑ لے اور نیا پار لگا دے۔

تھوڑی سی تگ و دو کے بعد میرٹھ چھاؤنی کے لیے پانچ سو مچھردانیاں سپلائی کرنے کا ٹھیکہ "سہائے کمار جنرل آرڈر سپلائرز" کو مل گیا۔ صوبیدار بلاقی رام نے اُن کے ساتھ انتہائی شرافت اور خدا خوفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُن سے صرف ۲۵ فیصد کمیشن طلب کی تھی۔ خان نے آدھی کمیشن ایڈوانس اُسے وہیں تھما دی تھی اور آدھی بل وصول ہونے پر ادا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔

گھر واپسی پر دونوں مٹھائی کی ایک ٹوکری ساتھ لے کر آئے تھے۔ اس سودے میں کمیشن دے دلا کر بھی اُنہیں کم از کم پانچ ہزار روپے کا منافع ہونے والا تھا۔ خان نے چپراسی کو سو روپیہ پیشگی انعام دے دیا تھا۔ پہلا ہی کامیاب سودا طے ہونے کا اُس چھوٹے سے گھرانے میں شاندار جشن منایا گیا۔ وہ لوگ خوشی سے باؤلے ہوئے جا رہے تھے۔ کشور اور آشا نے تو ابھی سے بڑے بڑے خواب دیکھنے شروع کر دیئے تھے۔ خان کو خوشی تھی تو صرف اتنی کہ اِس طرح اُس کی رسائی کم از کم میرٹھ چھاؤنی تک تو ہوئی۔

ایک طرف قدرت نے اگر بھارت کی سب سے بڑی انٹیلی جنس "را" پر نقب لگانے کے لیے اُسے رجنی جیسی "بہن" دے دی تھی تو دوسری طرف میرٹھ جیسی حساس چھاؤنی اور دیگر فوجی تنصیبات تک رسائی پانے کے لیے صوبیدار میجر بلاقی رام جیسا گدھا بھی فراہم کر دیا تھا۔

"جاسوسی مضبوط اعصاب کا کھیل ہے۔" اُس نے اپنی ٹریننگ کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھلایا تھا۔ اب تک اُس کی کامیابی کا راز صرف یہی تھا کہ وہ کبھی بوکھلایا نہیں تھا۔ اُس کے اعصاب پہلے روز کی طرح مضبوط تھے۔ پے در پے ناکامیوں کے باوجود اُسے شاندار کامیابیاں ہاتھ آئی تھیں۔



رجنی شام ڈھلے ہی اُدھر آ گئی تھی —

خان کو یہ اطمینان ضرور تھا کہ رُما کو اُس کا رجنی سے میل جول بُرا نہیں لگتا۔ اور آج تو رجنی نے اُسے "بھیا" کہہ کر مخاطب کرنا شروع کر دیا تھا —— رُما کے لیے یہ بات اور زیادہ خوش آئند تھی۔ رات کا کھانا سب نے اکٹھے کھایا۔ پھر خان سب کو آخری شو دکھانے کے بہانے باہر لے آیا۔

سبزی منڈی کے پاس والے سینما ہاؤس تک پہنچنے کے لیے اُس نے سب کے سامنے وہاں چلنے والی ایک انگریزی فلم کی اتنے شاندار الفاظ میں تعریف کر ڈالی تھی کہ سب اُسے دیکھنے کے لیے پریشان ہو رہے تھے۔ فلم پر کوئی خاص رش نہیں تھا۔ خان نے پورا باکس بُک کر لیا اُس نے اپنی سیٹ جان بوجھ کر رجنی کے نزدیک رکھی تھی۔

فلم مقررہ وقت پر شروع ہو گئی۔

قریباً دس بجے اُس نے رجنی کی طرف جھکتے ہوئے اُس کے کان میں سرگوشی کی:

"مجھے آشیرباد دو بہن!" رجنی تھرا کر ہی تو رہ گئی۔ اُسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کہہ گزرے گا۔

"ایکسکیوزمی"۔ خان نے رُما سے بھی سرسری طور پر معذرت کی اور آہستگی سے دروازہ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

اُسے یقین تھا کہ سینما کے کم از کم کسی ملازم کو اُس کے باہر نکلنے کی کانوں کان خبر نہیں ہوئی۔ بمشکل دس منٹ بعد ہی وہ بالی کے ڈیرے کے باہر منڈلا رہا تھا۔

خان مکان کی پُشت پر پہنچ گیا! اُس نے دیوار پھاندنے سے پہلے اپنا منہ مفلر سے اچھی طرح ڈھانپ لیا تھا اور اپنی جیب سے پیتل کا وہ پنجہ جو اُس نے صبح ہی خریدا تھا نکال کر دائیں ہاتھ میں پہن لیا تھا۔ یہ بات اُس کے لیے بڑی خوشگوار حیرت

کا باعث تھی کہ ابھی تک یہاں کسی کی موجودگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

بلی کی طرح دبے قدموں وہ بالآخر ایک کمرے میں کسی کی موجودگی کے آثار پا کر داخل ہو گیا۔ لائٹ جل رہی تھی اور اُس کے بالکل سامنے بالی شراب کی بوتل مُنہ سے لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کے پہلو میں ایک فاحشہ موجود تھی۔ خان کی اچانک آمد نے دونوں کو چونکا دیا۔

"کون ہے بے ہے" —— اُس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی بالی نے گالی دے کر اُسے مخاطب کیا۔ اس گالی پر تو واقعی خان کا خون کھول اٹھا۔

اُس نے بالی کی گالی کا جواب ایک زوردار ٹھوکر سے دیا —— اور پہلو میں اچانک لگنے والی ٹھوکر نے بالی کو اُلٹا ہی تو کر دیا تھا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل کر پلٹا! لڑکی کے لیے تو خوف کے مارے آواز بھی نہیں نکل رہی تھی۔

خان کو اتنی جلدی بالی کے سنبھلنے کی اُمید نہیں تھی۔ اگر وہ اچانک ہی ایک طرف ہٹ جاتا تو بالی کے ہاتھ سے نکلی ہوئی بوتل اُس کے سر پہ ہی ٹوٹتی۔ اُس کے سیدھا ہونے تک بالی اُچھل کر اُس کے سر پہ پہنچ چکا تھا۔ اور اُس کا گھونسہ پوری قوت سے گھوم کر خان کی طرف آیا تھا۔ یہ الگ بات کہ ہوا میں لہرا کر رہ گیا۔

خان نے زمین پر بیٹھتے ہوئے پیتل کے پنجے والا مُکّہ پوری قوت سے اُس کی ناف پر مارا۔ بالی سامنے والی دیوار سے ٹکرا کر گرا لیکن اٹھ کھڑا ہوا۔ اذیت سے وہ تڑپ رہا تھا۔ خان کے پاس وقت بہت کم تھا۔ کسی بھی وقت ہنگامہ برپا ہو سکتا تھا۔ اُس نے دوبارہ بالی کو سنبھلنے کا موقعہ نہیں دیا۔ دو تین منٹ بعد جب وہ قریباً بے دم ہو چکا تو اچانک ہی خان نے جُھک کر اُس کا پاؤں پکڑ لیا۔

بالی کے پاؤں کو اتنا شدید جھٹکا شاید زندگی میں پہلی مرتبہ لگا تھا۔ اُس کی چیخ اتنی بھیانک تھی کہ لڑکی سہم کر رہ گئی اور لاشعوری طور پر اُس کے مُنہ سے بھی ہلکی سی چیخ

نکل پڑی۔

"دوبارہ اگر تمہارے گلے سے کوئی آواز نکلی تو گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا۔" خان اُس کی طرف دیکھ کر غرّایا۔ بالی چیخ مار کر بے ہوش ہو چکا تھا۔ خان نے جُھک کر اُس کے بے دم وجود کو ہاتھوں میں تولا اور جھٹکے سے اُسے کندھے پر لاد لیا۔

"میرے ساتھی اِس عمارت میں موجود ہیں۔ اگر صبح ہونے سے پہلے تم نے یہاں بھاگنے کی کوشش کی یا پولیس کو کچھ بتایا تو یاد رکھنا..... جو لوگ بالی جیسے غنڈوں کو سزا دے سکتے ہیں تمہاری حیثیت اُن کے نزدیک کچھ بھی نہیں"۔ خان نیم برہنہ لڑکی کی طرف دیکھ کر دوبارہ غرّایا:

"پرماتما کے لیے مجھے جانے دو۔ یہ حرامی مجھے زبردستی یہاں اُٹھا کر لایا تھا۔ میں میں تو خوش ہوئی ہوں۔ کسی کو کیوں بتاؤں گی بھلا؟" لڑکی ہاتھ باندھ کر اُس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

خان نے نظریں جُھکا لیں:

"کپڑے پہنو اور چلی جاؤ۔" اُس نے آہستہ سے لڑکی سے کہا اور بالی کو کندھوں اٹھائے باہر نکل آیا۔

برآمدے میں لگا بلب کا بٹن اُس نے آف کر دیا تھا۔ احتیاط سے پنجوں کے بغیر آواز پیدا کیے وہ باہر آیا تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ اتنا بڑا غنڈہ بغیر باڈی گارڈ کے موجود تھا۔ شاید بالی نے کبھی یہ تصور بھی نہ کیا تھا کہ اُس پر کوئی یوں حملہ آور ہو گا۔ آج خان کی خوش قسمتی تھی کہ اِس وقت اُس کے ساتھی یہاں موجود نہیں تھے۔

بالی کے بے ہوش جسم کو اُس نے گلی کے کونے پر موجود گندگی کے ڈھیر پر پھینکا دہلی جاگ رہی تھی لیکن کوئی اُس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ ساری گلی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی اور وہاں کوئی ذی روح سوائے اُس کے موجود بھی نہیں تھا۔

سینما واپس پہنچنے تک اُس کے بمشکل پچیس تیس منٹ لگے تھے لیکن اندر والے پریشان ہو رہے تھے۔ خان کے داخل ہوتے ہی ہاف ٹائم ہُوا اُس نے سب سے جنی کی طرف دیکھا جو سب سے زیادہ پریشان دکھائی دے رہی تھی۔

"کہاں چلے گئے تھے آپ؟" رَما سراپا احتجاج اُس سے مخاطب تھی۔

جواب میں خان نے قہقہہ لگایا: "اجی کیا بتاؤں چلا گیا تھا پھنس گیا تھا۔ یہاں نکلا ہوں کہ سامنے سے وہ کمبخت رُلیا رام آتا دکھائی پڑا۔ میں تو "نمستے" کہنے کا گار ہوا ہوں باقی سارا کام اُسی کا ہے۔ وہ تو قسمت اچھی تھی کہ اُس کا ایک اور کار مل گیا اور میں جان بچا کر نکل آیا ہوں"۔ وہ دوبارہ خوامخواہ ہنس دیا۔

رُلیا رام سے اُس گھر کے تمام مکینوں کا غائبانہ تعارف تھا۔ یہی وہ چپراسی تھا کے ذریعے وہ آدمیوں کی بھیڑ سے نکل کر معزز ٹھیکیداروں کے گروپ میں شامل تھے۔

"پھر بھی بھیّا! آپ کو اتنی دیر نہیں کرنی چاہیئے تھی"۔ رجنی اَب بھی گھبرائی ہوئی دکھائی ہی تھی۔

"خیریت ہے بھئی۔ آخر مجھ ہی پر اتنی کڑی نظریں کیوں رکھی جا رہی ہیں؟" خان نے باری سب کے چہروں پر نظریں دوڑائیں۔

"آپ بھیّا جی ــــ ہیں ہی ایسی چیز۔ آپ کو ایک مرتبہ پا کر کوئی کھونا چاہتا۔" اِس مرتبہ آشا کی باری تھی۔

"واہ موٹی! بڑے ڈائیلاگ بولنے لگی ہو"۔ خان کی بات پر سب ہنس دیئے۔

انٹرول پر اُنہوں نے اپنے باکس ہی میں بوتلیں منگوا لی تھیں۔ فلم ختم ہونے تک پھر ہر نکلا۔ فلم کے خاتمے پر جب وہ لوگ باہر آئے تو رات کے ساڑھے بارہ بج تھے۔

اس وقت اس علاقے کی سڑکیں سُنسان ہو جایا کرتی تھیں لیکن آج خلافِ معمول ایک طوفانِ بدتمیزی ہر طرف برپا تھا۔

"کیا ہوا صاحب؟" کشور نے ایک نوجوان سے پوچھا جو اب تک کئی لوگوں کو ... والی قیامت کی رُوداد سُنا چکا تھا۔

"کسی نے بالی کی ٹانگ توڑ کر اُسے گندگی کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ بہت مارا ... بالی کی تو شکل بھی نہیں پہچانی جا رہی کسی سے۔" مخاطب نے دہلی کے خاص کرخنداری ... میں مزے لے لے کر باہر ہونے والی واردات بیان کی۔

خان نے کنکھیوں سے رجنی کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر یکدم زندگی جاگ ... اُس کی آنکھیں چمکنے لگی تھیں۔ اور کنپٹیوں کے نزدیک رگیں پھڑک رہی تھیں۔ ایک ... رجنی نے خان کی طرف دیکھا؛ اُس کی آنکھوں میں تشکر کا ایک سمندر ہلکورے لے ...

"بھیّا۔" اُس کے ہونٹ کپکپائے۔ اِس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

رُما نے اچانک ہی چونک کر خان اور رجنی کی طرف دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں ... اُلجھن نمودار ہوئی اور اُس کے پس پردہ اُبھرنے والے سوال سے بچنے کے لیے ... وہاں سے ہٹ جانا ہی مناسب سمجھا۔ اُس نے باہر نکل کر ایک ٹیکسی کو ہاتھ دیا اور ... لوگوں کو نزدیک آنے کا اشارہ کیا۔

اس مرتبہ وہ جان بوجھ کر آگے بیٹھا تھا۔ ٹیکسی والا شاید کوئی مقامی تھا۔ تمام ... مزے لے لے کر وہ بالی کی مرمت کی کہانی سناتا رہا۔ وہ تمام واقعات ایسے بیان کر ... جیسے موقعے کا چشمِ دید گواہ رہا ہو۔ کشور اور آشا تو اس کی گفتگو میں ضرورت سے ... دلچسپی ظاہر کر رہے تھے۔ البتہ رجنی، خان اور رُما ہوں، ہاں ہی کر رہے تھے ——— اپنی سوچوں میں گم تھے۔

ٹیکسی پہلے اُن کے گھر پہنچی۔ سب لوگ اُتر گئے۔

"میں رجنی بہن کو ڈراپ کر کے واپس آتا ہوں۔" اُس نے کسی کو کچھ کہنے کا موقع ہی ...

رجنی سحر زدہ سی بیٹھی رہی اور ٹیکسی آگے رینگ گئی ——— اُس کے گھر سے کچھ ... پر دونوں اُتر گئے۔ رجنی نے اب بھی کچھ نہ کہا۔ جیسے ہی ٹیکسی آگے بڑھی وہ بچوں ... بلک پڑی:

"بھیّا!" اِس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکی۔

"رجنی وہ جاپانی انسٹرکٹر جس سے میں نے مارشل آرٹس سیکھے تھے کہا کرتا تھا: کر ... سال اور اُس کی شاگردی کروں تو انٹرنیشنل فائیٹ لڑ سکتا ہوں!! میں نے ابھی ... ظاہر نہیں کیا نہ ہی میں زندگی میں غنڈہ گردی کا قائل رہا ہوں۔ لیکن تمہارا دکھ ... برداشت نہیں ہوا۔ میں چاہتا تو بآسانی اُسے کُتے کی موت مار ڈالتا۔ لیکن یہ انتقام ... طریقہ نہیں تھا۔ میں نے اُس کا پاؤں جس جگہ سے توڑا ہے دُنیا کا کوئی ڈاکٹر جوڑ نہیں ... ساری زندگی وہ اپاہجوں کی طرح گزارے گا اور لوگ اُسے دیکھ کر ہنسا کریں گے۔

——— یہ راز صرف تمہارے اور میرے بیچ رہے گا۔ باقی لوگوں کی نشاندہی بھی تم کر ... وہ بھی اپنے کیے کی سزا ضرور بھگتیں گے۔ بس میری ایک درخواست ہے کہ اب ... شہر مطمئن ہو جانا چاہیئے اور تم یہ سروس صرف دیش کی سیوا کے لیے کرو۔ تمہارے ... جو ایک بڑا بوجھ تھا بھائی ہونے کے ناطے میں نے اسے قدرے ہلکا کر دیا ——— زندگی کے سفر میں اب تم اکیلی نہیں رہو گی۔ مجھے ہمیشہ اپنے ساتھ پاؤ گی۔"

"بھیّا! آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے اِس کا بدلہ تو شاید اگلے بھی کسی جنم میں نہ ... لیکن زندگی میں اگر کبھی ایسا وقت آگیا تو میں بھی آپ پر ثابت کر دوں گی کہ ... پوت کی بیٹی ہوں۔" اِس کا لہجہ اتنا مضبوط تھا کہ خان محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"... لینا۔ ممکن ہے تب حالات مختلف ہوں اور تم مجھے پہچاننے سے بھی انکار کر دو۔"

خان مسکرا دیا۔

"میرے جیتے جی ایسا کبھی نہیں ہو گا۔ کبھی نہیں۔"

"اچھا شب بخیر!" خان کہہ کر واپس مڑ گیا اُسے علم تھا کہ رُما کتنی بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہی ہو گی۔

رُما واقعی بے چینی سے اُس کی منتظر تھی اور خاصی سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ خان ... شک میں مبتلا کرنے کا خطرہ کبھی مول نہیں لے سکتا تھا۔ اُس نے بظاہر مسکراتے ہوئے ... کا استقبال بھی کیا تھا لیکن اس مسکراہٹ کے لیے اُسے خود پر کتنا جبر کرنا پڑا تھا ... اندازہ صرف خان ہی لگا سکتا تھا۔

باقی سب لوگ تو اپنے اپنے بستروں میں جا گھسے تھے۔ رُما کا ہاتھ پکڑ کر وہ ... بڑی بے تکلفی سے اُوپر چھت پر لے آیا۔ اس چھت پر بیٹھ کر آپس میں گھنٹوں گفتگو ... رہنا دونوں کا معمول بن چکا تھا۔

"مجھے معلوم ہے رُما تم کیا سوچ رہی ہو۔ تمہارے ذہن میں کیا کیا سوالات ... رہے ہیں۔ رُما میں نے زندگی میں بہت کشٹ اٹھا کر تمہیں حاصل کیا ہے اور تمہاری ... کا جو شیش محل میں نے سجا رکھا ہے۔ اُس میں اگر ایک بال بھی آ جائے یہ میرے ... ناقابلِ برداشت ہو گا ـــــ ہاں۔ بالی کی ٹانگ میں نے توڑی ہے۔ میں نے تمہیں ... تھا کہ مارشل آرٹ کا ماہر ہوں۔ یہ آرٹ میں نے نیپال میں ایک جاپانی انسٹرکٹر ... سیکھے تھے اور دو سال تک اُس کی شاگردی اختیار کی۔ میں نے پہلے ہی روز تمہاری ... کی محبت کا اندازہ لگا لیا تھا۔ تمہاری ہر چیز سے مجھے والہانہ عشق ہے۔ یہ قدم بھی ... نے صرف تمہاری خوشنودی کے لیے اٹھایا ہے ـــــ اور رجنی کو میں اپنی سگی بہنوں ... بڑھ کر سمجھتا ہوں۔ شاید قدرت نے مجھے تم لوگوں سے ملایا ہی اسی لیے تھا کہ میری ...

...رہوں کا ازالہ ہو جائے۔ مجھے تمہاری محبت پر ناز ہے اور رجنی جیسی بہن پا کر فخر محسوس کرتا ہوں کہ وہ دیس کی سیوا کے لیے اتنی خطرناک نوکری کر رہی ہے....." وہ بولتا چلا گیا اور اس کے اندر شکوک کا سر اٹھاتا ناگ شانت ہوتا گیا۔

ہر قدم پر اُس کے سامنے خان کا نیا روپ آ رہا تھا اور ہر روپ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہوتا تھا۔

اُسے اپنے مقدر پر رشک آنے لگا تھا۔ اُس روز پہلی مرتبہ بہت سنجیدگی سے اُس نے سوچا، کہ ضرور کبھی پچھلے جنم میں اُس سے کوئی بہت بڑی نیکی سرزد ہوئی ہے جو اس جنم میں اُسے ارون کمار جیسا ساتھی نصیب ہوا ہے۔"

"آپ میرے تصورات سے بھی بڑھ کر عظیم ہیں۔ آپ دیوتاؤں کی طرح مہان ہیں اور میں..... میں تو آپ کی معمولی داسی ہونے کے لائق نہیں ہوں کمار جی! یہ آپ کا احسان ہے کہ آپ نے مجھے اپنے چرنوں میں جگہ دی۔" رُما احساسِ تشکر سے دب گئی تھی۔

"رُما! انسان کیا ہے؟ یہ تم ابھی نہیں سوچ سکتی مجھے دیوتا بنا کر خود سے دُور مت کرو۔ میں اگر دیوتا بھی ہوتا تو تمہاری محبت پانے کے لیے انسان کا روپ دھار کر زمین پر آ جاتا۔"

خان محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ باتیں وہ صرف ایکٹنگ کرنے کے لیے نہیں کہہ رہا کوئی طاقت واقعی اُس سے یہ سب کچھ اُگلوا رہی ہے۔ "جانے اس لڑکی میں کیا سحر چھپا تھا کہ اس کو اپنی شخصیت اُس کے سامنے دبی دبی محسوس ہوتی تھی۔"

ـــــ وہ کھیل جو اُس نے اپنے بزنس کا حصہ سمجھ کر کھیلا تھا آہستہ آہستہ اب حقیقت کا روپ دھارنے لگا تھا۔

لاشعوری طور پر اُس کا دل اُس کی گرفت سے آزاد ہو کر اب رُما کی مٹھی میں چلا گیا تھا۔ کوئی خوش کن جذبات نہیں تھی۔ اُسے اپنے بچپن کی وہ کہانیاں یاد آ گئیں۔ جب

ایسی ہی خوبصورت جادوگرنیاں شہزادوں کو پتھر کے مجسمے بنا کر اپنے غاروں میں نصب کر لیا کرتی تھیں۔"

—— عین ممکن تھا کہ رما کی محبت کا سحر اُسے پتھر کا بُت ہی نہ بنا کر رکھ دیتا۔

رما نے اُس کی بات کا جواب صرف "اوں" کہہ کر دیا اور اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ خان کا ہاتھ بے اختیار اُٹھا اور اُس کی انگلیاں رما کے بالوں میں کنگھی کرنے لگیں۔ ایک نامعلوم سی مدہوشی اُس پر چھانے لگی۔ ان بالوں میں دھنک کے ساتوں رنگ لہراتے نظر آ رہے تھے اور رنگوں کی اس دھنک میں وہ ڈوبتا چلا جا رہا تھا —— !!

موت کی دستک

ٹنڈر کھلنے میں ابھی کچھ روز باقی تھے اور خان جانتا تھا: "کہ صوبیدار سرکاری کارروائی بہرحال پوری کرے گا۔"

اُس کی ڈاڑھی اب چہرے پر نمایاں ہونے لگی تھی۔ عینک لگانی اُس نے چھوڑ دی تھی اور اپنے بالوں کا سٹائل بھی خان نے تبدیل کر لیا تھا۔ اگلے روز صبح جب رجنی اُن لوگوں سے ملنے آئی تو خوشی سے اُس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ دہلی کے اخبارات نے اُس روز بالی کی نامعلوم حملہ آور کی طرف سے ٹھکائی اور پھر اُس کی ٹانگ توڑ کر اُسے کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک جانے کے واقعات کو شہ سُرخیوں کے ساتھ شائع کیا تھا۔

بالی کو ہسپتال میں جا کر ہوش آیا تھا لیکن وہ کسی کی نشاندہی کرنے سے قاصر تھا۔ اُس نے پولیس کو صرف اتنا بیان دیا: "کہ حملہ آوروں نے چہرے چادر سے ڈھانپ رکھے تھے۔" اُس نے اپنی ساکھ قائم رکھنے کے لیے جھوٹ بولا تھا۔ یہ بات اُس کے لیے باعث شرم تھی کہ ایک اکیلا آدمی اُس کے ڈیرے پر آیا اور اُسے مار مار کر بے ہوش کر گیا۔

ڈاکٹر نے ذاتی رائے دی تھی: "کہ جس بُری طرح اُس کا پاؤں توڑا گیا ہے اب اُس کے دوبارہ جُڑنے کے امکانات بہت کم ہیں۔" کسی نے بڑے ماہرانہ طریقے سے یہ کام کیا تھا! بالی کے ساتھ ایسا سلوک ہونے پر شہریوں نے سُکھ کا سانس لیا۔ اب پولیس اُس کی غیر موجودگی میں اُس کے ساتھیوں کو گرفتار کرنے کے لیے چھاپے مار رہی تھی۔

اروُن کی درخواست پر رَما نے اس بات کو اپنے تک ہی محدود رکھا تھا۔ اُس نے رجنی پر یہ ظاہر نہیں کیا تھا: کہ اروُن نے اُسے سب کچھ بتا دیا ہے۔" چار چھ روز اُس نے گھومنے پھرنے ہی میں گزار دیے۔ اُس روز بھی وہ رَما کے ساتھ ایک بار نما ہوٹل میں بیٹھا تھا جب ایک بیرا اُس کے نزدیک آکر رُکا۔

"آپ ہی کا شبھ نام اروُن کمار ہے؟"

"ہاں"۔۔۔ خان کے بجائے رَما نے جواب دیا۔

"یہ چٹھی آپ کے نام ایک صاحب دے گئے ہیں۔" بیرے نے اُسے ایک بند لفافہ تھما دیا۔

"اوہ وہی گدھا ہوگا"۔۔۔ خان نے حیرت انگیز پھرتی سے اپنا موڈ بدل لیا تھا اور بڑے کھلنڈرے انداز میں لفافہ پھاڑ کر کاغذ نکالا۔۔۔ "اجی صاحب! آج کل تو فلموں نے لڑکوں کا دماغ خراب کر دیا ہے۔ ایک دو انگریزی فلمیں کیا دیکھ لیں خود کو جیمز بانڈ بنا لیتے ہیں۔ اب اس گدھے دلیپ ہی کو دیکھ لو مجھے مل بھی تو سکتا تھا۔ نہیں ملا۔ رقعہ دے گیا ہے۔ دھت تیرے کی؟" اُس نے رقعہ پر پھرتی سے نظریں دوڑائیں اور ذہن میں ایک فون نمبر حفظ کر کے اُسے پھاڑ کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔

"یہ کیا؟" رَما بولی، "جیب میں آپ نے کاغذوں کے ٹکڑے کیوں ڈال لیے؟"

"کیا میں لوگوں کی طرح نادانی کروں؟" اُس نے فرش پر بکھرے ہوئے کاغذوں کی طرف اشارہ کیا۔۔۔

اور یہ کہتے ہی اُس نے ایک زوردار قہقہہ بلند کیا اور پھر باقاعدہ ہنسنا شروع کر دیا۔

"کیا بات ہے۔ کیا ہوا؟"۔۔۔ رَما نے حیرانگی سے پوچھا۔

"مل گیا سالا۔۔۔ معلوم ہے کیا لکھا ہے؟"

"کیا"۔۔۔ رَما کی حیرانگی ابھی تک ختم نہیں ہوئی تھی۔

"لکھا ہے۔ میں کباب میں ہڈی بننا نہیں چاہتا۔ اس لیے تمہیں ملے بغیر جا رہا ہوں۔" اتنا کہہ کر اُس نے پھر باقاعدہ ہنسنا شروع کر دیا۔ اس مرتبہ وہ اکیلا نہیں ہنسا تھا۔ رَما نے بھی اس کا مکمل ساتھ دیا تھا۔

خان نے کمال ہوشیاری سے معاملہ گول کر دیا تھا اور اصل بات کی اُسے ہوا تک نہیں لگنے دی تھی۔

اصل میں یہ خط اُسے مقامی سپائی ماسٹر کی طرف سے لکھا گیا تھا جس میں اُس کے لیے اپنے ملک سے کسی خصوصی پیغام کی خبر دی گئی تھی جو اُس نے مطلوبہ نمبر ڈائل کر کے حاصل کرنا تھا۔ خان کو اب بے چینی سی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ جلد از جلد یہ احکامات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اُسے تو ایک پل بھی فارغ رہنا گوارا نہیں تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ اُٹھ کر گھر جا رہے تھے۔ خان نے رَما پر اپنے رویے میں کوئی معمولی سی تبدیلی بھی ظاہر نہ ہونے دی تھی۔ بلکہ رَما کے ذہن سے ہی یہ بات نکل چکی تھی کہ کسی نے خان کو ہوٹل میں کوئی خط بھی لا کر دیا تھا۔

رجنی واپس جا چکی تھی۔ انہوں نے خاصا وقت ایک دوسرے کی معیت میں گزارا تھا۔ بالی کی ٹانگ ٹوٹنے کے بعد سے اب رجنی خاصی نارمل ہو گئی تھی۔ ایک بات تو خان نے خاص طور سے محسوس کی تھی: کہ اُس کا رویہ اب پہلے ایک دو روز والا نہیں رہا تھا وہ خان کی غیر موجودگی میں تو رَما کے ساتھ وہی غیر سنجیدہ گفتگو اور حرکتیں کرتی تھی، لیکن خان کے وہاں آتے ہی سنجیدگی اختیار کر لیتی تھی۔ خان محسوس کرنے لگا تھا کہ اب وہ اُس کی دل سے عزت کرتی ہے۔

○

اُسی رات اُس نے مطلوبہ ٹیلی فون نمبر ڈائیل کر کے اپنے متعلق تازہ احکامات

حاصل کر لیے تھے ـــــ اُسے بتایا گیا تھا کہ: "آج سے ٹھیک دس روز بعد، جب گھڑی کی سوئیاں تین اور بارہ کے ہندسوں کو چھو رہی ہوں تو اُسے انبالہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچ جانا چاہیئے ـــــ "نئے دوست" کی پہچان اُسے کرادی گئی تھی اور باقی احکامات اُسی سے حاصل کرنے تھے۔"

"انبالہ شہر!" "اچھے ساہنی!!" ـــــ یہ دونوں الفاظ دُہراتے دہراتے اُس نے رات کاٹی اور جب صبح ہوئی اور وہ لوگ ناشتے سے فارغ ہوئے تو یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ "روزمرّہ کی ڈاک میں اُنہیں سپلائی آرڈر موصول ہو گیا ہے۔"

رَما نے اُسے بتایا کہ ـــــ "رجنی کی چھٹی ختم ہو گئی تھی شاید دو ایک روز بعد ہی وہ گھر آئے۔"

دو تین روز بعد خان اور سہائے ایک کرائے کے ٹرک پر مال لاد کر میرٹھ چھاؤنی کی طرف جا رہے تھے۔

اُن کی آمد کی اطلاع پا کر صوبیدار بلاقی رام دروازے پر ہی آگیا تھا۔ اُس کے "کلیئر" کرنے کے بعد ہی ٹرک کو اندر جانے کی اجازت ملی تھی۔ مطلوبہ سٹور کے دروازے پر پہنچنے تک بلاقی رام نے اُنہیں یہ بریفنگ بھی کر دی تھی: "کہ وہ اپنے کرنل صاحب کی موجودگی میں اُنہیں ڈانٹ ڈپٹ بھی کرے گا لیکن اُنہیں بُرا نہیں ماننا۔"

خان کی عقابی نظریں بڑی بے چینی سے اطراف میں بھٹک رہی تھیں۔ اُس نے سپاہیوں کی آمد و رفت سے اندازہ لگایا تھا: "کہ یہاں زیادہ تر سکھ رجمنٹیں ہی رکھی جاتی ہیں!" اُن کا مال وہیں اُتار کر "کرنل صاحب" کی موجودگی میں دوبارہ چیک کیا گیا تھا اور کرنل صاحب نے کمالِ شفقت کا ثبوت دیتے ہوئے اوکے کر دیا تھا۔

جہاں وہ لوگ موجود تھے وہ ایک بیرک نما گودام تھا جس کی پُشت پر نشانہ بازی کی

گاہ بنی ہوئی تھی۔ اردگرد کھلی جگہ پر جوان مشقیں کر رہے تھے۔ خان بڑی دلچسپی سے اُنہیں مشقیں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑی سی بیرک کے پیچھے سے ایک دستہ نمودار ہوا جسے دیکھ کر خان چونکے بغیر نہ رہ سکا۔ وہ اُن لوگوں کو پہچان گیا تھا لیکن تصدیق بھی ضروری تھی۔

"صوبیدار جی!" بالآخر اُسے موقع مل ہی گیا۔ "ہم نے تو سُنا تھا کہ فوجی لوگ ڈسپلن کے بڑے پکے ہوتے ہیں۔ لیکن کمال ہے۔ یہ لوگ تو دھوتی کے ساتھ ہی مشقیں کر رہے ہیں۔" اُس نے سامنے۔ بندوقیں ہاتھ میں پکڑ کر اُچھلتے کودتے ہوئے نوجوانوں کی طرف اشارہ کیا۔

"ارے یہ لوگ باقاعدہ فوجی نہیں ہیں۔" بلاقی رام نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تو کون ہیں یہ؟" خان کے بجائے سہائے نے پوچھا۔

"تم تو اپنے لوگ ہو۔ کسی کو بتانا نہیں۔ یہ راز کی باتیں ہوتی ہیں۔" بلاقی رام نے اُن کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ "یہ "مکتی باہنی" ہے۔"

"مکتی باہنی کیا؟" خان نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی پوچھ لیا۔

"ـــــ اُدھر ڈھاکہ سے جو لوگ بھاگ کر آتے ہیں ہم اُنہیں ٹریننگ دے کر پھر پاکستان واپس بھیج رہے ہیں۔" بلاقی رام نے سمجھایا۔

"یہ سب لوگ اُدھر ہی کے ہیں؟" سہائے بھی گفتگو میں خاصی دلچسپی لے رہا تھا۔

"ارے نہیں یار! اب تمہیں ساری باتیں کیسے بتادوں۔" بلاقی رام نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے اپنی معلومات کا رعب جھاڑا۔ "ان میں بمشکل پانچ سات اُدھر کے ہیں۔"

"اور یہ باقی پندرہ بیس کون ہیں؟" خان نے پوچھا۔

"وہ تو کلکتہ کے ہیں اور دراصل یہی لوگ تو اُدھر جا کر اصلی کام کریں گے: جو خود کو مظلوم بنگالی بتا کر لوگوں کو حکومت کے خلاف بغاوت پر اُکسائیں گے۔ اُنہیں ٹریننگ

دیں گے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہاں جا کر توڑ پھوڑ کی کارروائیاں کریں گے ـــ ابھی یہ کام تھوڑے پیمانے پر ہو رہا ہے ـ جیسے جیسے حالات ہمارے حق میں ہوتے جائیں گے ہمارا کام آسان ہوتا چلا جائے گا ـــ بس یار! اتنا ہی کافی ہے ـ ہر بات سویلین کو نہیں جاننی چاہیئے ۔" بلاقی رام بڑی مکاری سے مسکرانے لگا ۔

خان نے مزید کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا ۔ اُس کے کلیجے میں ایک آگ سی لگ گئی تھی ۔ آج جو کچھ اُس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا اور اس سے پہلے جو کچھ معلومات اُسے حاصل ہوئی تھیں ۔ اُس کے بعد سے عجیب عجیب خدشات اُس کے دل و دماغ میں جڑ پکڑنے لگے تھے ۔

دشمن بڑی مکاری سے آہستہ آہستہ اپنی گرفت حالات پر مضبوط کر رہا تھا ۔ سرحدوں پر شرنارتھیوں کے کیمپ "گاڑ" دیئے گئے تھے ۔ ان کیمپوں میں نام نہاد شرنارتھیوں کو عالمی امداد سے حاصل کردہ خوراک کا صرف ایک تہائی حصہ دیا جاتا تھا ۔ بقیہ سب کچھ بھارت سرکار خود ہضم کر جاتی تھی اور "شرنارتھیوں" کا پیٹ زہر آلود پروپیگنڈے سے بھر دیا جاتا تھا ۔ یہ پروپیگنڈہ اس حکمتِ عملی سے کیا جا رہا تھا کہ بھولے بھالے بنگالی جان ہی نہ سکے اور بڑی سادہ لوحی سے اپنے دل دشمن کی مٹھی میں دیتے چلے گئے ۔

حالات ایسے نہیں تھے کہ وہ بلاقی رام کو مزید کریدنا شروع کر دیتا ـــ اُس لئے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا تھا مگر بلاقی رام نے پھر اسی ایشو پر بولنا شروع کر دیا تھا ـــ وہ اپنی معلومات کا رعب گانٹھنے کے چکر میں راز اُگلتا چلا گیا اور خان کے ذہن میں وہ سب نقش ہوتا رہا ، بلاقی رام "مظلوم بنگالیوں" کو بے تحاشا گالیاں دے رہا تھا ۔ وہ اُن کا ذکر بہت حقارت سے کرتا تھا :

بھارتی فوج کا ایک عام صوبیدار ہوتے ہوئے بھی اُس کی شدید خواہش تھی کہ "اکھنڈ بھارت" کا خواب پورا ہو جائے ـــ وہ راس کماری سے خیبر کی چوٹیوں تک کو

اپنے باپ کی وراثت سمجھتا تھا ۔

اُس نے جو سات آٹھ جماعتیں پڑھی تھیں اُن کے دوران ہی تاریخ کے ٹیچر نے اُس کے کانوں میں یہ زہر ڈال دیا تھا کہ موہنجو داڑو اور ٹیکسلا کی مدفون تہذیبیں اُسی کے آباؤ اجداد کی وراثت ہیں ۔

"اور ـــ اب اُس کے دل میں بہت سی خواہشیں جاگزیں ہو گئی تھیں : کہ وہ ان سب علاقوں کو جیسے بھی ممکن ہو "بھارت ماتا" کے تصرف میں لے آئے" اور یہی عزم لے کر وہ فوج میں گیا تھا ۔

لیکن ۶۵ء کی جنگ میں اُس نے اپنی فوج کی جو درگت پاکستانیوں کے ہاتھوں بنتے دیکھی تھی ۔ اُس کے بعد سے اُس کو یہ یقین بھی ہو چلا تھا : "کہ وہ کبھی اپنا خواب کبھی پورا نہیں کر سکتے تھے ۔"

صوبیدار بلاقی رام پورے درجے کا بے ایمان فوجی تھا ۔ اُس کے توسط سے سپلائی کی کینٹین اُس کے افسران کے گھروں میں پہنچتی تھی ۔ وہ بلا کا شراب نوش بھی تھا اور کوئی ایسی اخلاقی برائی نہیں تھی جس کا وہ شکار نہ رہا ہو ـــ لیکن وہ اندر سے مکمل ہندو تھا ۔ روزانہ نہیں تو ہفتہ بھر میں ایک مرتبہ ہی سہی وہ مندر میں ضرور جاتا تھا ۔ اُس کے جذبات بھی مسلمانوں کے متعلق وہی تھے جو ایک "ایماندار ہندو" کے ہونے چاہئیں ۔ وہ بھی اُسی دیو آگ کا شکار تھا جس کے شکار اُس کے باقی بھائی بند تھے ۔ اُن کا ایک ہی خواب تھا : پاکستان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا گھناؤنا ، مکروہ اور بھیانک خواب ۔

دوپہر کا کھانا دونوں نے بلاقی رام کے ساتھ اُس کے میس میں ہی کھایا تھا ۔ اُس روز واقعی اُس نے کھانا زہر مار کیا تھا ، حالانکہ اُس کا دل کھانے کی طرف دیکھنے کو بھی نہیں چاہتا تھا ، لیکن یہ اُس کے فرائض میں شامل تھا کہ اپنے جذبات کو اپنے اندر ہی مار دیا کرے ۔ اُسے لاشعوری طور پر بھی ایسی کوئی حرکت نہیں کرنی چاہیئے تھی جو اُس کی شخصیت

کو مشتبہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے بادلِ نخواستہ ہی سہی بلاقی رام کی ہاں میں ہاں بڑے جوش و خروش سے ملائی تھی۔

بلاقی رام کے ساتھ کیے گئے معاہدے میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ بِل کی ادائیگی جلد از جلد کروائے گا کیونکہ اپنی کمیشن کا بقیہ بھی اُسے اِسی صورت میں ملنا تھا۔

سہ پہر تک وہ بلاقی رام کے ساتھ رہے، پھر دہلی روانہ ہو گئے۔ میرٹھ سے دہلی تک خان سوچوں کے تانے بانے اُلجھاتا اور سُلجھاتا رہا ــــ ہر آنے والا لمحہ اُس کے لیے کوئی نہ کوئی بڑی خبر لے کر آ رہا تھا۔

اور وہ محض دِل کو یہ کہہ کر طفل تسلیاں دیتا رہتا:

"آخر وہ اِن منصوبہ بندیوں اور تیاریوں کی اطلاعات بروقت اپنے مُلک کو تو دے رہا ہے ــــ یقیناً وہ لوگ دشمن کی حکمتِ عملی جان کر اُس کے تدراک کے لیے عملی اقدامات کر رہے ہوں گے۔"

○

بلاقی رام قریباً روزانہ ہی کسی نہ کسی کام سے دہلی آیا کرتا تھا اور اپنے بِل کی وصولی کے سلسلے میں خان نے بھی اُس سے دو تین ملاقاتیں ضرور کیں، لیکن بِل کی وصولی تو ایک بہانہ ہی ہوتا تھا اصل میں تو وہ مُکتی باہنی کی میرٹھ اور دوسری چھاؤنیوں میں ٹریننگ ہی کی معلومات اُس سے اگلواتا رہتا تھا۔ اور اِس دوران یہ ــــ اُس کا معمول بن چُکا تھا کہ وہ ہر دوسرے دن اِن معلومات پہ مبنی رپورٹ اپنے مُلک ضرور بھیجا کرتا۔

بلاقی رام ہی کے تعاون سے اُنہوں نے دو اور نئے ٹنڈر بھی داخل کر دیے تھے۔ بِل وصول ہونے پر اُس نے سب سے پہلے بلاقی رام کو اُس کے حصّے کی کمیشن ادا کی تھی۔ اور اب ایک درمیانی سی موٹر سائیکل بھی اِن لوگوں نے خرید لی تھی جو زیادہ تر کشور کے تصرّف ہی میں رہنے لگی تھی۔

اخبارات نے کئی روز تک تو بالی کی خوب درگت بنائی تھی ــــ اب وہ ہسپتال سے [illegible] آ چکا تھا۔ کیونکہ ڈاکٹروں نے اُس کا پاؤں جوڑنے سے معذرت کر لی تھی۔ اُن کے نزدیک اب اُس کا علاج ممکن ہی نہیں رہا تھا۔ بالی نے شرمندگی کے مارے گھر سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا اور اُس کو کمزور دیکھ کر پولیس نے بھی اپنے سابقہ ارمان پورے کر لیے تھے: اُس کے ایک ایک ساتھی کو گرفتار کر لیا گیا تھا۔

رجنی سے خان کی ملاقات کتنے ہی دِنوں کے بعد ہوئی تھی اُسی کی زبانی اُسے علم ہوا: [illegible] پاکستانی فوج کے کچھ افسر بھاگ کر یہاں آئے ہوئے ہیں اور اُن میں سے کچھ "را" کے مرکزی [illegible]میں توڑ پھوڑ کی تربیت بھی حاصل کر رہے ہیں ــــ اِن افسران کا دل بہلائے رکھنے اور [illegible] بھارت کا دوست بنائے رکھنے کے لیے اُن میں سے ہر ایک کے ساتھ "را" کی تربیت یافتہ [illegible] تربیت ایک ایک لڑکی کو بھی چپکا دیا گیا ہے۔

اُس روز جب خان پہلی مرتبہ رجنی کو موٹر سائیکل کے پیچھے بٹھا کر "وسنت وہار" "را" [illegible] ٹریننگ سکول میں چھوڑنے گیا تو دروازے سے اچانک ہی اُس نے رجنی کے ساتھ ایک [illegible] آفیسر کو نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ جو اُسے دیکھتے ہی گولی کی طرح سیدھا اُس کی طرف آیا۔ [illegible] نے "میجر کبیر" کہہ کر اُس کا تعارف اپنے بھائی سے کروایا اور بضد ہوئی کہ خان اندر آئے [illegible] خان اندر نہ آیا۔ اُس نے ضروری کام کا بہانہ کر دیا تھا۔ اِسی طرح دو تین مرتبہ وہ رجنی کو [illegible] کے بہانے یہاں تک آیا اور اُس کے بضد ہونے پر بھی اندر نہ گیا: آخر وہ کوئی کچّی [illegible] کرنا نہیں چاہتا تھا۔

○

چند ہی روز بعد ایک دن تینوں نے اکٹھے فلم دیکھنے کا پروگرام بنایا اور رجنی نے خان [illegible] است کر دی کہ وہ اُسے دفتر سے لے آئے ــــ کشور سے موٹر سائیکل مستعار لے کر وہ [illegible] دفتر پہنچ گیا۔

رجنی نے گیٹ پر ہی اُس کی آمد کی رپورٹ کر رکھی تھی۔ ایک سیکورٹی گارڈ اُسے بڑے احترام سے ایک سجے سجائے کمرے میں لے گیا۔ کمرے کے ایک کونے میں اُسے وہی میجر شراب پیتا نظر آ گیا۔ خان نے اس طرح نظریں پھیر لیں۔ گویا اُسے جانتا ہی نہیں۔ رجنی نے انٹرکام پر اُسے بتایا کہ وہ دس پندرہ منٹ بعد "کامن روم" میں آ جائے۔ اب یہ ٹائم اُسے بہرحال اس میجر کے ساتھ گزارنا تھا جس نے خان کو پہچان کر اچانک ہی اُس کے نام کا نعرہ لگا کر اُسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"میرا نام میجر کبیر ہے"۔ اُس نے خان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میرے نام کا تو آپ کو علم ہو ہی گیا ہو گا"۔۔۔ خان نے اپنا لہجہ خاصا سنجیدہ کر لیا تھا۔

"ہاں رجنی آپ کی بہت تعریف کرتی رہتی ہے"۔

"پچھتائے گی ایک دن۔ میری تعریف کرنے والا کبھی خوش نہیں رہتا"۔ خان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

جواب میں کبیر نے بھی بڑے بے ہودہ انداز میں ہنسنا شروع کر دیا۔ خان کو تو اس کی موجودگی ہی کھل رہی تھی۔ لیکن وہ اپنے بزنس کے اصولوں پر بڑی سختی سے کاربند تھا۔ اُس کے ذاتی جذبات یہاں کچھ معنی نہیں رکھتے تھے۔

"کون سا شہر تھا آپ کا"۔۔۔ خان نے گفتگو کا سلسلہ آگے بڑھایا۔

"کھلنا ۔۔۔ میں اُدھر کھلنا کے نزدیک ایک گاؤں کا رہنے والا ہوں"۔ اُس نے خان کو بتانا شروع کیا۔

"آپ نے بڑی دلیری دکھائی "بنگلہ دیش" کے لیے آپ کیا کر رہے ہیں سُنا ہے پاک فوج بہت مضبوط ہے"۔ خان نے اُسے ٹٹولنا چاہا۔

"مسٹر کمار میرا تعلق بھی اُسی فوج سے رہا ہے، واقعی وہ بہت بہادر فوج ہے لیکن ہماری پلاننگ اتنی زبردست ہے کہ اِس سے سو گنا زیادہ بہادر فوج بھی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

آپ نہیں جانتے کہ ہر بہادر آدمی کی ایک بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے"۔ اُس نے شراب کے پیگ سے ایک گھونٹ بھرا۔

خان خاموش رہا۔ وہ اُسے زیادہ سے زیادہ بولنے کا موقعہ دینا چاہتا تھا تاکہ حقائق زیادہ سے زیادہ اُگلوا سکے۔ وہ خاموشی اور انہماک سے میجر کبیر کو دیکھتا رہا۔

"ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا" کہ ہر بہادر آدمی کی ایک بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے"۔ کہ وہ بوڑھوں، بچوں اور عورتوں پر ہاتھ نہیں اٹھاتا۔ اور مسٹر ارون کمار ۔۔۔ یہی ہمارے ہتھیار ہیں۔ ہماری حکمتِ عملی یہی ہے کہ ہم نے اُن کی اس کمزوری کی آڑ میں خود کو چھپا کر رکھنا ہے اور ہمارے اِس حملے کا توڑ پاکستانی فوج کے پاس نہیں ہے۔ ویسے یوں بھی اَن دیکھے دشمن کا مقابلہ کون کر سکتا ہے؛

اُس نے ایک اور لمبا گھونٹ بھرا اور ہچکی لے کر خان کی طرف جُھک گیا۔ خان کو اُس سے کراہت آنے لگی تھی۔ شراب کی بدبُو کے بھبھوکے اُس کے مُنہ سے اُٹھ رہے تھے لیکن خان نے اپنے چہرے پر ناگواری کا کوئی تاثر نہ اُبھرنے دیا۔ وہ ہمہ تن گوش اُس کی گفتگو سن رہا تھا۔

"میں زیادہ باتیں نہیں کرتا کمار! تم خود ہی سب کچھ دیکھ لو گے۔ اس کھیل کو اب ختم ہی سمجھو مسٹر کمار! بس چند دنوں کی اور بات ہے پھر ہم ہوں گے اور ہمارا "بنگلہ دیش" ہو گا"۔

"ایک بات تو بتاؤ مسٹر کبیر! اگر دُنیا کو اس بات کا پتہ چل گیا کہ یہ سب کچھ بھارت کے اشارے پر ہو رہا ہے تو ہم بین الاقوامی دنیا میں بدنام ہو جائیں گے۔ ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے لائق بھی نہیں رہیں گے"۔ اُس نے کبیر کو مزید کُریدنا چاہا۔

"کمار جی! مجھے تو آپ کے ہندو ہونے پر شک ہے۔ میں نام ہی کا سہی بہرحال مسلمان ہوں اور چند مہینے آپ ہی کے ہم قوم لوگوں میں گزارنے کے بعد یہ جان گیا ہوں؛

"کہ ضمیر نام کی کوئی شے ہمارے ہاں نہیں پائی جاتی ـــــ بھئی شرمندگی کس بات کی؟ یہ تو سیاست کا کھیل ہے منافقت اور جھوٹ کا کھیل! یہ دُنیا اُسی کی ہے مسٹر کمار جو زیادہ صفائی سے، زیادہ بہتر طریقے سے جھوٹ بول سکے اور اُسے سچ ثابت کر کے دکھا دے۔" شراب کا خالی پیگ ایک طرف رکھ کر اُس نے سگریٹ سلگایا۔

"مسٹر ارون کمار! اگر تھوڑی دیر کے لیے آپ کی بات مان ہی لی جائے تو بھی آپ کو تو علم ہوگا ہی کیونکہ آپ کی بہن بھی اسی دفتر میں کام کرتی ہے۔ بین الاقوامی سطح پر جو لوگ یہ کام کر سکتے ہیں ـــــ اُن پر ہم نے پہلے ہی جال پھینک دیا ہے۔

مسٹر کمار! پاکستان کے ہر سفارت خانے میں ہماری لڑکیاں پہنچ گئی ہیں۔ بنگلہ دیش کی ہر وہ چھاؤنی جہاں بنگالی یونٹیں قیام پذیر ہیں وہاں "را" کی تربیت یافتہ ایجنٹ عورتیں اپنا کام کر رہی ہیں مسٹر کمار!" اُس کی آواز اب نشے میں ڈگمگانے لگی تھی! "یہ بڑی زہریلی لڑکیاں ہیں۔ ناگن ہیں ناگن۔ جس پر ایک مرتبہ پھونک دیں وہ اس کے زہر سے نکل نہیں سکتا۔"

خان نے محسوس کیا جیسے میجر کبیر خود بھی کسی ایسی ہی ناگن کا شکار ہو کر "را" کے اس دفتر تک پہنچا ہو۔ آخری فقرہ بولتے ہوئے اُس کا لہجہ خاصا گھمبیر ہو گیا تھا۔

"اچھا مجھے جانا ہوگا رجنی میرا انتظار کر رہی ہوگی" ـــــ خان نے محسوس کیا تھا کہ اب یہ "آوٹ" ہو جائے گا۔ میجر کبیر نے اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے چوتھا پیگ بھی تیار کر لیا تھا۔

میجر کبیر اُسے روکتا ہی رہا لیکن خان اُس کے "خلوص کو ٹھکرا" کر آ گیا۔ کامن روم کے باہر ہی اُسے رجنی نظر آ گئی۔

"کہاں رہ گئے تھے آپ؟" اُس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

"جہنم میں۔ وہ تمہارا بنگالی دوست مل گیا تھا" خان نے بوریت ظاہر کی۔

"ارے بھیا! آہستہ بولو۔ بھگوان کے لیے کہیں کوئی سُن نہ لے۔"

"یہ تو ہے بھئی۔" "تم انٹیلی جنس والے آخر انہیں مُفت کی روٹیاں کھلانے سے تو رہے۔"

"اچھا چھوڑیئے اس بک بک کو۔ صبح سے رات تک یہی سُننا اور کرنا پڑتا ہے۔ کم از کم آپ تو اس موضوع کو نہ چھیڑا کریں۔" رجنی نے گفتگو سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہا۔

"دیکھو بھئی مجھے تو ویسے بھی ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن اپنی بہن جو اس گورکھ دھندے میں پھنسی ہے تو اس سے غیر متعلق تو نہیں رہا جا سکتا ناں۔"

"پھر وہی بات....." رجنی نے کانوں میں انگلیاں ٹھونسیں۔

"اچھا جانے دو ـــــ آؤ چلتے ہیں" ـــــ خان نے اُس کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔ دونوں بڑی بے تکلفی سے چلتے ہوئے دروازے سے باہر آ گئے۔ دروازے پر متعین گورکھا گارڈ نے آج پھر خان کو بڑی حسد بھری نظروں سے دیکھا۔



رجنی کو ساتھ لے کر وہ گھر چلا آیا۔ موٹر سائیکل کشور کو شکریہ کے ساتھ واپس کر کے وہ تینوں ـــــ رما، رجنی اور خان سینما ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔

فلم نئی تھی اور خاصی دلچسپ بھی لیکن خان کے لیے تو اس میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔

اُسے تو ایک ہی سوچ کھائے جا رہی تھی: مستقبل کی سوچ۔

ـــــ جب وہ چشمِ تصور سے اپنے مشرقی پاکستان کی موجودہ حالت پر نظر ڈالتا تو اس کی نسیں ٹوٹنے لگتیں اُسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگتا۔ بس ایک اُمید تھی کہ جو کبھی اس گھور اندھیرے میں اُس کے لیے شمع بن کر اُجالا پھیلانے لگتی وہ سوچتا: آخر سب ہی بنگالی تو ایسے نہیں؛ اور پھر دوسرے ہی لمحے اُس کے دل سے ہوک

سی اٹھنے لگتی، "آخر ایسے وہ کتنے لوگ ہیں؟"

"آٹے میں نمک کے برابر بھی اِن کی تعداد نہیں! ان کے بھائی بند ہی انہیں مار ڈالیں گے۔"

وہ خود کو مطمئن کرنے کے لیے اپنے آپ سے کہنے لگتا۔

○

رجنی کے اندر سوئی ہوئی عورت کو اُس نے بھائی کا پیار دے کر ہی جگا دیا تھا۔

خان محسوس کرنے لگا تھا کہ واقعی رجنی اُسے اپنا سگا بھائی تصوّر کرنے لگی تھی۔ وہ اُس کی ضروریات کا اتنا خیال رکھتی تھی۔ اُس کو اتنا احترام دیتی تھی کہ خان کو گھبراہٹ سی محسوس ہونے لگتی۔ وہ سوچتا: "آخر تو اُسے اپنے مُلک واپس چلے جانا ہے۔ جانے کب اُسے اگلا حکم موصول ہو، اور وہ اپنا بوریا بستر گول کر جائے۔ تب رجنی اور رَما پر کیا گزرے گی؟ خود وہ لاشعوری طور پر رَما کے اتنا قریب آچکا تھا کہ اب وہاں سے واپسی کا تصوّر ہی اُس کے لیے جان لیوا تھا۔

اُن کے ایک ہمسائے جن کے ہاں ٹیلی فون بھی موجود تھا یہاں سے گھر شفٹ کر کے جا رہے تھے۔ خان نے پچھلے آٹھ دس روز سے سہائے کو اُن کے پیچھے لگایا ہُوا تھا کہ اُن لوگوں سے ٹیلی فون خرید لیا جائے۔ اُس روز جب وہ لوگ فلم دیکھ کر گھر واپس لوٹے تو خان کے لیے خوشخبری موجود تھی کہ مسٹر سہائے نے بالآخر دو ہزار روپے پر سودا طے کروا دیا تھا۔ اس دوران اُن لوگوں نے ایک اور ایٹم بھی سپلائی کر دی تھی اور گھر میں اتنا منافع آنے لگا تھا کہ اب یہ سب کچھ گھر کے لیے ضروری سمجھا جانے لگا تھا۔ کشور اور آشا نے تو ابھی سے بہت کچھ سوچنا شروع کر دیا تھا۔

خان کا یہ معمول بن چکا تھا کہ وہ تین چار روز بعد کسی نہ کسی بہانے رجنی کے دفتر کا چکر ضرور لگا لیتا تھا ـــــ رجنی کی سہیلیاں اور اُس کے دوست اب خان کو رجنی کے بھائی کی حیثیت سے جاننے لگے تھے۔ رجنی اِس دفتر کی ہر دلعزیز شخصیت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اُس کے ساتھیوں نے خان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

خان نے اپنی آنکھوں سے یہاں بھی غدّار بھگوڑوں کو تربیت حاصل کرتے دیکھ لیا تھا۔ یہ اُس کا کمال تھا کہ اُس نے اُن لوگوں کی تصاویر بھی حاصل کر لی تھیں اور کسی کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہونے دی تھی۔ پھر یہ تصاویر بھی اُس کے مُلک میں محفوظ ہاتھوں تک مُنتقل ہو گئیں۔

اُس روز وہ رجنی بہن سے مل کر گھر واپس لوٹا تھا جب تھوڑی دیر بعد اُس کے لیے ٹیلی فون آگیا! ان تین چار ماہ میں اُس نے دہلی میں پانچ دس ایسے دوست بنا لیے تھے جو اُسے فون کر سکیں ـــــ اس طرح وہ اپنی دانست میں گھر والوں کو بھی کسی قسم کا شک کرنے کا موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔

ٹیلی فون اُس نے خود ہی اُٹھایا تھا۔ دوسری طرف ارون کمار کے لیے ہی فون تھا۔ جب خان نے بتایا کہ وہی اُرون کمار ہے تو جواب میں جو نام فون کرنے والے نے بتایا اُس پر وہ خاصا محتاط ہو گیا۔ اُس نے ٹیلی فون کا یہ چکّر ہی اس لیے چلایا تھا کہ بجائے خود فون کرتے رہنے کے یہیں پر "معصومانہ انداز" میں پیغامات وصول کر لیا کرے۔

دوسری طرف بولنے والے نے اپنا اطمینان کرنے کے لیے خان سے کوڈ ورڈز کا تبادلہ کیا اور جب اُسے یقین ہو گیا کہ واقعی اُس کا مخاطب اُرون کمار ہی ہے تو اُس نے خان تک تازہ احکامات پہنچا دیئے: "اب اُسے تین روز بعد اگلے مشن پر روانہ ہونا تھا۔

○

اگلے روز رَما کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش تھی۔ رَما تو اِس کے لیے بالکل تیار نہ تھی، یہ بھی خان ہی تھا جس نے اُس سے زبردستی یہ سب کچھ کروا لیا تھا۔ یہ نمائش اُس کے کالج

Best way to Pay

یں ہی لگی تھی۔ دونوں اکٹھے ہی کالج پہنچے تھے۔

اُس روز خان نے محسوس کیا: کہ رُما واقعی کوئی غیر معمولی لڑکی ہے ـــــ خدا جانے یہ اُس کی محبّت کا اثر تھا یا پھر رُما کے اندر موجود آرٹسٹ کی کرامت کہ خان بھی ان تصاویر پر ایک نظر ڈال کر تو دنگ ہی رہ گیا! حالانکہ یہ سب پینٹنگز رُما نے اُس کے سامنے اُس کی موجودگی ہی میں تیار کی تھیں لیکن آج جب اُنہیں باقی آرٹسٹوں کی بنی ہوئی پینٹنگز کے مقابلے میں لگایا گیا تو اُن کی انفرادیت چیخ چیخ کر اپنے بنانے والے کی عظمت کی گواہی دے رہی تھی۔

خان کو یوں محسوس ہوا جیسے فضاؤں میں موجود سارا حُسن رُما کی انگلیوں کے راستے کینوس پر پھیل گیا ہو۔ وہاں موجود ہر شخص رُما کی تعریف کر رہا تھا۔ ہر نوجوان اپنی پینٹنگز کی طرح خوبصورت اس آرٹسٹ لڑکی سے دو باتیں کرنے کا متمنّی تھا لیکن وہ سوائے خان کے کسی کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ خان نے وہاں کئی آنکھوں میں اپنے لیے رشک اور حسد کے ملے جُلے جذبات موجزن دیکھے۔ اُسے خود پر فخر ہونے لگا کہ رُما جیسی لڑکی اُس کی محبوبہ ہے۔ احساسِ تفاخر سے اُس کے اندر ایک عجیب اور پُراسرار سا طمانیت کا احساس اُبھرا۔

اُس لمحے خان نے سوچا: "زندگی کا سارا لطف اِسی پُراسراریت کا مرہونِ منت ہی تو ہے جو ایک خاص نوع کی بے یقینی کی صورت سے جنم لیتا ہے اور نگاہوں سے آگے بے یقینی کی دُھند اگر صاف ہو جائے تو حقیقت ہمیشہ مایوس کُن انداز ہی میں ظاہر ہوتی ہے ـ اِسی لیے تو ہماری مجسّم اور مجرّد دونوں طرح کی شخصیتیں کبھی بھی اِس المناک صورتِ حال سے دوچار نہیں ہوتیں۔ جس سے موت یا مایوسی کا روایتی تصوّر وابستہ ہو۔"

اُسی روز جب سہ پہر کے بعد وہ رُما کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے جمنا کے کنارے ایک خوبصورت تفریح گاہ میں زندگی کے لُطف سے حُسن اندوز ہو رہا تھا تو اُسے یہ ادراک بھی ہوا کہ

جُدائی اور موت ہی زندگی کا سب سے بڑا المیہ نہیں ہے۔"

اُس نے سوچا: دراصل زندگی ہی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے۔

ـــــ زندگی کا آغاز تو دُمیدہ کلیوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ دُھلے دُھلائے پھول چہرے، جسم و روح، حالات و واقعات کی خراشوں سے پاک صاف اور مُستقبل کے پہاڑوں کے دامن میں رواں دواں زندگی کی چاندی ایسی لکیر جس میں کوئی خم دکھائی نہیں دیتا! ہم خوش و خرّم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اس کے کنارے کی جانب بڑھتے چلے جاتے ہیں۔

پھر آہستہ آہستہ ہاتھوں سے ہاتھ جدا ہونے لگتے ہیں۔ قدموں کے زاویے ٹیڑھے ہونے لگتے ہیں۔ حیات نئے دائرے بنانے لگتی ہے ـــــ یادوں کی رَیت پہ چہروں کے بننے مٹنے کا عمل تیز اور پھر تیز تر ہونے لگتا ہے۔

دونوں دریا کے کنارے پتھروں پر بیٹھ گئے۔ دونوں نے پائنچے اُوپر چڑھا رکھے تھے اور پانی میں پاؤں لٹکائے ایک دوسرے میں گم صم بیٹھے تھے۔ رُما کبھی کبھی کوئی کنکر پانی میں پھینکتی تو وہاں دائرے سے بننے اور مٹنے لگتے۔ دائرہ حرکت میں آتا تو خان کو ماضی کی کہانی متحرک تصویروں کی صورت اِس میں نظر آنے لگتی وہ چند لمحوں میں پوری زندگی بسر کر جاتا ـ!

تصوّرات کی پرچھائیوں پر جب حقائق کی تلخیاں غلبہ پانے لگتیں تو اُسے یاد آنے لگتا: "کہ بالآخر رُما اُس سے چھُٹ جائے گی۔" اور یہ خیال آتے ہی خان کو یوں لگتا جیسے کوئی چیز اُس کے اندر مر گئی ہو۔ یہ مراجعت کا لمحہ ہوتا۔

ممکن تھا کہ لمحہ طویل ہو کر اُس کے روحانی ارتقاء کے تسلسل کو توڑ ڈالتا جب رُما نے اُسے اپنی طرف مخاطب کر کے حالات کے تانے بانے سے باہر کھینچ لیا۔

"کیا سوچ رہے ہیں آپ؟ صُبح سے کیا سوگواری خود پہ طاری کر رکھی ہے آپ نے ـ؟"

"کچھ نہیں کوئی بات نہیں۔ بس ایسے ہی آج کچھ....." اُسے ڈھنگ کی بات سُوجھ ہی

نہیں رہی تھی ۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُسے کیا جواب دے ۔" رُما بس کسی وقت ایسا ہو جاتا ہے ۔ تم تو جانتی ہو نا جیسے وقت ایک سا نہیں رہتا ۔ اِس طرح انسان کا موڈ بھی ایک طرح کا نہیں رہتا ۔"

وہ خاموش ہو کر پھر دریا کے تڑپتے پانی کو گھورنے لگا تھا ۔

"ارون کمار جی !" رُما نے اُس کی طرف جھکتے ہوئے کہا ۔" آپ کچھ نہ بتائیے لیکن جمنا سب کچھ جانتی ہے ۔ دریا کے پانی سے بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے ___ کمار جی ! میں جب کبھی بہت اداس ہوتی تھی تو یہیں انہی پتھروں پر آ کر بیٹھ جایا کرتی تھی ۔ اِس جگہ مجھے ایک سنیاسی نے بہت راز کی بات بتائی تھی ۔ جس کے بعد سے میں نے اُداس ہونا ہی چھوڑ دیا ۔"

"کیا ؟" ___ خان چونکے بغیر نہ رہ سکا ۔

"اُس نے کہا تھا : کہ دریا کے اندر بھی ایک پیغام چھپا ہے ۔ اِسے سمجھنے کی کوشش کرو ! اس کا پانی یہی کہتا ہے ___ کہ وقت بجائے خود کوئی وجود ہی نہیں رکھتا ۔"

"ہاں رُما ۔" خان نے اُس کی ٹھوڑی کو اپنی انگلی سے چھُو کر اپنی طرف مخاطب کیا ۔

"تم بھی دریا ہی کی مانند ہو ۔ تم میرے ذہن میں دریا کی طرح ایک ہی وقت ہر جگہ موجود رہتی ہو ۔ جیسے دریا اپنے منبع پر ، اپنے دہانے پر ، آبشار کی صورت اور پتن پر اپنی امواج میں ، سمندر پر ، پہاڑوں پہ غرض ہر جگہ اپنا وجود برقرار رکھتا ہے اور اس کے لیے وقت صرف حال کی صورت میں وجود رکھتا ہے اِس طرح تمہاری محبت پر بھی نہ ماضی کا سایہ ہے نہ مستقبل کی پرچھائیاں ۔ بس تمہاری محبت کا دریا بھی میرے اندر بہتا چلا جا رہا ہے ۔ اب تو میں اِسکی طغیانیوں میں بہہ کر اس کا ایک حصہ بننے لگا ہوں رُما ۔" اُس کی آواز کچھ بوجھل ہونے لگی تھی ۔

خود رُما بھی خاصی سوگوار ہو چلی تھی ۔ جذبات کی شدت سے خوشیاں اور غم دونوں ہی تو

لوٹے اُٹھتے ہیں ۔ دونوں اس بات پر یقیناً مطمئن تھے کہ اتنے حساس ہونا بھی بہرحال بھرپور زندگی کی علامت ہے ۔

رُما نے پہلے لاشعوری طور پر اور اب مکمل شعور اور ادراک کے بعد خان کو اپنی ڈھال سمجھنا شروع کر دیا تھا ۔ اُس نے جس شہزادے کی آمد کا خواب دیکھا تھا وہ اُس کی زندگی میں ایک مجسّم حقیقت کی شکل میں نمودار ہوا تھا ۔

وہ پیدائشی آرٹسٹ لڑکی تھی ۔ بہت نازک خیال اور حساس ! وہ چیزوں کو مکمل واقعیت کے ساتھ محسوس کیا کرتی اُس نے خان کو بھی اپنے تمام تر محسوسات کے ساتھ چاہا تھا ۔ اُس کے مذہب اور معاشرے نے اُسے "پتی ورتا" کا جو تصور دیا تھا ۔ وہ خان کو اُس پر پورا اُتر کر دکھانا چاہتی تھی ۔ اُس نے اپنے دل کے معبد میں کسی بہت ہی محفوظ اور متبرک مقام پر خان کا بُت سجا لیا تھا اور اب اِس پوجا ہی سے اپنا جیون بلیدان کرنا چاہتی تھی ۔

یہ بات اُس کے دل میں جاگزیں ہو چلی تھی کہ خان جلد یا بدیر اُس کا پتی بن جائے گا ۔ اُس کا دھرم تھا کہ جس طرح ٹوٹ کر وہ ارون کمار کو پوجتی ہے اگر بھگوان کرشن کو بھی پوجے تو وہ بھی کسی نہ کسی رُوپ میں دوبارہ زمین پر جنم لے کر اُس کے پاس چلا آئے گا ۔ اُسے اپنی محبت پر اتنا ہی یقین تھا جتنا اگلے روز سورج کے طلوع اور پھر غروب ہونے پر ۔ اُس کے جذبے کی یہی شدت خان کو اندر سے توڑنے لگی تھی ۔ وہ سوچنے لگتا : "کہ جب اچانک اِس لڑکی کو علم ہو گا کہ اُس سے محبت کے بجائے فریب کیا گیا تھا اور جسے وہ اب تک زندگی کی سب سے بڑی حقیقت سمجھتی آئی تھی وہ تو ایک سُراب سے زیادہ کچھ نہیں تھا ۔ تب اِس پر کیا گزرے گی ۔

"رُما ایک بات بتاؤ ___ ؟"

اُس روز اُس نے ریتلے ساحل پر پیروں کے نشان چھوڑتی رَما کو اچانک ہی روک کر اُس کے دونوں کندھے تھام کر اپنی طرف مخاطب کیا اور اُس کی گہری جھیل جیسی آنکھوں میں جھانک کر دریافت کیا: "اگر میں ہندو نہ ہوتا تو بھی تم مجھ سے اسی طرح محبت کرتیں؟"

اپنے سوال پر وہ خود بھی ایک مرتبہ تو گڑبڑا گیا۔ نجانے کس طاقت نے یہ سوال اُس کے مُنہ سے اُگلوایا تھا۔ اُس نے دیکھا رَما کی سمندر آنکھوں میں کوئی بے چینی کی لہر نہیں دوڑی۔ اُس کے شانت چہرے پر کوئی رنگ نہیں بدلا تھا۔ وہ اُسی طرح پُرسکون تھی جس طرح اُس کے ہاتھوں سے کینوس پر منتقل ہونے والی لڑکیوں کے پورٹریٹ!

"اردن! مجھے یہ تو علم نہیں کہ میرے جذبے کی شدّت میں کہاں ایسی کمی رہ گئی ہے جو تم نے مجھ سے یہ دریافت کیا؟ لیکن شاید تم جلد محسوس کر لوگے کہ اَب میں اُس منزل سے گزر چکی ہوں جہاں انسان کی اپنی کوئی حیثیت، کوئی سوچ باقی رہ جاتی ہے۔ میں تو اب خود کو تمہاری ذات کا ایک حصّہ جاننے لگی ہوں۔ میری ذات تو اب کچھ رہی ہی نہیں۔ مجھے اس سے کیا تم کون ہو۔ کون نہیں ہو! بس مجھے تو تمہارا سایہ بن کر تمہارے ساتھ لگے رہنا ہے۔ دھوپ میں بھی، چھاؤں میں بھی۔ اُجالے میں بھی، اور اندھیرے میں بھی —!!

اور — اگر زندگی میں کبھی کوئی ایسا وقت آ ہی گیا جب ہمیں اپنی شناخت تلاش کرنا پڑی تو اس سفر پر آپ اکیلے ہی جائیں گے۔ میں تو آپ ہی کو اپنی پہچان جانتی ہوں —"

اُس کے لہجے میں ایک ٹھہراؤ، اعتماد اور وقار تھا۔ ایسا لہجہ جو دل کی گہرائیوں میں سچ کی طرح اُترتا چلا جائے۔ اُس روز خان کو احساس ہوا: جیسے نادانستگی میں اس لڑکی سے ٹکرا کر اُس سے اپنی زندگی کا سب سے بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہو — بہرحال اُس نے سوچا اب تو اسے خود کو حالات کے بہاؤ پر پھینک دینا ہوگا۔ جانے اگلا جھونکا اُسے کہاں لے جائے؟

اُس نے آج تک اپنے اندر لاکھ خواہش پیدا ہونے کے باوجود رَما کے جسم کو چھُو کر بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اُس روز عالمِ وارفتگی میں جانے وہ ہوش و خرد کی کتنی منزلیں عبور کر گیا۔ شاید یہ اُس کی زندگی کا کمزور ترین لمحہ تھا۔ جب اُس نے تڑپ کر رَما کی دھڑکنوں کو اپنے دل میں سمو لیا۔

سورج دونوں کے عقب میں جمنا کے پانیوں میں اُترنے لگا تھا۔ دن بھر کے تھکے ہارے پنچھی ڈاروں اور قطاروں کی صورت دریائی لہروں پر کانپتی سورج کی کرنوں کے بیچوں بیچ پرواز کرتے اپنے اپنے آشیانوں کی طرف گامزن تھے۔ خنکی بڑھنے لگی تھی۔ رات نے اُجالے اپنے دامن میں نگلنے شروع کر دیے تھے۔ دونوں بہت دُور تک پیدل چلتے چلے گئے۔ ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے۔ دونوں ہی کا دل یہی چاہتا تھا کہ وقت کی نبضیں تھم جائیں اور زندگی یہیں ساکت ہو کر رہ جائے۔ کافی دُور جا کر انہوں نے ٹیکسی پکڑی۔

وطن کی مٹّی گواہ رہنا

اُس وقت شام اُتر رہی تھی جب وہ واپس گھر پہنچا ——

گھر پہنچنے پر خان کو علم ہوا کہ بلاقی رام کی طرف سے ایک اور لمبا آرڈر ملنے کی خوشخبری سنائی گئی ہے اور مسٹر سہائے اُس کے گھر مٹھائی کا ڈبّہ لے کر گئے ہیں۔

خان کے لیے اِن باتوں میں اطمینان کا صرف ایک پہلو نکلتا تھا، کہ اُس کا کور مضبوط ہوتا جا رہا ہے اور یہی اُس کی کامیابی تھی! اُسے جو کچھ بھی کرنا تھا۔ اِس گھر کی آڑ لے کر کرنا تھا —— اُسے اُمید تھی کہ جتنا مضبوط بیس اُس نے بنا لیا ہے اب کسی کی جرأت نہیں کہ اُس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ سکے۔

لیکن، گھر آتے ہی ایک اُلجھن اُس پر بُری طرح سوار ہو گئی: "وہ کس طرح گھر والوں کو مطمئن کرے کہ وہ کل باہر جا رہا ہے؟"

اور سوچتے سوچتے آخری اُس نے ایک ترکیب نکال لی ——

اتنی دیر میں رُما آئی تو وہ حیران رہ گئی، خان سر پکڑے گہری سوچوں میں گم تھا!

اُسے دیکھتے ہی وہ پریشان ہو گئی:

"خیریت تو ہے ناں۔"

"خیریت کہاں،" خان بولا: "آج بازار جا رہا تھا کہ ایک واقف مل گیا۔ بتانے لگے کہ گاؤں میں ایک عزیز سُرگباش ہو گئے ہیں —— وہاں کل جانا ہے۔"

"قریبی رشتہ دار تھے وہ؟" رُما بولی۔ "تو پھر آپ ضرور ہو آئیں۔"

اُس نے ایک نظر رُما پر ڈالی اور خاموش رہا۔

اِس مرتبہ اُسے جو مہم سونپی گئی تھی وہ ممکن ہے کسی اور کی نظر میں بہت خطرناک ہو لیکن خان نے اُسے معمول کے مطابق لیا: اُسے منوہر لال کے ساتھ انبالہ ایئر بیس سے وہ "کوڈ بُک" چُرانی تھی جس پر بھارتی فضائیہ نے پاکستان پر مستقبل میں حملوں کی منصوبہ بندی کی تھی اور مختلف حملوں کے لیے مختلف کوڈ نام "تجویز کیے تھے! اِس کوڈ بُک میں وہ تمام آپریشنز درج تھے جن کی ممکنہ جنگ کی صورت میں بھارتی فضائیہ نے تیاری کی تھی۔

خان کے پاس اِس علاقے میں ایک ہی کام کا مہرہ تھا اور وہ تھا اُس کا برادرِ اکبر کارپورل اجے ساہنی۔

اپنے آنے والے ساتھی کا تعارف بھی اُس نے منوہر لال سے "نئے ماسٹر" کی حیثیت سے کروانا تھا اور اِس کے بعد اُسے ہمیشہ کے لیے پردہ سکرین سے اجے ساہنی کی حد تک ہٹ جانا تھا اور —— پھر اجے ساہنی کی تمام ڈیلنگ اُس کے نئے ساتھیوں سے ہونی تھی۔



اِس نئے دوست سے اُس کی ملاقات بھی انبالہ ہی کے ریلوے اسٹیشن پر مقرر کی گئی تھی۔

جب دوپہر کے بعد وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو اپنی پہچان کروانے کے لیے اُس نے راجپوت ٹھاکروں کے انداز میں سر پر ایک خاص رنگ کی پگڑی باندھ رکھی تھی اور ہلکے رنگ کے سوٹ پر بھی پیلے رنگ کا گلاب کا پھول سجا رکھا تھا۔ وہ ریل گاڑی کی ایئر کنڈیشن کلاس سے برآمد ہوا تھا —— آنکھوں پر سنہرے فریم والی رنگ دار

شیشوں کی عینک سجائے واقعی وہ کوئی ٹھاکر مہاراجہ نظر آ رہا تھا۔

اُس کے بریف کیس پر دُنیا کی ایک بڑی ائر لائن کا سٹیکر بڑا نمایاں نظر آ رہا تھا۔

مسافروں کے وہاں سے ہٹ جانے تک خان وہیں ایک کونے میں کھڑا رہا۔ اُس نے جان بوجھ کر کھڑے رہنے کے لیے ایسی جگہ مُنتخب کی تھی جہاں پلیٹ فارم کے اوپر سے گزرنے والے کو ـــ وہ نمایاں دکھائی دے سکے اُسے اندازہ تھا کہ اُس کا آنے والا ساتھی یقیناً وہیں چھپ کر اُس کی حرکات کا جائزہ لے رہا ہو گا۔

گھڑی کی سوئیاں تین اور بارہ کے ہندسوں کو چھو رہی تھیں جب منوہر لال اچانک ہی اُس کی توقعات کے بالکل برعکس اُس کی پُشت پر موجود درجہ اوّل کے مسافر خانے سے نمودار ہُوا۔ اُس نے خان کے بالکل سامنے آ کر اُسے "جے ہند" پکارا تھا۔

"جے ہند" ـــ اُس نے بھی جواب میں اپنا ایک ہاتھ اُوپر اٹھا دیا۔

تعارف کا مرحلہ تو اُنہوں نے جلد ہی طے کر لیا اور اب بالکل بے تکلف دوستوں کے انداز میں باتیں کرتے باہر آ رہے تھے! اس بات کا خان کو بخوبی احساس تھا کہ اُس سے ملاقات کرنے والا اُس سے زیادہ سینئر ہے۔ منوہر لال نے اپنا تعارف "پرکاش" کے نام سے کروایا تھا اور خان کا نام اُسے پہلے ہی "وجے ٹھاکر" بتایا گیا تھا۔

دونوں سیڑھیوں کے راستے باہر نکل آئے۔ دونوں کی شخصیتیں اتنی بارُعب تھیں کہ ڈیوٹی پر موجود ٹکٹ کلکٹر اُن کی ٹکٹ چیک کرتے کے بجائے اُنہیں سلیوٹ مار کر ایک طرف مودب کھڑا ہو گیا۔ دونوں مُسکراتے ہوئے باہر نکل آئے۔

پرکاش نے خان کو یہی تاثر دیا تھا جیسے وہ اِسی شہر کا رہنے والا ہے۔ اُس نے ایک درمیانے درجے کے ہوٹل میں خان کے نام سے کمرہ بُک کروا رکھا تھا۔ پگڑی سے نجات خان نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہی حاصل کر لی تھی۔ اُس کے ہاتھ سے بندھی سنہری چین والی گھڑی بھی اُس کی جیب میں مُنتقل ہو چکی تھی اور چہرے پر موجود عینک بریف کیس

میں پہنچ چکی تھی اور اب وہ واقعی درمیانے درجے کا لیکن سُلجھے ہوئے گھرانے کا کوئی نوجوان لڑکا محسوس ہو رہا تھا۔

اپنا سامان ہوٹل ہی میں چھوڑ کر دونوں باہر نکل آئے۔ خان نے پرکاش کے محتاط ہونے کا اندازہ اِسی بات سے لگا لیا تھا کہ اُس نے ہوٹل میں جانے سے پہلے ایک سوٹ کیس خرید کر خان کو دیا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کا دوست خالی بریف کیس کے ساتھ قیام کرے۔

چائے اُنہوں نے ایک اور ہوٹل سے پی تھی۔ خان نے اندازہ لگایا کہ پرکاش یہاں کے چپے چپے سے واقف ہے اور وہ انبالہ کے گلیوں بازاروں میں بالکل ایسے گھوم رہا تھا جیسے یہ اُس کی جائے پیدائش رہی ہو۔

دونوں نے چائے پینے کے دوران "کوڈ بُک" اُڑانے کے لیے دو تین مُتبادل منصوبے تیار کیے تھے، لیکن، ابھی تک وہ ایسا کوئی پلان تیار نہیں کر سکے تھے جس میں کارپورل اجے ساہنی کی شمولیت کے بغیر کامیابی ممکن ہوتی ـــ اجے ساہنی اُن کے لیے ناگزیر تھا۔ خان نے اُسے کارپورل کی نفسیات سے آگاہ کر دیا تھا اور اُس کی خوبیاں اور خامیاں بھی اپنے سینئر ساتھی کے سامنے بیان کر دی تھیں۔

"میرا خیال ہے اب ہمارا دوست گھر پہنچنے والا ہی ہو گا" ـــ اُس نے گھڑی پر نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے چلتے ہیں" ـــ پرکاش نے بیرے کو بل لانے کو اشارہ کیا۔

○

بس میں سوار ہونے سے پہلے خان نے رَم کی دو بوتلیں اور بہت سی الم غلم چیزیں بھی خرید کر لی تھیں۔

دونوں گاؤں پہنچے تو ابھی اجے ساہنی گھر نہیں آیا تھا۔ اُنہیں تحفوں سے لدا

پھندا دیکھ کر اجے ساہنی کے گھر والے دونوں پر مٹے جا رہے تھے۔ خان کو تو وہ لوگ جانتے ہی تھے کیونکہ وہ اِس سے پہلے بھی اُن پر نوازشات کی بارش برسا چُکا تھا۔

اجے ساہنی کی آمد تک دونوں نے اُس کے گھر والوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا خان کی شکل پر نظر پڑتے ہی اجے کی باچھیں کِھل اُٹھیں، جس سے خان نے اندازہ لگا لیا کہ دولت کی محبت اُس پر غالب آچکی ہے۔ پرکاش کو دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے چونکا پھر سنبھل گیا۔ رَم کی بوتلیں اجے کو پرکاش نے پیش کی تھیں۔ یہ اُس کا کمالِ فن تھا کہ وہ اگلے آدھ گھنٹے میں اجے ساہنی سے اتنا گھل مِل گیا تھا کہ خان بھی دِل ہی دِل میں اُسے داد دیئے بغیر نہ رہ سکا۔ تینوں گھر والوں کے ساتھ ہی چائے پی رہے تھے چائے کے خاتمے پر تینوں "ذرا کھلی ہوا میں گھومنے" کے بہانے گھر سے باہر نکل آئے۔ اجے کے باپ کی یہاں چند مرلے زمین تھی جس پر وہ لوگ موسم کی مناسبت سے کچھ نہ کچھ کاشت کر لیا کرتے تھے۔ تینوں اِس کاشت شدہ فصل کے بیچوں بیچ چلتے ہوئے بالآخر کھیتوں کے ایک کونے میں موجود خالی قطعہ اراضی پر پہنچ گئے۔ ایک مٹی کے کمرے سے ساہنی نے دو چار پائیاں نکالیں اور وہ تینوں وہیں بیٹھ گئے۔

گفتگو کا آغاز اجے ساہنی نے کیا اور خان حیران رہ گیا جب اجے نے اب تک نہ مِلنے کا شکوہ کرنے کے بعد اُسے بتایا: "کہ وہ اُن لوگوں کیلئے اور بھی بہت سے کام کی چیزیں جمع کرتا رہا ہے"۔

یہ بڑی خوش آئند پیش رفت تھی جو کارپورل اجے کی طرف سے ہوئی۔ اور اپنی بات کے خاتمے پر اُس نے اپنی جیب سے پلاسٹک کے ایک لفافے میں لپٹے کاغذات نکال کر اُنہیں پیش کیے۔ یہ کاغذات بھی اُس نے اِسی کمرے میں کہیں چھپا رکھے تھے۔

دونوں نے بے چینی سے اِنہیں کھول کر دیکھا ——— ان میں زیادہ تر وہ "آرڈر زآف دے ڈے" تھے جو مختلف ہوائی اور راڈار اسٹیشنوں کے سٹیشن کمانڈر جاری کرتے ہیں کچھ

…کی مشقوں کی تفصیلات تھیں اور کچھ روزانہ ہونے والی کارروائیوں کی رپورٹیں جو ہیڈکوارٹرز …بھی جاتی ہیں۔

خان نے کاغذات کے اِس پیکٹ کو "عطیۂ خداوندی" جان کر قبول کر لیا۔ پرکاش بھی …س صورتحال سے خاصا خوش اور مطمئن نظر آ رہا تھا۔ اُس نے نظر بچا کر خان کو آنکھ ماری …اید کوئی "نیا کارڈ" وہ اجے ساہنی کی طرف پھینکنے والا تھا۔

"میں تمہیں یہ خوشخبری دینے آیا ہوں کہ تمہارے پہلے ہی کارنامے نے ہمارے ہیڈکوارٹر …واش کر دیا ہے۔ ہم لوگ عموماً پانچ سال سے پہلے اپنے کسی ایجنٹ کو یورپ نہیں بُلایا …رتے لیکن تمہارے لیے خصوصی ہدایات ہیں کہ اگر دو سال تک تمہاری کارکردگی اِسی …رح رہی تو ہم تمہیں دو سال کے بعد یورپ میں تمہاری مرضی کے کسی بھی مُلک میں …اد کر دیں گے ——— ہاں اپنی چھ تصویریں ضرور دے دینا۔ تمہارا پاسپورٹ تیار کروانا …ہے"۔

جیسے جیسے پرکاش بولتا جا رہا تھا اجے کے چہرے کا رنگ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ …کے خاتمے پر اُس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا تھا۔

یورپ کی پُرتعیش اور آزاد زندگی کے لیے وہ کچھ بھی کر گزرنے کو تیار تھا۔

اور عین اُن لمحات میں لوہا گرم دیکھ کر پرکاش نے اُس پر چوٹ کر دی ———

"…ہم لوگ ایک اور کام تمہاری مدد سے کرنے جا رہے ہیں۔ گو کہ یہ کام تینوں نے …انجام دینا ہے لیکن زیادہ ذمّہ داری تم پر ہی عائد ہوتی ہے"۔

پرکاش نے اُسے منصوبہ سمجھانا شروع کیا! ساہنی کچھ دیر کے لیے گھبرایا تو ضرور …یکن وہ اِن لوگوں کے سامنے خود کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔

چنانچہ اگلے روز شام کے بعد کا پروگرام طے ہو گیا۔ اجے ساہنی بوتل اپنے ساتھ …لے آیا تھا۔ اُس نے وہیں بوتل کھولی اور دو میلے کچیلے گلاس بھی اِسی کمرے سے

نکال لایا۔

وجے ٹھاکر تو بیمار تھا جس کا علم اجے کو پہلی ہی ملاقات پر ہو چکا تھا۔ اس لیے اُس نے وجے کے لیے گلاس رکھنے کا تکلف ہی نہیں کیا تھا۔ پرکاش نے البتہ خاصی رغبت دکھائی تھی۔ خان پہلے تو چونکا لیکن جلد ہی معاملہ اُس کی سمجھ میں آ گیا۔ اُس نے دیکھا اجے کے تین پیگ لگانے تک پرکاش نے گلاس کو چھُوا بھی نہیں تھا۔ جب اُس نے محسوس کیا کہ اب اجے زمین سے آسمان کی طرف پرواز کرنے لگا ہے تو اُس نے بڑی ہوشیاری سے گلاس ہونٹوں سے لگایا اور شراب نیچے گرانے لگا۔

یہ کام پرکاش نے اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ عام حالات میں بھی کوئی اُس کی یہ حرکت نوٹ نہ کر سکتا — چہ جائیکہ اب تو یوں بھی اندھیرا پھیل چکا تھا۔

خاصا اندھیرا پھیلنے پر جب اُنہوں نے محسوس کیا کہ گاؤں کے لوگ سردی کے باعث اپنی گھروں میں بند ہو چکے ہوں گے تو وہ نشے سے دھت کارپورل اجے ساہنی کو سہارا دے کر گھر لے آئے۔

کھانا سب گھر والوں نے اکٹھے ہی کھایا تھا۔ تینوں اوپر چوبارے میں چلے آئے۔ اجے کو ہوش نہیں رہا تھا۔ وہ جلد ہی گہری نیند سو گیا لیکن خان اور منوہر لال — (پرکاش) کافی رات گئے تک اپنے منصوبے کی جزئیات کا جائزہ لیتے رہے۔

○

علی الصباح اجے معمول کے مطابق بیدار ہو گیا۔ تینوں اکٹھے ہی باہر آئے تھے اور ایک ہی بس میں انبالہ روانہ ہو گئے۔ اجے نے شام کے بعد سے ہی اس منصوبے پر عمل شروع کرنا تھا اور شام سات بجے تینوں نے ایک جگہ اکٹھے ملنے کے لیے منتخب کر لی تھی۔

یہ وقت پرکاش اور خان نے اُس ہوٹل میں اور پھر فلم دیکھ کر گزارا۔ شو ختم ہو

پھر جب وہ شہر سے باہر اپنے مقرر کردہ آر۔وی پوائنٹ کی طرف جا رہے تھے تو پرکاش نے چپکے سے ایک پستول اُس کی طرف بڑھا دیا۔ خان نے شکریہ کہہ کر یہ پستول اپنے کپڑوں میں چھپا لیا۔

دوسری طرف ٹھیک چھ بجے کارپورل اجے ساہنی نے اپنے آفیسر انچارج کو جیپ کا ڈائنمو خراب ہونے کی رپورٹ کی اور یہ بھی بتا دیا: "کہ اب رات تک مقامی اڈّے کی ورکشاپ پر اس کی مرمت ممکن نہیں۔" اُس نے اپنے آفیسر کو پیش کش کی: "کہ وہ شہر کی کسی ورکشاپ سے ڈائنمو ٹھیک کروا کر صبح ڈیوٹی پر جیپ ساتھ لے کر آ جائے گا۔"

اور یہ سب کچھ "آف دی ریکارڈ" ہونا تھا لیکن آفیسر کی بھی مجبوری اور لالچ آڑے آ گیا۔ اجے نے اُس سے مرمت کے لیے ایڈوانس پیسے بھی وصول کر لیے اور جیپ لے کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

اڈّے سے باہر نکلتے ہی سٹور کے نزدیک اُس نے تھوڑی دیر کے لیے جیپ ضرور روکی تھی لیکن کسی کو یہ علم نہ ہو سکا کہ اس میں سوار کون تھا۔ سٹور سے برآمد ہونے پر اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ پکڑا ہوا تھا جس میں انڈین ایئر فورس کے دو آفیسروں کی وردیاں تہہ کر کے رکھی ہوئی تھیں۔

ٹھیک سات بجے وہ مطلوبہ مقام پر پہنچ چکا تھا جہاں خان اور پرکاش اُس کے منتظر تھے۔ یہاں تک ڈائنمو خراب ہونے کی وجہ سے اُس نے لائٹیں آف کر رکھی تھیں۔ کھیتوں کے کنارے کچّے راستے پر اُس نے جیپ کھڑی کر کے "انڈی کیٹر" جلائے بجھائے سگنل موصول ہونے پر خان اور پرکاش قریباً بھاگتے ہوئے اُس تک پہنچے تھے۔ دونوں اس کھیت میں بیٹھے اُس کا انتظار کر رہے تھے۔

کارپورل اجے ساہنی نے کچھ کہے سُنے بغیر وردیاں اُن کی طرف بڑھا دیں۔ دونوں نے وہاں کھڑے کھڑے اپنی وردیاں کپڑوں پر پہن لیں۔ اس دوران اجے ساہنی اپنے

کام میں مصروف رہا اُس نے جیپ کی ایک جعلی نمبر پلیٹ اپنی سیٹ کے نیچے سے نکالی۔ یہ نمبر پلیٹ اُس نے آج ہی ورکشاپ میں تیار کی تھی۔ اب اس جیپ پر انڈین ائرفورس کی جو نمبر پلیٹ سجی تھی اُس کے مطابق یہ انبالہ ایئربیس کی جیپ تھی۔ پرکاش نے جیپ پر نظر آنے والے ہر ممکنہ نشان پر کھیت کی مٹی مل کر اُسے اچھی طرح کیموفلاج کر دیا تھا۔ یوں بھی یہ ایمرجنسی کا دور تھا اور جیپیں عموماً اسی حالت میں رکھی جاتی تھیں ——!!

تھوڑی دیر بعد تینوں جیپ میں سوار انبالہ ائربیس کی طرف اُڑے چلے جا رہے تھے۔ کارپورل ابجے ساہنی جیپ چلا رہا تھا۔ اُس کے ساتھ سکواڈرن لیڈر پرکاش بیٹھا تھا اور پچھلی سیٹ پر فلائیٹ لیفٹیننٹ کمار۔ دونوں کے ناموں کی تختیاں بہادری کے جعلی اعزازات کے ساتھ اُن کے سینوں پر چمک رہی تھیں۔

خان نے اپنے پستول پر سائلنسر فٹ کر لیا تھا اور اُسے اپنے کوٹ کی لمبی جیب میں چھپایا ہوا تھا۔

○

ہوائی اڈہ ابھی دُور ہی تھا جب پرکاش نے ایک لفافہ ابجے کی طرف بڑھایا

"یہ تمہارا ایڈوانس ہے۔ کام مکمل ہوتے ہی تمہارے تصوّر سے بھی زیادہ مال ملے گا۔ ہم اپنے دوستوں کی قدر کرتے ہیں اس کا ثبوت پہلے ہی مل چکا ہو گا؟"

کارپورل ابجے ساہنی چپ رہا۔ اُس نے نوٹوں والا لفافہ اپنی جیب میں بغیر گنے ٹھونس لیا تھا! جیپ کی رفتار بڑھتی چلی جا رہی تھی —— دونوں پرسکون آنے والے حالات کے منتظر تھے۔ انبالہ ایئربیس کا سٹیشن ایریا شروع ہو چکا تھا۔ خان نے محسوس کیا جیسے اُس کی ہتھیلی اتنی سردی میں بھی پسینے سے بھیگ گئی اُس نے دونوں ہاتھ وردی کے ساتھ رگڑ کر صاف کر لیے۔ ابجے نے جیپ کو اُس سڑک پر ڈال دیا تھا جو ٹیکنیکل ایریا کی طرف جا رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد وہ گارڈ روم کے دروازے پر کھڑے تھے! فوجی جیپ کو دیکھتے ہی لکڑی کا بیرل اوپر اُٹھتا چلا گیا۔ ابجے نے اپنے کوٹ کے کالر کھڑے کر لیے تھے اور چہرہ اس طرح جھکا کر جیپ چلا رہا تھا کہ پہلی نظر میں اُس کی شناخت ممکن نہیں تھی۔ جبکہ منوہر لال امیرانہ ٹھاٹ باٹھ سے اسی طرح اپنی سیٹ پر جم کر بیٹھا تھا۔ اُس کے کندھے پر سجے نشانات دیکھ کر ڈیوٹی پر موجود گارڈ نے اُسے سیلوٹ کیا اور ابجے ساہنی نے جیپ آگے بڑھا دی۔

اڈے کی تمام بتّیاں بجھا دی گئی تھیں۔ ایمرجنسی کی وجہ سے ائرفورس کے تمام سٹیشن خود کو "حالتِ جنگ" کا شکار سمجھتے تھے اور مکمّل بلیک آؤٹ رہتا تھا۔

"جیپ کو سڑک سے ہٹا کر سٹیشن کمانڈر کے دفتر کے پیچھے والے درختوں کی طرف لے چلو" منوہر لال نے سرگوشی کی۔

"او۔کے" —— کارپورل ابجے ساہنی کو یہ الفاظ ادا کرنے کے لیے بھی بہت زور صرف کرنا پڑا

انتظامی دفاتر پانچ بجے کے بعد بند ہو جاتے تھے لیکن اُن کا چھوٹے افسران پر مشتمل عملہ رات کو بھی ڈیوٹی پر موجود رہتا تھا۔ قریباً ہر دفتر میں کوئی نہ کوئی ذمّہ دار آدمی کسی بھی جوابدہی کے لیے موجود ہوتا تھا۔

کارپورل ابجے ساہنی نے بڑی پھرتی سے جیپ درختوں کے عین درمیان "کیموفلاج" کے لیے اُگائی گئی جھاڑیوں میں اس طرح چھپا دی تھی کہ اب وہ دُور سے دیکھنے پر بھی نظر نہیں آ سکتی تھی۔ اگنیشن کی چابی خان نے اپنی جیب میں ڈال لی اور اب تینوں جیپ سے نیچے اُتر آئے تھے۔ کارپورل ابجے ساہنی وہاں ڈیوٹی کر چکا تھا اور اُسے علم تھا کہ اُس کے "دوستوں" کو جس چیز کی تلاش ہے وہ کس کمرے میں ہو سکتی ہے۔ وہ آگے آگے تھا اور دونوں اس کے پیچھے پیچھے۔

چاند کی آخری راتیں تھیں اور سردیوں کا موسم۔ اندھیرا شام ہی سے گہرا ہونے لگا تھا۔ گہر آلود آسمان کو بادلوں نے ڈھانپنا شروع کر دیا تھا۔ ہوائی اڈے پر پُرسوز جھینگروں کی آوازوں کے سوا کوئی اور آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

اندھیرے میں اب کچھ فاصلے پر بنے دفاتر کی پرچھائیاں نمایاں ہونے لگی تھیں۔ دو تین کمروں کی کھڑکیوں سے معمولی روشنی بھی اپنا عکس دکھانے لگی تھی۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے گہرے شیشوں کے پیچھے روشنیوں میں لوگ اپنے کام میں مصروف ہیں۔

ایسے ہی ایک کمرے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے اجے ساہنی نے اس کی نشاندہی کی اور اگلے حکم کے لیے ان کی طرف دیکھا۔

"تم جیپ میں واپس جاؤ" ــــ منوہر لال نے اسے ہدایت کی۔

اس خدشے کے پیشِ نظر کہ کہیں صورتِ حال کی سنگینی سے گھبرا کر وہ بدحواسی میں جیپ لے کر واپس نہ بھاگ جائے خان نے چابی اپنی جیب میں پہلے ہی رکھ لی تھی۔ انہوں نے اجے کو اپنی ذاتی حفاظت کے لیے ریوالور تک نہیں دیا تھا ــــ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتے تھے جس میں کسی قسم کا خطرہ مول لینے کا احتمال ہو۔

اس بات کے شواہد موجود تھے کہ اس کمرے میں نہ صرف کوئی موجود ہے بلکہ وہاں باقاعدہ پہرے کا بندوبست بھی ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پیش آئندہ حالات سے نمٹنے کی حکمتِ عملی طے کر لی۔

خان نے جھک کر پرکاش کے کان میں سرگوشی کی اور تن کر کھڑا ہو گیا۔ پرکاش نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور دبے قدموں لیکن بظاہر لاپرواہی سے اس کمرے کی طرف چل دیے۔

دونوں نے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی تھی کہ کمرے میں داخل ہونے تک ان کا ٹکراؤ کسی ڈیوٹی گارڈ سے نہ ہو اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے! کمرے کا دروازہ

گو کہ خان نے بہت آہستگی سے کھولا تھا لیکن اس کا دوسرا ہاتھ جیب میں موجود پستول کے دستے پر مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ دروازہ کھولنے پر اس کی نظر سامنے بیٹھے دو ہونقوں کے چہروں پر پڑی جو ان کی اچانک آمد سے بوکھلا گئے تھے۔

"آئی ایم سکواڈرن لیڈر پرکاش مہرہ" ــــ پرکاش نے بارعب آواز میں انہیں مخاطب کیا ــــ "آن سپیشل ڈیوٹی" ــــ اس کے منہ سے نکلا اور دونوں کے ہاتھ سیلوٹ کے لیے ٹوپیوں کو چھونے لگے۔

"میں ہیڈ کوارٹر سے آ رہا ہوں ــــ ہمیں ایک رپورٹ پر خصوصی چیکنگ کرنی ہے۔ تم دونوں بالکل مطمئن اپنے کام میں مصروف رہو، لیکن خبردار آدھ گھنٹے تک کسی کو بیس پر ہماری آمد کا علم نہیں ہونا چاہیے۔"

"او۔ کے سر" ــــ دونوں کو یقین ہو گیا تھا کہ یہ ائیرفورس انٹیلی جنس کے افسر ہیں۔

"اے یو سارجنٹ ڈھلا!" خان نے اس کے خاموش ہونے پر بائیں ہاتھ کی انگلی سے کونے والی میز پر بیٹھے سارجنٹ کو مخاطب کیا جس کے نام کی تختی اس کی جیب پر چمک رہی تھی۔ "فائل نمبر ۱۲ ایکس نکالو۔"

جیسے ہی خان کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، سارجنٹ یوں اچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے اس کا ہاتھ بجلی کے ننگے تاروں کو چھو گیا ہو۔

"س س سر" ــــ وہ ہکلایا ــــ "ہمیں سوائے سٹیشن کمانڈر کے اور کسی کو فائل نمبر ۱۲ ایکس دکھانے کی اجازت نہیں۔"

"ابے گدھے کے بچے ــــ تم سٹیشن کمانڈر کو بھی دکھاؤ گے جب فائل میں کاغذات موجود ہوں گے۔ ہماری رپورٹ کے مطابق تم دونوں نے وہ فائل یہاں سے تھوڑی دیر کے لیے غائب کروا دی ہے اور اب اسی کی واپسی کے منتظر ہو ــــ لیکن مطمئن رہو۔ باہر

"اور ہم نے گھیرا ڈالا ہوا ہے اور کوئی بچ کر اندر نہیں آسکتا" ___ پرکاش نے اُسے گھورتے ہوئے الفاظ چبا چبا کر اس طرح کہے کہ دونوں کے پاؤں تلے سے زمین سرک گئی اُنہیں سوائے اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے اور کوئی چارہ کار نہ رہا۔

"سر ___ یہ ہمارے خلاف کسی نے جھوٹی رپورٹ دی ہے۔ بالکل غلط۔"

"اچھا زیادہ بحث نہ کرو اور فائل نکالو" ___ خان غرایا۔

سارجنٹ ڈبلا نے اپنا دراز کھول کر چابیوں کا ایک گچھا نکالا اور دائیں کونے میں رکھے سیف کی طرف بڑھا۔ اُس کی چال سے اُس کی گھبراہٹ عیاں تھی۔ سارجنٹ ڈبلا کے دوسرے ساتھی کی حالت بھی اُس سے مختلف نہیں تھی۔ کپکپاتے ہاتھوں سے اُس نے مطلوبہ فائل نکال کر سکواڈرن لیڈر پرکاش مہرہ کو تھما دی۔

"سکواڈرن لیڈر پرکاش مہرہ" نے ایک طائرانہ نظر فائل پر دوڑائی اور دوسرے ہی لمحے دونوں کی جیبوں سے ریوالور نکل آئے۔ خان والے ریوالور پر سائیلنسر چڑھا تھا لیکن پرکاش والے پر نہیں۔

"تو ہمارا شک درست نکلا۔ میں تم دونوں کو گرفتار کر کے سٹیشن کمانڈر کے پاس لیے جا رہا ہوں ___ ہینڈز اپ" ___ پرکاش غرایا۔

"سر۔ سر۔ یہ غلط ہے۔ دُرگا ماں کی قسم مجھے اس کا علم نہیں" ___ سارجنٹ کا ساتھی گڑگڑایا۔

"تم نے جو کچھ بکنا ہے انکوائری میں بکنا" ___ خان نے اُنہیں گالی دیتے ہوئے کہا۔

دونوں نے سہم کر ہاتھ اُٹھا دیے۔

"اپنے منہ دیوار کی طرف کر کے کھڑے ہو جاؤ" ___ اُنہیں اگلا حکم موصول ہوا۔

ابھی مُنہ دیوار کی طرف کر کے کھڑے ہوئے اُنہیں ایک آدھ منٹ ہی گزرا تھا جب دونوں کے سروں پر قیامت ٹوٹی۔ پستولوں کے دستے دونوں کے سر کے نازک حصوں پر لگے اور

وہ بغیر آواز نکالے زمین بوس ہو گئے۔

فائل کو خان نے اپنی وردی کے اندر اچھی طرح محفوظ کر لیا تھا۔ دونوں اُسی طرح دبے قدموں باہر آ گئے۔ دمِ رخصت خان نے کمرے میں موجود ٹیلیفون کا پلگ نکال دیا تھا۔

کارپورل نے اُنہیں دُور ہی سے آتے پہچان لیا تھا۔ تینوں تھوڑی دیر بعد اُسی پوزیشن میں آ گئے تھے۔ اس مرتبہ دونوں "افسران" نے اپنے ہاتھ پستولوں کے دستوں پر جمائے ہوئے تھے۔ جیپ کی لائٹس آف تھیں۔ صرف اُسی مدھم سی روشنی کے سہارے جو راستے کی راہنمائی کے لیے جلائی گئی تھی۔ وہ اُسی طرح گارڈ روم تک آ گئے۔

بیرل پر موجود گارڈ نے ٹارچ کی روشنی اُن کی طرف پھینکی۔ اجے ساہنی نے ٹوپی اتنی جھکائی ہوئی تھی کہ اُس کا چہرہ دکھائی پڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ روشنی میں افسران کی شکل دیکھتے ہی اُس نے سیلوٹ مارا اور اجے ساہنی نے ایکسیلیٹر پر دباؤ بڑھا دیا۔

جیپ آندھی کی طرح اُڑی چلی جا رہی تھی ___!!

اُسی ویرانے میں پہنچ کر جہاں سے دونوں سوار ہوئے تھے۔ اُنہوں نے اپنی وردیاں اور جیپ کی نمبر پلیٹ سے نجات حاصل کی۔

"تھینک یُو فرینڈ" پرکاش نے گرمجوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے ایک اور لفافہ اُس کی طرف بڑھا دیا:

"اچھا بھیا! اب شاید تم سے یورپ ہی کے کسی مُلک میں ملاقات ہو۔ میں تو اپنا پیریڈ مکمل کر چکا ہوں ___ کل یہ لوگ مجھے جرمنی پہنچا دیں گے پھر عیش ہی عیش" ___

خان بھی اُس سے باقاعدہ بغلگیر ہو گیا۔ اُس نے کچھ اس طرح اجے ساہنی سے باتیں کی تھیں کہ ساہنی تڑپ کر ہی تو رہ گیا ___ اُس کے دل میں یورپ جا کر عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی خواہش پہلے سے دو چند ہو گئی تھی۔ بڑی پھُرتی سے جیپ کا بونٹ

اٹھاکر پرکاشس نے اُس کے ڈائنمو میں معمولی سی خرابی پیدا کر دی تھی۔

دونوں یہیں اُس سے الگ ہو گئے۔ اِس کام میں بمشکل ایک گھنٹہ صرف ہوا تھا جب وہ جیپ لے کر ورکشاپ پہنچا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ مستری ایک دوسری گاڑی کے نیچے لیٹا اپنے شاگردوں کو گالیاں دے رہا تھا۔ ساہنی کو شاید وہ پہچانتا تھا کیونکہ اُس نے جیپ کی لائٹس آف ہونے کے باوجود اُسے نام لے کر سلام کیا تھا۔

وہیں کھڑے کھڑے اُس نے مستری کو خرابی سے آگاہ کیا اور یہ بھی کہہ دیا کہ وہ صبح جاتے سمے جیپ لے جائے گا۔ اُس نے رخصت ہوتے وقت جان بوجھ کر اُونچی آواز میں اُسے کہہ دیا تھا: "ابھی سات بجے ہیں اور صبح تک کام مکمل ہونا چاہیئے۔"

کارپورل جانتا تھا کہ اوّل تو مکینک کے پاس گھڑی ہے ہی نہیں اور اگر ہوئی بھی تو وہ اُس میں ٹائم دیکھنے کا تکلف نہیں کرے گا۔

"جیپ کو ذرا چمکا بھی دینا"—— اُس نے کسی ممکنہ نشان کی موجودگی کو بھی نظر انداز نہیں کیا تھا۔

"اچھا مہاراج جی اِطمئن رہیں۔ مجھے علم ہے بڑے صاحب کی جیپ ہے" مستری نے لیٹے لیٹے جواب دیا۔

کارپورل اجے ساہنی اُسے "رام رام" کہہ کر واپس آ گیا۔ "صبح اگر انکوائری بھی ہوتی تو دُنیا کی کوئی طاقت یہ ثابت نہیں کر سکتی تھی کہ وہ جیپ لے کر اِس ورکشاپ سے آگے بھی کہیں گیا ہے کیونکہ سات بجے تک وہ بمشکل یہیں پہنچ سکتا تھا۔"

اپنے دوستوں کی طرف سے بتائی گئی حفاظتی تدابیر پر اُس نے فوراً عمل کیا: جیپ کی سیٹ کے نیچے ہی اُس نے ایک سویلین ڈریس رکھا ہوا تھا۔ کپڑے اُس نے ایک اندھیرے گوشے میں تبدیل کیے اور آج وہ خلاف معمول بس کے بجائے ساڑھے آٹھ بجے والی ٹرین سے اپنے گاؤں جا رہا تھا۔

دوسرا اسٹیشن اُس کے گاؤں کا تھا۔ ٹرین میں کوئی شناسا چہرہ اُسے دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ گھر تک وہ اِسی طرح پہنچا تھا۔ کھیتوں میں اُس نے دوبارہ اپنی وردی تبدیل کر لی تھی۔ وہ آج قدم قدم پر احتیاط برت رہا تھا۔ کوئی غیر معمولی حرکت اُس سے سرزد نہیں ہوئی تھی۔ نہ ہی اُس نے گھر والوں کو دیر سے آنے کا احساس ہونے دیا تھا۔

رات کافی دیر گئے اُسے نیند آئی لیکن صبح وہ پورے وقت پر جیپ سمیت اپنے افسر کے سامنے موجود تھا۔



خان اور منوہر لال نے جیپ کے نظروں سے اوجھل ہوتے ہی رختِ سفر باندھ لیا —— دونوں چُپ چاپ سڑک کے کنارے کنارے چلتے گئے۔

ہمیں انبالہ نہیں جانا چاہیئے" خان نے اپنی رائے پیش کی۔

"بالکل ٹھیک ہے" میرے خیال سے کسی نزدیکی سٹیشن سے کوئی پسنجر ٹرین پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور ہاں آج شاید ہمیں دہلی کے بجائے پنجاب کی طرف جانا پڑے" منوہر لال نے اُسے اگلے پروگرام سے آگاہی دی۔

"جیسے آپ کی اچھیّا۔"

"اِس مرتبہ تم پگڑی کے بغیر ٹھاکر بنے رہو گے" منوہر لال نے سمجھایا۔

خان مُسکرا کر چُپ ہو رہا۔ دو ڈھائی گھنٹے پیدل چلنے کے بعد بالاخر اُنہیں ایک ریلوے سٹیشن کے آثار دکھائی دیئے۔ منوہر لال کو اندازہ تھا کہ انبالہ سے شام کے بعد تین چار پسنجر ٹرینیں مختلف جنکشنوں تک جاتی ہیں اور وہ کوئی نہ کوئی ایسی ٹرین پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

خان کے لیے یہ خوشگوار حیرت باعث اطمینان تھی کہ اِس لائن پر آنے والے بہت